تاریخ دعوت و عزیمت

"یعنی پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحابِ دعوت وعزیمت کا مفصل تعارف، اُن کے علمی کارناموں کی روداد اور اُن کے اثرات ونتائج کا تذکرہ۔"

مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی

www.attablig.com

مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام لکھنؤ

تاریخ دعوت وعزیمت

حصہ چہارم

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

رجب المرجب ۱۴۲۶ھ - اگست ۲۰۰۵ء

نام کتاب: تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ چہارم)

نام مصنف: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

صفحات: ۴۴۸

تعداد: ۱۰۰۰ (ایک ہزار)

طباعت: کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ

قیمت: ۷۰/روپے

ناشر: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

پتہ: پوسٹ باکس ۱۱۹، ندوۃ العلماء لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539

فیکس نمبر: 0522-2740806

ای۔میل: info@airpindia.com

تاریخ دعوت وعزیمت

حصّہ چہارم

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾

(سورۂ فاطر ـ ۳۲)

فہرست عناوین

"تاریخ دعوت وعزیمت حصۂ چہارم"

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبعِ دوم

الحمد للہ کہ "تاریخ دعوت و عزیمت" کے حصۂ چہارم کے (جو مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی ذات گرامی، ان کے تجدیدی کارناموں اور اُن کے عہد کے ساتھ مخصوص ہے) طبع ثانی کی نوبت آرہی ہے، کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۴۰۰ھ ۱۹۸۰ء میں نکلا تھا، موضوع کی اہمیت اور جس ذات گرامی سے اس کا انتساب ہے، اور عہدِ حاضر میں اس سے جو رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے، اس کے لحاظ سے اِس وقت تک جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، اس کے متعدد ایڈیشن نکل جانے چاہئے تھے، اور عالمِ عربی میں حقیر مصنّف کی تالیفات کی طباعت و اشاعت کی یہی رفتار ہے، لیکن ہندوستان میں سنجیدہ فکر انگیز اور خالص علمی و اصلاحی کتابوں کی اشاعت اور اُن کے نئے ایڈیشنوں کے نکلنے کی رفتار کو دیکھ کر یہ بات کچھ زیادہ موجبِ تعجّب و تأسّف نہیں۔

کتاب کی ترتیب و تصنیف ایسے زمانہ میں عمل میں آئی تھی، جب مصنّف اپنے ضعف بصارت اور مرض کی وجہ سے براہ راست تحریر و تسوید اور مسوّدات اور کتابت شدہ مضامین کی تصحیح و تنقیح سے بہت حد تک معذور و قاصر تھا،

اس کو اس بارہ میں زیادہ تر اپنے عزیز رفقاء اور معاونین پر اعتماد کرنا پڑتا تھا تحقیق
و تصحیح کے بارے میں ان دونوں حالتوں میں جو فرق ہے اس کو تصنیفی و تحقیقی کام کرنے
والے جانتے ہیں، اس لئے بھی نیز اس بنا پر بھی کہ پوری کوشش و اہتمام کے باوجود نقشِ
اول میں کچھ خامیاں رہ ہی جاتی ہیں، چنانچہ کتاب کے پہلے ایڈیشن میں کتابت و طباعت
کی غلطیاں بھی رہ گئیں اور کچھ مواد و مندرجات ایسے تھے جن کی مزید تحقیق اور ماخذ سے
مقابلہ کرنے کی ضرورت تھی، اس ایڈیشن میں امکانی حد تک کتابت و طباعت کے
اغلاط کی تصحیح بھی کر دی گئی ہے اور متعدد مقامات پر مزید تحقیق اور نظر ثانی کے بعد
خفیف سی ترمیم کی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں مصنف جناب مولوی منظور حسین صاحب سروش بھوپالی (امیر
تاج المساجد بھوپال) کا خصوصیت کے ساتھ ممنون ہے کہ انھوں نے بڑے شغف،
اہتمام اور دیدہ ریزی کے ساتھ کتاب کو لفظاً لفظاً پڑھا، متعدد مقامات پر نظر ثانی
اور مزید تحقیق کی دعوت دی اور اپنے مشوروں سے مصنف کی بیش قیمت مدد فرمائی،
مصنف عزیز گرامی مولوی شاہ شبیر عطا ندوی کا بھی شکر گزار ہے کہ انھوں نے کتاب کا
بغور مطالعہ کیا اور بعض مسامحات کی نشاندہی کی، جزاھما اللہ خیر الجزاء۔

کتاب کا عربی ترجمہ عزیزی مولوی سید سلمان ندوی سلمہ کے قلم سے "رجال الفکر
والدعوۃ فی الاسلام" کے تیسرے حصہ کے طور پر "الامام السرہندی" کے نام سے دار القلم
کویت سے اور انگریزی ترجمہ SAVIOURS OF ISLAMIC SPIRIT کے
تیسرے حصہ کے طور پر محترمی سید محی الدین صاحب کے قلم سے "مجلس تحقیقات و نشریات
اسلام لکھنؤ" کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، اس طرح ممالک عربیہ نیز ان ممالک اور

حلقوں میں جہاں صرف انگریزی ہی ذریعۂ مطالعہ و استفادہ ہے، حضرت مجدد الف ثانی
کے حالات و سوانح اور ان کے تجدیدی و انقلابی کارنامہ کی عظمت و اہمیت سے واقف
ہونے کا موقع مہیا ہو گیا، ان میں سے بیشتر ممالک اور ماحول وہ ہیں جن میں حضرت مجدد
کے طریق کار کے مطابق کام کرنے ہی میں سب سے زیادہ کامیابی کے امکانات ہیں، اور
اسی کی روشنی اور پیروی میں غیر ضروری دشواریوں، مخالفتوں اور با اثر و بارسوخ
طاقتوں سے صف آرائی اور معرکہ پیمائی سے بچ کر اصلاح و انقلابِ حال اور
اسلام کے غلبہ و اقتدار کے مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

مصنف کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے
اور اس عہدِ فتن میں (جو بہت سے مقامات پر عہدِ اکبری سے بہت مماثلت رکھتا ہے)
اس طرزِ کار اور جدّ و جہد اصلاح و تجدید سے بصیرت اور قوت حاصل کرنے کی توفیق
عطا فرمائے، جس کو وہ کامیابی حاصل ہوئی جو تاریخ اسلام میں بہت کم اصلاحی
و تجدیدی کوششوں کو حاصل ہوئی، ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

وباللہ التوفیق۔

ابوالحسن علی ندوی
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
ندوۃ العلماء لکھنؤ

۳۰ رجب ۱۴۰۷ھ
۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مدّعا

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم

النبیین محمد وآلہ وصحبہ أجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم

إلی یوم الدین

غالباً ۳۵-۱۹۳۶ء کی بات ہے، میرے مربّی وولی نعمت برادرِ معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) نے مجھے ہدایت کی کہ میں "مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ" کا مطالعہ کروں، میری عمر اس وقت ۲۲، ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی، اور تازہ تازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات پر مامور ہوا تھا معرفت وحقیقت کے گہرے مضامین کے مطالعہ سے ناآشنا اور تصوف وسلوک کی اصطلاحات سے یکسر نابلد تھا، ذہن ومذاق پر ادب (بالخصوص ادب عربی) اور تاریخ کی حکمرانی تھی، مصر وبیروت کے اعلیٰ مطابع کی خوبصورت چھپی ہوئی کتابوں کے مطالعہ کی عادت تھی، بھائی صاحب جن کے دامنِ عاطفت اور آغوشِ تربیت میں ذہنی وعلمی نشو ونما ہوا تھا، اس حقیقت سے خوب واقف تھے، لیکن شاید وہ اقبال کے الفاظ میں کہنا چاہتے تھے کہ ؎

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ۔۔۔ ہے اس کا مذاق عارفانہ

کم سے کم تین سو برس سے ہمارے خاندان کو روحانی وفکری طور پر حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خانوادۂ عالی سے نسبت رہی ہے، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذخیرۂ کتب میں جو گھر میں محفوظ تھا مطبع احمدی دہلی کا چھپا ہوا مکتوبات کا نسخہ تھا، جو تین دفتروں پر مشتمل تھا، بھائی صاحب کے احترام اور تعمیل ارشاد میں اس کا مطالعہ شروع کیا لیکن کئی بار ہمت نے جواب دے دیا، اور کتاب رکھ دی، خاص طور پر وہ مکاتیب جو اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ کے نام ہیں، اور جن میں اپنے روحانی تجربات اور واردات بیان کئے گئے ہیں سب سے زیادہ ہمت شکن ثابت ہوئے لیکن بھائی صاحب کی طرف سے برابر ہدایت رہی کہ میں کسی طرح مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی "ازالۃ الخفاء" حضرت سید احمد شہیدؒ کی "صراط مستقیم" اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "منصب امامت" پڑھ لوں، آخر کمر ہمت باندھ کر اس "ہفت خواں" کو سر کرنے کے لئے تیار ہو گیا، غیرت بھی آئی اور جوش بھی آیا کہ ایک شفیق بھائی کی ہدایت پر عمل نہیں کرتا، اور ایک ایسی متبرک کتاب کے مطالعہ سے محروم ہوں جس کو بڑے بڑے علماء ومشائخ نے حرز جاں بنایا ہے، توفیق الٰہی نے بھی یاوری کی جس قدر آگے بڑھتا گیا دل لگتا گیا، اور بقدر استعداد وتوفیق کتاب بھی سمجھ میں آتی گئی، پھر تو کتاب خود دامن گیر ہو گئی، اور اس کے پڑھنے میں ایسی حلاوت ولذت محسوس ہونے لگی جو اچھی اچھی ادبی کتابوں میں محسوس نہیں ہوتی تھی، یہ دور بعض حیثیتوں سے میری زندگی کا نازک ترین دور تھا بعض شدید آزمائشیں اور شدید قسم کی ذہنی کشمکش درپیش تھی، کتاب نے اس مرحلہ پر ایک کامل مرشد کا کام دیا، صاف محسوس ہوتا تھا کہ قلب سکینت سے معمور بلکہ مخمور ہے، غالباً ایسی سکینت کا احساس اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، یہ سفر جو محض سعادت واطاعت میں شروع کیا گیا تھا، اور جس میں تعمیل ارشاد اور غیرت کا جذبہ کام کر رہا تھا بڑی فرحت وبشاشت پر ختم ہوا۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد مکتوبات کو دوبارہ اس ارادہ سے پڑھنا شروع کیا کہ اس کے منتشر ومکرر مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت جمع کیا جائے اس کے لئے کتاب کے مضامین کا ایک انڈکس بنانے کے کام کی ابتدا کی، مثلاً توحید خالص اور رد شرک کا مضمون کہاں کہاں آیا ہے، مکتوبات کے نمبروں کے حوالے سے ان کے صفحات ایک جگہ نوٹ کرلئے، رسالت ونبوت پر کس کس جگہ کلام کیا گیا ہے، سنت وبدعت پر کن مکاتیب میں گفتگو ہے یہ مضمون کتنے مقامات پر ہے کہ بدعت حسنہ کا کہیں وجود نہیں، وحدۃ الوجود ووحدۃ الشہود پر کن مکاتیب میں بحث کی گئی ہے، عقل خالص اور کشف خالص پر تحقیقی بحثیں کہاں کہاں ہیں؟ وغیرہ وغیرہ ہفتوں کی محنت سے یہ پورا انڈکس تیار ہو گیا، اور وہ مکتوبات کے اسی نسخہ میں رکھ دیا گیا کہ پھر اس کی مدد سے مضامین کو علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت مرتب کیا جائے گا لیکن شاید وہ نسخہ کسی نے پڑھنے کے لئے لیا اور وہ واپس نہیں آیا، نسخہ کے ضائع ہونے سے (جس کا بدل مل سکتا تھا) زیادہ افسوس اس محنت و عرق ریزی کے ضائع ہونے کا تھا، جو اس انڈکس کی تیاری میں کی گئی تھی "وکان امر اللہ قدراً مقدوراً"۔

اس کے کئی سال کے بعد غالباً ۱۹۴۵-۴۶ء میں یہ خیال آیا کہ مکتوبات کو مضامین ومطالب کے لحاظ سے مرتب کیا جائے، اور اس کو اس نئی ترتیب وتعارف وتشریح کے ساتھ پیش کیا جائے کہ وہ نئی نسل کے جدید ذہن رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے قابل استفادہ اور شوق انگیز ہو، اور اس سے حضرت مجدد صاحب کے تجدیدی کارنامے اور مجتہدانہ مقام پر بھی روشنی پڑے چنانچہ اس التزام کے ساتھ یہ کام شروع کیا کہ پہلے ایک تمہیدی مضمون ہو جس میں آنے والے اقتباسات کا مرکزی فکر ان علوم وتحقیقات کا جوہر ولب لباب آجائے جو ایک ہی عنوان کے تحت ہیں، لیکن سارے مکتوبات میں پھیلے ہوئے ہیں پھر ایک معنوی ترتیب کے ساتھ مکتوبات کے اقتباسات پیش کئے جائیں،

ایک طرف فارسی متن ہو، اور دوسری طرف اس کا اردو ترجمہ، پھر حاشیہ پر حل طلب الفاظ و اصطلاحات کی تشریح اور احادیث کی تخریج ہو، پھر مستند علمائے امت و محققین اسلام کے تائیدی مضامین اور عبارتیں، اس کام کا پیمانہ اتنا وسیع تھا، اور اس میں اتنے پہلوؤں کی رعایت تھی کہ اس کام کا مجھ جیسے کم عمر و نوخیز اور مصروف انسان سے جو تدریس، تصنیف، تبلیغ، تینوں کوچوں میں قدم رکھتا تھا سرانجام پانا بہت مشکل تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ توحید و رسالت و نبوت کی منزل تک یہ کام پہنچا تھا کہ دوسرے مشاغل نے اس کی مہلت نہ دی، لیکن جتنا کام ہو گیا تھا، وہ بھی بہت بیش قیمت اور مفید تھا، اس مضمون کی چار قسطیں رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے اپنے رسالۂ "الفرقان" میں ۶۶-۶۷ھ (۴۷-۱۹۴۸ء) میں شائع کیں۔

اس سلسلہ کے منقطع ہو جانے کے کئی سال کے بعد جب "تاریخ دعوت و عزیمت" کا سلسلہ شروع ہوا تو بجائے مکتوبات کی نئی ترتیب اور نئی خدمت کے حضرت مجددؒ کی مستقل سیرت لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا، اور اس کی تیسری جلد جو آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے دو جلیل القدر روحانی پیشوا سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل تھی، مرتب و شائع ہو گئی تو ضروری ہو گیا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سیرت کی طرف توجہ کی جائے اور اس سے کتاب کی چوتھی جلد کو زینت بخشی جائے کہ اس عہد انقلاب اور اس پرفتن دور میں بعض حیثیتوں سے اس کے سامنے آنے کی زیادہ ضرورت ہے، حضرت مجددؒ کے اس اس طریقۂ کار و حکمت عملی کو واضح و روشن کرنے کی اس زمانہ میں (جس میں آسانی کے ساتھ اور پہلے ہی مرحلہ پر حکومتوں اور طاقتوں کو اپنا مدمقابل اور حریف بنا لیا جاتا ہے اور کام کے راستہ میں بے ضرورت مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر لیا جاتا ہے) جتنی ضرورت

ہے، شاید کسی زمانہ میں نہ تھی، آخر وہ کیا طریقہ تھا کہ ایک فقیر بے نوا نے ایک گوشہ میں بیٹھ کر سلطنت و ملک کا رخ بدل دیا؟ اس حقیقت کی طرف توجہ سب سے پہلے اپنے برادر معظم کی گفتگو اور مجلسوں سے ہوئی، پھر مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا وہ فاضلانہ و ولولہ انگیز مضمون پڑھ کر جو انھوں نے "الفرقان" کے مجدد نمبر کے لئے سپرد قلم کیا تھا، اس کا یقین واذعان پیدا ہوا، خود میں نے اپنے متعدد عربی مضامین اور خطبات[1] میں اس حقیقت کو متعدد بار واضح کیا اور اس حقیقت پر اطمینان و انشراح قلبی برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

لیکن جب مکمل و مستقل سیرت کا خیال آتا تو دو باتیں اس راہ میں حائل ہو جاتیں، پہلی یہ کہ مجدد صاحب کی کوئی سیرت فلسفۂ وحدۃ الوجود اور نظریۂ وحدۃ الشہود کی تفہیم و تشریح اور ان کے محاکمہ، علمی دلائل اور ناقدانہ بحث و نظر کے ساتھ آخر الذکر کی ترجیح اور اس کے اثبات کے بغیر ممکن نہیں، لیکن جب اس کا خیال آتا تو ہمت ٹوٹ جاتی، اولاً اس لئے کہ اس پر اتنا عظیم کتب خانہ تیار ہو گیا ہے، جس کی تلخیص و انتخاب بھی مشکل ہے، دوسرے ان دقیق فلسفیانہ مباحث، مقدمات اور ان نازک اصطلاحات کے سمجھے اور سمجھائے بغیر اس پر قلم ہی نہیں اٹھایا جا سکتا، پھر آخر میں یہ مسئلہ علمی اور ذوقی ہے اور ذاتی تجربات و احساسات پر مبنی ہے، اور مصنف اس کوچہ سے یکسر نابلد، کتاب کے پڑھنے والوں کی بڑی تعداد بھی نہ صرف اس سے ناآشنا بلکہ متوحش ہے، اس لئے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس "ہفت خواں" کو کس طرح سر کیا جائے اور اگر کتاب اس مبحث سے (جو بعض حضرات کے نزدیک مجدد صاحب

---

[1] مثلاً راقم سطور کا وہ مضمون جو اس نے جمعیۃ الشبان المسلمین قاہرہ کے ایک استقبالیہ جلسہ میں علمائے مصر اور اساتذۂ جامع ازہر کے سامنے پڑھا تھا، اور "الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند وتطوراتہا" کے عنوان سے علیحدہ شائع ہو گیا ہے، یا جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کی وہ تقریر جو "منہج أفضل فی الاصلاح للدعاۃ والعلماء" کے نام سے شائع ہوئی۔

کی تجدید کا اصل میدان اور ان کی تجدیدی عظمت کا راز ہے) خالی ہو تو وہ کس طرح ان کی مکمل سوانح اور تذکرہ کہی جاسکتی ہے؟ دوسرا خیال جو قلم کا عناں گیر اور مصنف کا دامن کش ہوتا تھا، وہ یہ کہ اس موضوع پر اتنا کام ہو چکا ہے اور اتنی کتابیں لکھی جاچکی ہیں کہ مصنف کے لئے ان میں اضافہ کرنا اور نئی تصنیف کا جواز پیدا کرنا مشکل ہے۔

جہاں تک پہلے خیال کا تعلق ہے بڑے غور وفکر کے بعد ذہن نے اس کا حل سوچ لیا، وہ یہ کہ "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے اصول پر اس مسئلہ کو قارئین کے سامنے شیخ اکبر کے دبستان فکر کے بعض مستند فضلا اور معتبر شارح و ترجمان حضرات کی تشریحات اور خود مکتوبات کی مدد سے اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان کو اس نظریہ کا اجمالی طور پر علم و تصور ہو جائے، پھر جن کو شوق و ہمت ہو وہ اصل مآخذ کی طرف رجوع کریں یا اس موضوع کے اختصاصی عالموں اور اس دریا کے شناوروں سے مدد لیں، جو اس مسئلہ پر علمی طور پر حاوی اور عملی طور پر ذوق آشنا ہیں "وقلیل ماھم"۔

جہاں تک دوسری رکاوٹ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں علامہ اقبال کے ایک شعر نے رہبری کی اور مصنف کے محدود تصنیفی تجربہ نے بھی اس کی تائید کی اور اس کے لئے شہادتیں مہیا کیں، ترجمان حقیقت نے فرمایا ہے ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

حضرت مجدد اور ان کے تجدیدی کارنامہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اب بھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

پھر زبان و اسلوب، سوالات و حالات، معیار و اقدار، اور طریقۂ تفہیم و تعبیر کی تبدیلی

سے بعض مرتبہ کچھ عرصہ پہلے لکھی ہوئی کتابیں ایسی ہو جاتی ہیں کہ وہ گویا دوسری زبان میں تھیں، اب ان کے ترجمہ کی ضرورت ہے، پھر مقدمات و واقعات سے نتائج نکالنے اور اسباب و نتائج کے درمیان ربط پیدا کرنے اور اپنے زمانہ کے حالات پر منطبق کرنے کا طریقہ بھی ہر مصنف کا جدا ہوتا ہے، مصنف کے دل نے گواہی دی کہ اگر یہ کام خلوص و محنت سے انجام دیا گیا تو نہ صرف یہ کہ وہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا، بلکہ کیا عجب ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے اختتام پر پندرھویں صدی کے لئے (جو اس کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد شروع ہونے والی ہے) وہ ایک قابل قدر تحفہ، ایک حیات آفریں پیغام، اور اللہ کے ایک مخلص و مقبول بندے کے ایک ایسے کام کی روداد بن جائے جو نہایت خاموشی تواضع اور عجز و مسکنت کے ساتھ انجام دیا گیا، لیکن اس کے اثرات ایک صدی سے متجاوز ہو کر ہزارۂ دوم (الف ثانی) پر محیط ہو رہے ہیں، اور ہماری اس صدی کے لئے بھی جس کے زمین و آسمان بظاہر بدل گئے ہیں، اپنے اندر عبرت و موعظت کا وافر سامان رکھتا ہے۔

"ناچیز راقم سطور کا قلم اور قلب دونوں آستان خداوندی پر سربسجود اور ترانۂ حمد و شکر سے رطب اللسان ہیں کہ ۱۸ سال کے طویل وقفہ کے بعد[1] مصنف کو "تاریخ دعوت و عزیمت" کا سلسلہ پھر شروع کرنے اور اس کا چوتھا حصہ لکھنے کی سعادت و توفیق حاصل ہو رہی ہے، یہ وقفہ اتنا طویل ہوا کہ خود مصنف کو اس کا خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں موت کا پیام آجائے، اور یہ اہم سلسلہ جس کو مصنف کی تصنیفات میں اللہ تعالیٰ نے خاص قبولیت سے نوازا ناتمام نہ رہ جائے، اس چوتھے حصہ کا تعلق چونکہ اس ذات گرامی سے ہے، جس کی تجدید دین نے ایک طرف وہ شہرت و قبولیت حاصل کی جو تاریخ دعوت و اصلاح میں کسی داعی و مصلح

[1] "تاریخ دعوت و عزیمت" کی تیسری جلد ۱۳۸۳ھ کے اوائل ۱۹۶۲ء کے وسط میں شائع ہوئی۔

کے حصہ میں نہیں آئی، یہاں تک کہ یہ لقب اس کے نام کا قائم مقام ہو گیا، اور بہت سے تعلیم یافتہ اصحاب بھی نام سے زیادہ اس لقب سے واقف ہیں، دوسری طرف اس کی تجدیدی مساعی نے وہ کامیابی حاصل کی اور اس کے ایسے ظاہر و باہر نتائج نکلے جن کی مثال اسلام کی تاریخِ دعوت و عزیمت اور تجدید و احیاءِ دین میں ملنی مشکل ہے، اس لئے خود طبیعت پر بھی تقاضا تھا، اور "تاریخ دعوت و عزیمت" کا مطالعہ کرنے والوں اور قدر دانوں کا سالہا سال سے اصرار تھا کہ اس حصہ کو جلد سے جلد مرتب ہو جانا چاہئے، بلکہ بہت سے مخلص صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق احباب اور بزرگوں کا مطالبہ اور حکم تھا کہ میں تمام تصنیفی مشاغل اور دوسرے موضوعات پر اس کام کو ترجیح دوں، اور کچھ دنوں کے لئے اپنے کو اس کے لئے فارغ کروں، لیکن یہ کام اتنا آسان نہ تھا، جتنا سمجھا جا رہا تھا، عصرِ حاضر کے تقاضوں، جدید ذہنوں، اور بحث و تحقیق کے جدید معیاروں اور پیمانوں کے مطابق اتنا کافی نہ تھا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اور قدیم تاریخوں اور تذکروں میں جو مواد موجود ہے، اس کو معمولی انتخاب اور تلخیص کے ساتھ پیش کر دیا جائے، مجدد صاحب نے جس عہد اور ماحول میں یہ تجدیدی کام انجام دیا، اس کا علمی اور تاریخی، فکری و سیاسی، اخلاقی و اجتماعی اور اعتقادی و کلامی طریقہ پر مؤرخانہ و ناقدانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اس وقت کیا تحریکیں کام کر رہی تھیں، ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ملکوں میں کیا ذہنی و دینی بے چینی پائی جاتی تھی، اسلام اور شریعت اسلامی کے خلاف علمی اور عقلی حلقوں میں کس بغاوت کے آثار تھے اور کن سازشوں کی تیاریاں ہو رہی تھیں، اسلام کی تاریخ میں پہلے ایک ہزار سال کی تکمیل کے قرب نے حوصلہ مندوں اور طالع آزماؤں کے دلوں میں کیسی کیسی امیدوں اور امنگوں کے چراغ روشن کر دیئے تھے، اور متشکک اور متردد طبیعتوں میں کیسے کیسے شکوک و شبہات پیدا کر دیئے تھے،

ایک طرف فلسفہ اور علوم عقلیہ، دوسری طرف اشراق و باطنیت نے نبوت و رسالت کی عظمت و مقام کے گھٹانے اور عقل و تفلسف یا ریاضت و مجاہدہ اور نفس کشی کو معرفت الٰہی، اور وصول الی اللہ اور نجات و ترقی درجات کے لئے کافی سمجھنے کا کیسا فتنہ برپا کر دیا تھا، وحدۃ الوجود کے غالی عقیدہ نے کیسی آزادی اور بے قیدی بلکہ الحاد و زندقہ کا دروازہ کھول دیا تھا؛[1]

سنت و شریعت کی اہمیت علماء راسخین کی ایک قلیل تعداد اور شروح حدیث تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، اور بدعات نے اکثر کھلے طریقہ پر اور بعض مرتبہ "بدعت حسنہ" کے نام اور نقاب سے پورے معاشرہ اور مسلمانوں کی عملی زندگی پر پورا تسلط حاصل کر لیا تھا، اور کوئی اس "بدعت حسنہ" کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عالمِ اسلام کی دوسری سب سے عظیم سلطنت[2] اور اس میں بسنے والے وسیع مسلم معاشرہ کا رخ چند ذاتی رجحانات شخصی اغراض، خارجی اثرات اور موہوم سیاسی مصالح کی بنا پر دین حجازی سے وابستگی، نبوت محمدی کی پیروی اور اسلامی تہذیب کی نمائندگی سے بدل کر ہندی فلسفہ،

---

[1] واوین کے درمیان کی عبارت سے مصنف نے ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو عزیز گرامی مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی تحریک و تحریض سے (جو پیام انسانیت کے اس دورۂ مشرقی پنجاب میں شریک تھے) حضرت مجدد الف ثانی کے مزار سے متصل خانقاہ کی مسجد میں بیٹھ کر اس تصنیف کا آغاز کیا، مصنف بول رہا تھا، اور اس کے رفیق سفر و معاون عزیز مولوی اسحاق جلیس ندوی مرحوم مدیر "تعمیر حیات" لکھ رہے تھے، تبرکاً اس عبارت کو اس مقدمہ میں شامل و تحلیل کر دیا گیا ہے، اصل کتاب کے شروع کرنے میں پھر بھی تقریباً ڈیڑھ سال کا وقفہ ہوا، کتاب ۹ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ (۳۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء) کو عملاً شروع ہوئی، دو بیرونی سفروں کی وجہ سے اس میں طویل طویل وقفے آتے رہے، کل مدت تصنیف ۲-۳ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

[2] سلطنت عثمانیہ کے بعد اپنے رقبہ، فوجی طاقت، وسائل و ذخائر کے لحاظ سے ہندوستان عالمِ اسلام کے نقشہ پر سب سے بڑی مسلم سلطنت تھی جس کے حدود مشرقی بنگال سے افغانستان کے مغربی حدود تک وسیع تھے۔

ہندی تہذیب اور "وحدتِ ادیان" کی طرف موڑا جا رہا تھا، اور اس کوشش و سازش میں اس عہد کے بعض ذہین ترین اور لائق ترین افراد شامل تھے، اور ببانگ دہل "نیا دور نیا آئین" "نیا ہزارہ نئی امامت" کا نعرہ بلند کیا جا رہا تھا۔

اس صورت حال کو کس طرح بدلنے کی کوشش کی گئی، اس کے لئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا گیا، اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی، پھر ایک گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر کس طرح "آدم گری" و "مردم سازی" روحانی تزکیہ و تربیت کا وہ کام انجام دیا گیا جس کے نتیجہ میں وہ مردانِ کار تیار ہوئے، جنھوں نے ہندوستان کے مختلف مرکزی مقامات میں بیٹھ کر اور پھر افغانستان و ترکستان اور پھر عراق و شام و ترکی و حجاز میں پھیل کر یادِ خدا کی سرگرمی، اعلاءِ کلمۃ اللہ کی کوشش، مردہ سنتوں کے احیاء، حمایتِ شریعت و اماتتِ بدعت کا عظیم الشان کام انجام دیا، وحدۃ الوجود کے غالی داعیوں اور آزاد مشرب صوفیوں کے اثرات کا ازالہ کیا، اور مختصر اً خدا طلبی اور احترامِ شریعت کا صور پھونک دیا، اور کم سے کم تین صدیوں تک اس کام کو اس قوت و عزیمت اور اس انہماک و مصروفیت کے ساتھ جاری رکھا کہ پورے عالم اسلام میں ہر جگہ وہی وہی نظر آتے ہیں، اور یہ تین صدیاں انھیں کی روحانی و علمی قیادت کی صدیاں کہلانے کی مستحق ہیں، اور اس عالمگیر اثر کو دیکھ کر ایک حقیقت پسند انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اس سلسلہ میں دو اور پہلو بھی قابلِ لحاظ تھے، ایک تو یہ کہ حضرت مجدد صاحب کے عہد کی تصویر کشی اور دورِ اکبری کا نقشہ پیش کرنے کے سلسلہ میں ملا عبد القادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اور ان تاریخی مآخذ پر انحصار نہ رکھا جائے جو خاص دینی جذبات یا ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل اور عہد اکبری کی تاریک سے تاریک تر تصویر پیش کرنے کے عادی ہیں، اس سلسلہ میں

ان غیر جانبدار مصنفین یا دربارِ اکبری کے ان اہلِ قلم کی تحریر و بیانات سے مواد حاصل کیا جائے جو نہ صرف یہ کہ اکبر کے مخالف نہ تھے، بلکہ اس کے وکیل و نقیب اور اس کے خیالات و مقاصد کے ترجمان اور اس کے آئین سلطنت اور اس کے خداداد کمالات کے معترف و معترف تھے، اسی طرح ان تبدیلیوں کا بھی مؤرخانہ و مبصرانہ جائزہ لیا جائے جو جہانگیر کے دور سے شروع ہو کر عالمگیر کے عہدِ سلطنت پر جا کر مکمل ہوئیں، اور اس سلسلہ میں بھی خاندان مجددیہ کے مصنفین کے بیانات اور خوش اعتقاد مؤرخوں کی شہادتوں کے بجائے غیر جانبدار مؤرخین ہندوستان کی کتابوں سے مواد اخذ کیا جائے اور ان کی روشنی میں اس دعوے کا ثبوت مہیا کیا جائے۔

نیز اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس ربع صدی میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اردو اور انگریزی میں مجدد صاحب اور ان کے دور پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں بہت سے مشہورات و مسلّمات کو چیلنج کیا گیا ہے، نئے سوالات اٹھائے گئے ہیں، اور واقعات و معلومات یا اپنے اخذ کردہ نتائج کی مدد سے بالکل ایک نئی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے (جو اس تابناک اور درخشاں تصویر سے بہت مختلف ہے، جو ابھی تک پیش کی جاتی رہی ہے) ان کو بھی سامنے رکھا جائے، اور خواہ ان کے ایک ایک دعویٰ کا نام لے لے کر تردید نہ کی جائے لیکن مجدد صاحب کی یہ نئی سیرت اور ان کے کارناموں اور ان کے دور کا یہ جائزہ خود بخود ان کتابوں کا جواب اور ان دعوؤں اور اعتراضات کی تردید ہو جائے۔

اپنی شدید مصروفیت، کثیر ملکی و بیرونی اسفار، صحت کی کمزوری اور معاونوں کی کمی[1] کے ساتھ

---

[1] اس موقع پر ناسپاسی ہوگی، اگر رفیق عزیز مولوی شمس تبریز خاں (رفیق "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام") کا شکریہ نہ ادا کیا جائے جنھوں نے فارسی کی بعض قدیم کتابوں سے مواد مہیا کرنے اور لمبی لمبی فارسی عبارتوں کا ترجمہ کرنے میں مصنف کی بیش قیمت مدد کی، نیز عزیزی ناصر الاسلام ندوی بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ کتاب کی تسوید اور مآخذ سے استفادہ میں ان سے علمی مدد ملی۔

کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ دعوت وعزیمت کا یہ حصہ جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سیرت اور ان کی خدمات و کارناموں پر مشتمل ہے بعض نئے معلومات اور ایسے مواد کے ساتھ جن سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا تھا، اور بعض اہم اور غور طلب نتائج اور دعوت فکر و عمل کے ساتھ جلد منظر عام پر آجائے، شاید ہم اس سے اس زمانہ کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے اور آنے والی پندرہویں صدی کا استقبال کرنے میں (جس کا عالم اسلام کے مختلف حصوں میں استقبال کیا بھی جا چکا ہے) کچھ مدد حاصل کر سکیں۔ "وما توفیقی إلا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب"

آخر میں اس کا اعتراف و شکریہ بھی ضروری ہے کہ مجددی خاندان کی شاخوں اور مجددی سلسلہ کے مشائخ کبار کے سلسلہ میں مخدوم محترم مولانا ابوالحسن زید فاروقی مجددی (فرزند گرامی حضرت شاہ ابوالخیر مجددیؒ) سے وہ بیش قیمت معلومات حاصل ہوئیں جن کا حصول کسی اور ذریعہ سے بظاہر نہایت دشوار تھا، فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی بھی مصنف کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کے ذاتی کتابی ذخیرہ میں بعض ضروری قلمی کتابیں اور مفید مواد حاصل ہوا، اور انھوں نے بڑی فراخدلی سے ان سے استفادہ کی اجازت دی۔ مصنف ڈاکٹر نذیر احمد صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی علمی اعانت کا بھی شکر گزار ہے۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ
۱۳ اپریل ۱۹۸۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اوّل

عالم اسلام دسویں صدی میں

دسویں صدی (ہجری) کے تاریخی مطالعہ کی اہمیت

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ولادت شوال ۹۷۱ھ اور وفات صفر ۱۰۳۴ھ میں ہوئی، اس طرح ان کا عہد دسویں صدی کے آخری انتیس [۲۹] سال، اور گیارہویں صدی کے تقریباً تینتیس [۳۳] سال ہیں، ان کے عہد کے مؤرخ اور ان کی شخصیت کے سوانح نگار کو اصلاً اسی تریسٹھ [۶۳] سال کی مدت سے سروکار ہونا چاہئے جو ہجری تقویم کی ان دو صدیوں کے آخری اور ابتدائی ثلث سے تعلق رکھتی ہے۔

لیکن حقیقتاً کسی کی ولادت سے خواہ وہ کتنی عظیم شخصیت ہو یکایک کسی ایسے نئے عہد کا آغاز نہیں ہو جاتا جو اچانک کتم عدم سے عالم وجود میں آئے اور اس پر ان واقعات و حوادث، ان تاریخی عوامل، اس سیاسی، اخلاقی، علمی پس منظر، اور ان سلطنتوں اور طاقتوں کا اثر نہ ہو جو اس کی پیدائش سے پہلے سے کارفرما اور ماحول و معاشرہ پر اثر انداز ہو رہی تھیں اس لئے ہم کو حضرت مجدد کی سیرت و سوانح کی ترتیب اور ان کے اصلاحی و تجدیدی کارنامہ کے تذکرہ، ان کے عہد کا مزاج سمجھنے اور ان کے کام کی دشواریوں پر

آسانیوں کا صحیح اندازہ اور تقابل کرنے کے لئے اس عہد کے عالم اسلام کا سیاسی، دینی، علمی اور اخلاقی حیثیت سے تاریخی جائزہ لینے کی ضرورت ہوگی جس سے ان کو بدوِ شعور سے واسطہ پڑا، اور جس میں ان کو اپنا وہ انقلاب انگیز اور عہد آفریں تجدیدی و اصلاحی کارنامہ انجام دینا تھا جس کی بنا پر وہ بجا طور پر مجدد الف ثانی کہلائے۔

اس جائزہ میں ہم کو اس تاریخی حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ ایک عہد اور اس عہد کی دنیا اور انسانی معاشرہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہوتا ہے، جس کی ہر موج دوسری موج سے مربوط و متصل ہوتی ہے، اس لئے کوئی ملک خواہ وہ باقی دنیا سے کتنا ہی کٹا ہوا اور الگ تھلگ زندگی گذار رہا ہو، گرد و پیش کی دنیا میں پیش آنے والے اہم واقعات انقلابات، باہم نبرد آزما طاقتوں، اور طاقتور تحریکوں سے یکسر غیر متاثر اور غیر متعلق نہیں رہ سکتا، خاص طور پر جب یہ واقعات و انقلابات اس کے ہم جنس، ہم مسلک اور ہم عقیدہ پڑوسی ممالک میں پیش آرہے ہوں، اس بنا پر اس تاریخی جائزہ میں ہندوستان کے دائرہ کے اندر محدود رہنا درست نہیں ہوگا، ہم کو دسویں صدی ہجری کی پوری دنیائے اسلام، اور خاص طور پر گرد و پیش کے مسلم ممالک پر بھی نظر ڈالنی ہوگی، جن سے اگرچہ ہندوستان کے سیاسی روابط نہ تھے لیکن دینی، تہذیبی اور علمی روابط تھے، اور وہاں جو سرد و گرم ہوائیں چلتی تھیں، ان کے جھونکے بُعد مسافت کے باوجود ہندوستان تک بھی پہونچ جاتے تھے۔

سیاسی حالت

دسویں صدی کے اوائل میں عرصہ کے بعد (غالباً سلطان صلاح الدین ایوبی

متوفی ۵۸۹ھ کے بعد) عالم اسلام کے مرکزی حصہ (مشرق وسطی) کو سیاسی استحکام حاصل ہوا تھا، اور مغربی ایشیا کے عرب ممالک ایک ایسے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے تھے، جس کے بلند کرنے والے اپنے کو حامی اسلام، خادم الحرمین الشریفین اور مسلمانوں کا پاسبان کہتے تھے، اور جنھوں نے (خواہ اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر) خلافت کو بھی زندہ کر دیا تھا، جو آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کی تاتاریوں کے ہاتھوں شہادت (۶۵۶ھ) کے بعد سے مصر میں "عیسوی پاپائیت" کی طرح رہ گئی تھی، یاووز سلطان سلیم اول بانی خلافت عثمانیہ (۹۱۸ھ۔۹۲۶ھ) نے ۹۲۲ھ میں شام اور ۹۲۳ھ میں مصر فتح کیا، جو ڈھائی سو برس (۲۵۰) سے سلاطین مملوک کے زیر حکومت چلا آرہا تھا، سلیم کے حملہ کے وقت اس کا حکمراں قانصوہ غوری تھا، اسی ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم نے خلافت اور اس کے بعد حرمین شریفین کی تولیت و خدمت کا اعلان کیا، جزیرۃ العرب پھر رفتہ رفتہ شمالی افریقہ کے مسلم و عرب ممالک (باستثناء مراکش) سلطان سلیم پھر اس کے جانشین سلیمان اعظم قانونی (۹۲۶ھ۔۹۷۴ھ) (جس کو مغربی مصنفین "سلیمان ذی شان" کے لقب سے یاد کرتے ہیں) کے زیر حکومت آگئے، سلیمان اعظم کا عہد حکومت (جس کی وفات سے تین سال پہلے حضرت مجدد کی ولادت ہوئی) سلطنت عثمانیہ کے اوج اقبال کا زمانہ ہے، ایک طرف یورپ میں آسٹریا اور ہنگری میں اس کے فتح و اقبال کا جھنڈا نصب تھا، دوسری طرف ایران میں اس کی فوجیں فاتحانہ طریقہ پر یلغار کر رہی تھیں، مصر و شام کے ساتھ عراق (عرب) بھی اس کی وسیع مملکت میں شامل ہو گیا تھا، اس وقت وہ دنیا کی سب سے بڑی مملکت (ایمپائر) کا فرمانروا تھا، مراد ثالث (۹۸۲ھ۔۱۰۰۳ھ) کے زمانہ میں جزیرۂ قبرص، صوبۂ تونس سلطنت ایران کے بعض زرخیز صوبے اور یمن دولت عثمانیہ میں شامل تھے، اسی کے زمانہ میں ۹۸۴ھ میں حرم مکی کی تعمیر کی تکمیل ہوئی، یہ مجدد صاحب کے شعور کا

زمانہ تھا، ان کو ضرور ان اہم واقعات کا علم ہوگا، اس عہد کے مسلمان (خواہ وہ ہندوستان کے باشندے ہوں) عثمانی ترکوں کی (جو متصلب قسم کے سنی حنفی تھے) ان فتوحات و وسعتِ سلطنت سے ضرور مسرور ہوتے ہوں گے۔

اسی صدی کی ابتدا (۹۰۵ھ) میں ایران و خراسان میں صفوی خاندان کا ظہور ہوا اس سلطنت کا بانی شاہ اسماعیل صفوی تھا (۹۰۵ھ۔۹۳۰ھ) اس خاندان نے رفتہ رفتہ اس پورے علاقہ پر اپنا مستحکم اقتدار قائم کرلیا، یہ سلطنت عثمانیہ کے متوازی سلطنت تھی، جس نے سلطنت عثمانیہ کے بالمقابل مذہب اثنا عشری جعفری کو حکومت کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا، حکومت کے اقتدار اور وسائل سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے پورے ایران میں اس مذہب کی اشاعت و ترویج کا بیڑہ اٹھایا، اور اس میں اس نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، اس طرح یہ حکومت اپنے حدود پر مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک انسانی دیوار کھڑی کرکے عثمانیوں (جن کے ہم مذہب (سنی حنفی) قسطنطنیہ سے لے کر لاہور و دہلی تک پھیلے ہوئے تھے) کی وسیع مملکت (ایمپائر) میں تحلیل ہونے سے محفوظ ہوگئی، اس خاندان کی حکومت بغداد سے ہرات تک تھی۔

اس خاندان کا سب سے باعظمت حکمراں شاہ عباس (۹۹۵ھ۔۱۰۳۷ھ۔ جو تاریخ میں شاہ عباس اعظم کے نام سے ملقب ہے، اور جس کو اپنے تعمیری کارناموں کی بنا پر اس خاندان کا شاہجہاں کہا جاسکتا ہے) حضرت مجدد صاحب کا معاصر ہے، صفوی حکومت شاہ عباس اول کے زمانہ میں انتہائی عروج کو پہونچی، اس نے ترکوں سے لڑکر نجف اور کربلا کو حاصل کرلیا، وہ اکبر اور جہانگیر کا معاصر تھا، شاہ عباس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہوگیا۔

دنیائے اسلام کا دوسرا اہم مشرقی خطہ ترکستان تھا، جو صدیوں تک اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا، اور جس کو قدیم ادبیات میں ماوراء النہر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور جس نے فقہ حنفی کی تدوین میں (عراق کے بعد) سب سے بڑا حصہ لیا، اور اس کی متعدد زندہ جاوید کتابیں جو ہندوستان کے نصاب میں ابھی تک داخل ہیں، وہیں تصنیف ہوئیں[1]، نیز سلسلۂ نقشبندیہ (جس سے حضرت مجدد اور ان کے مشائخ کا تعلق ہے) وہیں پیدا ہوا، پھلا پھولا، اور وہیں سے دنیا میں پھیلا، یہ زرخیز و مردم خیز ملک دسویں صدی کی ابتدا (۹۰۵ھ) ہی سے ازبکوں کے شیبانی خاندان کے قبضہ و اقتدار میں آگیا، اور ۹۱۶ھ کے ایک مختصر وقفہ کے علاوہ (جس میں بابر نے صفویوں کی مدد سے ماوراء النہر پر حملہ کیا تھا، اور اس وقت کے دارالسلطنت سمرقند پر قابض ہوگیا تھا) اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط (انقلاب روس) تک انھیں کے زیر نگیں رہا، دسویں صدی میں شیبانی خاندان کے دو حکمراں عبید اللہ بن محمد (۹۱۸ھ-۹۴۶ھ) اور عبید اللہ بن اسکندر (۹۶۴ھ-۱۰۰۶ھ) کا دارالسلطنت بخارا تھا، ان کی بدولت بخارا دوبارہ فکری و سیاسی زندگی کا مرکز بن گیا۔

ہندوستان کا سب سے قریبی ہمسایہ ملک جو اس کے مغرب میں واقع ہے افغانستان ہے، یہ ملک دسویں صدی کی ابتدا میں ترکستان کے ازبکوں اور ایران کے صفویوں، اور درمیان درمیان میں مقامی حوصلہ مندوں کی تاخت میں رہا، کابل و قندھار پر کبھی مغل اور کبھی ایرانی قابض ہوجاتے تھے، اور ہرات ایران کے حدود پر ہونے کی وجہ سے اکثر صفوی سلطنت کے زیر اثر رہا، ۹۲۸ھ میں بابر نے قندھار کو فتح کیا، پھر جب اس نے

[1] مثلاً شرح وقایہ، ہدایہ۔

ہندوستان میں تیموری سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اپنا مستقر ہندوستان کو بنایا، جہاں سے
وہ کابل، بدخشاں و قندھار تک حکومت کرتا تھا، اس وقت افغانستان، ہندوستان و
ایران کی دو بڑی سلطنتوں کے زیر اثر ایک نسبتاً منظم اور پر امن دور میں داخل ہوا، وہ
ان دونوں سلطنتوں کے درمیان اس طرح بٹ گیا تھا کہ ہرات و سیستان کے صوبے ایران
کے پاس رہے (اگرچہ ان پر وقتاً فوقتاً ازبکوں کے حملے ہوتے رہتے تھے) کابل سلطنت مغلیہ
کا جزء بنا رہا، اور قندھار پر کبھی مغل کبھی ایرانی قابض ہو جاتے، کوہستان کے شمال میں بابر
کے چچا زاد بھائی سلیمان مرزا نے (جسے بابر نے بدخشاں کا والی بنایا تھا) ایک نیم آزاد
شاہی خاندان کی بنیاد قائم کر لی، ملک کے باقی ماندہ اقطاع شیبانیوں کے زیر نگیں
رہے، ۹۶۵ھ میں طہماسپ شاہ ایران نے قندھار پر قبضہ کر لیا، اور ۱۰۰۳ھ تک
یہ شہر ایرانیوں کے قبضہ میں رہا، ۱۰۰۳ھ میں شہزادہ مظفر حسین نے اسے اکبر کے حوالہ کیا،
اس وقت سے افغانستان کا ملک ہندوستان کی مغل سلطنت کا ایک صوبہ رہا،
اور یہ سلسلہ بارہویں صدی کے وسط تک قائم رہا، یہاں تک کہ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ
افشار کے ہاتھوں آل بابر کی دو سو چالیس ۲۴۰ سال کی حکومت افغانستان سے اٹھ گئی۔

دسویں صدی شروع ہوئی تو ہندوستان میں لودھی خاندان کی حکومت تھی، جس کا
آخری حکمراں ابراہیم لودھی ۹۳۲ھ میں بانی سلطنتِ مغلیہ ظہیر الدین محمد بابر گورگانی
(۸۸۸ھ۔۹۳۹ھ) کے ہاتھ سے قتل ہوا، اور سلطنت مغلیہ کی بنیاد پڑی، جو ہندوستان
کی مسلم سلطنتوں میں سب سے وسیع مستحکم و منظم اور طویل العمر سلطنت تھی، لودھی خاندان
اپنی افغانی نسل و روایات کی بنا پر اسلام کا حلقہ بگوش، مذہب حنفی کا پابند تھا، جو تجدد
پسندی اور نامذہبی (سیکولر) سیاست سے نا آشنا تھا، اس خاندان کا سب سے دیندار،

معارف نواز اور علماء کا قدر دان و سرپرست بادشاہ سکندر لودھی (م ۹۲۳ھ) تھا
اسی صدی کے پانچ خوش نصیب سال (۹۴۶ھ۔۹۵۲ھ) شیر شاہ سوری کے
زیر حکومت گذرے، جس سے زیادہ تنظیم و دستور سازی کی صلاحیت اور رفاہی کاموں
کی توفیق رکھنے والا مسلمان بادشاہ اور صاحب علم اور دیندار حکمراں اس سے پہلے
کی ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں نہیں گزرا، شیر شاہ کے انتقال کے بعد سے اکبر کی
تخت نشینی تک ہندوستان کو سیاسی و انتظامی استحکام، اور حکومت کو استقرار، اور
اہل ملک کو فارغ البالی حاصل نہیں ہوئی، شیر شاہ سوری کا جانشین سلیم شاہ اپنے
عبقری (GENIUS) باپ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا، بابر کا جانشین نصیر الدین ہمایوں
(۹۳۷ھ۔۹۶۳ھ) ہندوستان میں اطمینان کے ساتھ سلطنت نہ کر سکا، اور شیر شاہ
کے فاتحانہ حملوں اور بھائیوں کی بے وفائی سے پریشان اور سرگرداں رہا، اور جب تک
ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی سے مدد لے کر نہیں آیا، اس کو استقرار نصیب نہیں ہوا،
۹۶۳ھ میں اکبر تخت نشین ہوا، اور پوری نصف صدی تک بڑے کر و فر سے
حکومت کی۔

مجدد صاحب کے زمانہ ہی میں جب ان کی عمر ۴۳ سال کی تھی، نور الدین جہانگیر
تخت نشین ہوا، اور اسی کے عہد میں مجدد صاحب نے وفات پائی، اس مرکزی سلطنت
کے علاوہ جس کا پایہ تخت دہلی تھا، گجرات، بیجاپور، گولکنڈہ، اور احمد نگر میں علاقائی
حکومتیں قائم تھیں، جو خود مختار طریقہ پر سلطنت کر رہی تھیں، ان میں سے تین آخر الذکر
شیعہ مذہب رکھتی تھیں۔

مذہبی وروحانی حالت

اس وقت پوری دنیائے اسلام کے ذہن پر مذہب کی گرفت مضبوط تھی، عوام عام طور پر (اپنی علمی واخلاقی کمزوریوں کے باوجود) راسخ الاعتقاد مسلمان، دین پسند اوراسلام دوست تھے، ان میں خاص دینی حمیت اور اسلامی جوش پایا جاتا تھا، اگرچہ بہت سی بدعات اور خلاف اسلام افعال کے مرتکب ہوتے رہتے تھے، لیکن عام طور پر کفر والحاد سے بیزار ومتنفر تھے۔

ان کے اس عمومی دینی ذوق اور مزاج کی وجہ سے سلاطین اسلام کو بھی (جو بڑی سے بڑی مخالف طاقت کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور جن کی فوجی طاقت نے یورپ کو بھی لرزہ براندام کر رکھا تھا) شعائر اسلام کا احترام، اور دین کی حمایت و نصرت کا اظہار واعلان کرنا پڑتا تھا، اور عوام کے دلوں پر اس وقت تک ان کی عظمت ومحبت کا نقش قائم نہیں ہونے پاتا تھا جب تک کہ وہ اپنے اس دینی پہلو کو نمایاں نہ کریں، سلطان سلیم اول کی سلطنت میں اس وقت تک استحکام نہیں پیدا ہوا جب تک کہ اس نے خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین الشریفین کا لقب اختیار نہیں کیا، اس نے اپنے دمشق کے قیام کے دوران مقامات مقدسہ سے اپنی نیازمندی اور عقیدت کا برملا اظہار کیا، ذی الحجہ ۹۲۳ھ میں سلیم نے حاجیوں کا ایک قافلہ دمشق سے روانہ کیا جس کے ساتھ پہلی مرتبہ ترکی سلطان کی طرف سے بطور ہدیہ غلاف کعبہ بھیجا گیا، اس وقت سے ...... سلاطین ترکی خادم الحرمین الشریفین کا خطاب استعمال کرنے لگے جس کی وجہ سے انھیں اسلامی دنیا میں بڑا وقار حاصل ہوا، سلیمان اعظم کی زندگی میں تواضع اور خاکساری

اور گہرے دینی جذبات کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، اس نے قرآن مجید کے آٹھ نسخے اپنے ہاتھ سے لکھے جو سلیمانیہ میں محفوظ ہیں، وہ اپنے دیوان کی غزلوں اور نظموں سے ایک راسخ الاعتقاد مسلمان ظاہر ہوتا ہے اس نے مفتی ابوالسعود (م ۹۵۲ھ) (صاحب تفسیر ابوالسعود) کے فتوے کی سند پر کعبۃ اللہ کی ازسرنو تعمیر کی، اور مکہ مکرمہ کی پختہ کاریزیں بنوائیں، سلطان مراد نے ۹۸۴ھ میں کعبۃ اللہ کی عمارت کی تکمیل کی، (جس پر وہ اس وقت تک قائم ہے) یہ سب دسویں صدی کے سلاطین آل عثمان کے کارنامے ہیں۔

ایران کی (شیعی) سلطنت میں بھی عوام کا ذہن مذہبی، اور ذوق دینی خوش عقیدگی کا تھا، اور سلاطین صفویہ اس کو غذا پہونچا کر اور مذہب اور اہل بیت سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرکے اس سے ملک میں سیاسی استحکام، اور عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کا کام لیتے تھے، ایران کے سب سے عظیم حکمراں شاہ عباس اول نے صرف زیارت کی غرض سے اصفہان سے مشہد تک پیدل آٹھ سو میل کا سفر کیا، اور نجف میں حاضر ہو کر روضۂ مرتضوی پر جھاڑو دی۔

شاہ عباس سے ایرانیوں کی عقیدت غلو اور وہم پرستی کی حد تک پہونچ گئی تھی، اور لوگوں میں عجیب عجیب روایات مشہور تھیں۔

ترکستان وافغانستان کے لوگوں کی راسخ الاعتقادی، دینی صلابت، سنیت اور مذہب حنفی کی پابندی میں تصلّب ضرب المثل ہے، ان کے حکمراں اور سربراہانِ مملکت، ارکان سلطنت، اور خواص وامراء بھی (اپنی سطح اور معیار زندگی کے مطابق) بہت حد تک ان کے ہم رنگ اور ہم آہنگ تھے۔

ہندوستان میں مسلم سلطنتوں کی بنیاد ترکی وافغانی النسل خاندانوں اور حکمرانوں

کے ہاتھ سے پڑی، اس لئے شروع سے یہاں بھی مذہب کا اثر گہرا لیکن سیدھے سادہ رنگ کا تھا، جو ترکی و افغانی ذہنیت و مذاق کا خاصہ ہے، یہاں شروع سے طریقۂ اہل سنت والجماعۃ، اور مذہب حنفی کی (چند سواحلی مقامات اور جنوبی ہند کے علاقہ مالابار کو مستثنیٰ کرکے) پابندی رہی، اور شروع سے وہی مملکت کا دستور اور عدالتوں کا قانون رہا، یہاں فقہ حنفی کی بعض اہم کتابیں "فتاویٰ تاتارخانی" اور "فتاویٰ قاضی خاں" لکھی گئیں۔[1]

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں متعدد بادشاہ اپنی حمایتِ سنت و شریعت، کفر و الحاد سے بیزاری، بدعات و منکرات کی مخالفت و ازالہ، اور دینی حمیت میں ممتاز نظر آتے ہیں، آٹھویں صدی میں محمد تغلق، و فیروز تغلق، اور دسویں صدی میں سلطان سکندر لودھی کا نام لینا کافی ہے، "طبقات اکبری" "تاریخ فرشتہ" اور "تاریخ داؤدی" کے مصنفین کے بیان کے مطابق سلطان سکندر کے عہد میں مذہب کی پابندی ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کا ایک نیا طریقہ پیدا ہوگیا ہے، وہ اپنے نفس سے نفس اسلام کو زیادہ عزیز رکھتا تھا، ان کے بقول سلطان کو اپنی ابتدائے عمر سے تعصبِ مذہبی دامنگیر تھا، بادشاہ کو تذکرۂ علمی کا شوق تھا، اس کے عہد میں ہندؤں کے فارسی پڑھنے کا آغاز ہوا، کائستوں نے بادشاہ کا مشورہ قبول کیا، سلطان نے سالار مسعود کی چھڑیاں جو سالانہ جاتی تھیں اپنی مملکت میں بالکل موقوف کر دیں، مزارات پر زیارت کے لئے عورتوں کے جانے کی سخت ممانعت کر دی، بعض مؤرخ لکھتے ہیں کہ تعزیوں کے نکلنے اور (چیچک کی دیوی) سیتلا کی پوجا کو بھی سختی سے روکا[2]، مشتاقی نے لکھا ہے کہ

---

[1] یہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین سے بہت پہلے کا زمانہ ہے جس نے عالم اسلام میں شہرت حاصل کی، اور فتاویٰ ہندیہ کے نام سے مصر و شام و عراق میں مشہور ہے۔ [2] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی جلد دوم ص ۳۷۴

"قبور بلامیت را نہر ساختہ" بہت سی جعلی قبریں جو اس زمانہ میں وجود میں آگئی تھیں، وہاں نہریں جاری کر کے ان کا نام و نشان مٹا دیا۔[1]

سلطان سلیم شاہ سوری مساجد میں خود نماز پڑھاتا تھا، مسکرات سے سختی سے مجتنب تھا۔

یہ دور تصوف اور سلاسل و طرق صوفیہ کے انتہائی عروج کا تھا، عالم اسلام کا کوئی ملک اور خطہ ایسا نہ تھا، جہاں کوئی سلسلہ پایا نہ جاتا ہو، گھر گھر اس کا چرچا تھا، اس سلسلہ میں ترکستان کے دو مشہور شہر اور علمی و روحانی مرکز بخارا اور سمرقند، افغانستان میں ہرات اور بدخشاں، مصر میں اسکندریہ اور طنطا، یمن میں تعز اور صنعاء، حضرموت میں تریم، شحر اور سیون علماء اور صوفیاء اور مشائخ کا بڑا مرکز تھے، حضرموت میں باعلوی عیدروس خاندان بڑا مقبول اور صاحبِ کمال خاندان تھا، اسی دور میں ان اطراف میں الشیخ ابوبکر بن عبداللہ بن ابوبکر بہت عالی مرتبہ شیخ اور قطب دوراں سمجھے جاتے تھے، تریم سادات آل باعلوی کا مستقر تھا، اس زمانہ کے مشہور اولیاء میں شیخ سعد بن علی السوینی بامذحج السعید تھے، شیخ محی الدین عبدالقادر عیدروسی (۹۷۸ھ-۱۰۳۷ھ) نے اپنی مشہور کتاب "النور السافر فی رجال القرن العاشر"[2] کو انھیں کے تذکرہ پر ختم کیا ہے، جو ص ۴۶۶ سے ص ۴۸۰ تک پھیلا ہوا ہے۔

ہندوستان میں دسویں صدی میں اگرچہ سلسلۂ قادریہ اور سلسلۂ چشتیہ کی دونوں شاخیں (نظامیہ اور صابریہ) پھیلی ہوئی تھیں، اور ان میں متعدد باکمال اور صاحبِ حال شخصیتیں پائی جاتی تھیں، لیکن حقیقتاً یہ صدی سلسلۂ عشقیہ شطاریہ کی صدی ہے جس نے

---

[1] واقعات مشتاقی [2] یہ کتاب ۱۰۱۲ھ میں احمد آباد میں لکھی گئی۔

(جدید تعبیر کے مطابق) ہندوستان کے صاحب ولایت سلسلۂ چشتیہ سے اس ملک کا روحانی چارج لیا، اور سارے ہندوستان کو تسخیر کرلیا۔[1]

طریقۂ شطاریہ کے بانی شیخ عبداللہ شطار خراسانی ہیں، جو غالباً نویں صدی کے اوائل میں ہندوستان تشریف لائے، اور مانڈو میں سکونت اختیار کی، ۸۳۲ھ میں ان کی وفات ہوئی، اور مانڈو میں اندرون قلعہ مدفون ہوئے، وہ امیرانہ ٹھاٹ سے رہتے تھے، صاحبِ جذب قوی تھے، خلق کثیر نے ان سے فائدہ اٹھایا اور تیزی سے ان کا سلسلہ ہندوستان میں پھیل گیا، اس طریقہ کی دو شاخیں ہیں، ایک شاخ کا تعلق شیخ محمد غوث گوالیاری سے ہے، ان کے اور شیخ عبداللہ شطاری کے درمیان تین واسطے ہیں، دوسری شاخ کے بانی شیخ علی بن قوام جونپوری (شیخ علی عاشقاں سرائے میری) ہیں، ان کے اور شیخ عبداللہ شطاری کے درمیان دو واسطے ہیں، اس سلسلہ نے غالباً پہلی مرتبہ جوگ کو تصوف کے ساتھ ملایا، اور ان کے سلوک کے بعض طریقے اور اذکار، اور بعض آسن اور حبس دم کا طریقہ اختیار کیا اور اپنے مریدین کو ان کی تعلیم دی، نیز علم سیمیا کو بھی شامل کیا، ان آسنوں کی تشریح اور اس کے اذکار کی تفصیل "رسالہ شطاریہ" مصنفہ بہاء الدین ابن ابراہیم الانصاری القادری میں موجود ہے،[2] شیخ محمد شطاری کی تصنیف "کلید مخازن" میں مصنف کا ایک مستزاد ہے،

---

[1] اس صدی میں سلسلۂ مداریہ بھی جس کے بانی شیخ بدیع الدین مدار مکن پوری (م ۸۴۴ھ) تھے، ہندوستان میں پایا جاتا تھا، اس سلسلہ کا مدار و شعار وحدۃ الوجود کے افکار و مضامین کا برملا اظہار و اعلان تجرید ظاہری (اس حد تک کہ محض شرمگاہ کے چھپانے پر اکتفا کیا جائے) اور توکل محض ہے، مرور ایام کے ساتھ اس سلسلہ میں انحطاط اور بے قیدی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ "مداری" بازیگر کا مرادف قرار پایا، دسویں صدی میں یہ سلسلہ خواص کے حلقہ میں اپنی مقبولیت کھو چکا تھا "نزہۃ الخواطر" کے حصۂ چہارم میں (جس میں ہر سلسلہ کے مشائخ کا استیعاب کیا گیا ہے) تلاش سے صرف دو اشخاص ملے جن کو سلسلۂ مداریہ میں بھی بیعت تھی۔

[2] ملاحظہ ہو نسخۂ قلمی موجود کتب خانہ ندوۃ العلماء فن تصوف ۴۸، صفحہ ۴۷-۴۹

جس سے وحدۃ الوجود، بت خانہ و مسجد، اور شیخ و برہمن کی مساوات کا، اور ان سب چیزوں میں خدا کی تجلی، بلکہ ظہور کا صاف صاف اظہار ہوتا ہے کہ یہ سب اسی وحدت کے الوان و مظاہر ہیں، آخر کا شعر ہے ؎

عشقی شد و در مشرب شطار برآمد۔ خود غوث جہاں شد[1]

"رسالہ عشقیہ" میں کافری کو "جلال عشق" اور مسلمانی کو "جمال عشق" کہا گیا ہے، اور یہ شعر ملتا ہے ؎

کفر و ایمان قرین یک دگراند
ہر کہ را کفر نیست ایماں نیست[2]

ایک جگہ لکھا ہے:۔

"العلم حجاب اکبر گشت، مراد ازیں علم عبودیت کہ حجاب اکبر است، ایں حجاب اکبر اگر از میان مرتفع شود کفر بہ اسلام و اسلام بہ کفر آمیزد، و عبادت خدائی و بندگی برخیزد"[3]

اس سلسلہ کے سب سے نامور و با اثر شطاری شیخ محمد غوث گوالیاری تھے (م ۹۷۰ھ) جن کو رجوع عام اور قبول تام حاصل ہوا، اور جن کی شان و شوکت وزراء و امراء کے درباروں سے چشمک کرتی تھی، ان کی جاگیر کی آمدنی نو لاکھ سکہ نقرئی[4]، ان کے فیل خانہ میں چالیس[5] ہاتھی اور خدم و حشم کا ایک بڑا لشکر تھا، آگرہ کے بازار میں نکلتے تو ٹھٹھ لگ جاتے، ہر ایک کو جھک جھک کر سلام کرتے زین پر سیدھا بیٹھنا مشکل ہو جاتا، ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق شیخ محمد غوث نے اکبر کو ترکیب سے اپنا مرید بنا لیا تھا، لیکن بادشاہ نے جلد اس حلقۂ ارادت کو اپنی گردن سے دور کر دیا، اس امیرانہ بلکہ شاہانہ شان کے

---

[1] "کلید مخازن" ص ۱۹۶-۱۹۹ [2] "رسالہ عشقیہ" ص ۱۷ [3] ایضاً ص ۴۳ [4] بعض روایات میں ایک کروڑ تک ہے۔

باوجود ملک میں ان کے فقر کی دھوم مچی ہوئی تھی، سلام کرنے کے وقت تا بحدِّ رکوع جھک جاتے تھے، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، علماء کو اس پر اعتراض تھا، ان کی تصنیفات میں "جواہر خمسہ" "معراجیہ"[1] "کنز الوحدۃ" اور "بحر الحیاۃ"[2] ہے، ہندوستان پر ان کا بڑا اثر پڑا، اور طریقۂ چشتیہ شطاریہ عام ہوا،[3] مجدد صاحب ان کے انتقال کے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔

اس سلسلہ میں شیخ علی بن قوام جونپوری معروف بہ علی عاشقان سرائے میری (م ۹۵۵ھ) شیخ لشکر محمد برہانپوری (م ۹۹۳ھ) شیخ اللہ بخش گڈھ مکتیسری (م ۱۰۰۲ھ) بڑے جلیل القدر مشائخ تھے، جن سے ایک عالم نے رجوع کیا، علی عاشقاں سرائے میری کے متعلق بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے بعد کسی سے ایسی کرامات کا ظہور نہیں ہوا جیسے ان سے،[4] شیخ محمد غوث گوالیاری کے خلف و خلیفہ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی (م ۱۰۰۵ھ) علامہ وجیہ الدین کے شاگرد تھے، پینتیس ۳۵ سال اکبر آباد میں (جو اکبر کا دار الحکومت تھا) رہے، بڑی مقبولیت حاصل کی، دربار اکبری میں کئی بار طلب کئے گئے، ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے کہ میں نے ان کو سلام مسنون کیا، تو ان کو

---

[1] انھوں نے اپنے لئے معراج کا دعویٰ کیا تھا جس پر علمائے گجرات میں بڑا ہنگامہ ہوا لیکن ملک العلماء شیخ وجیہ الدین گجراتی نے (جو اس وقت کے اکثر علماء کے استاد تھے) اس کی علمی توجیہ کی جس سے ہنگامہ فرو ہوا۔

[2] یہ کتاب امرت کنڈ کا ترجمہ ہے، شیخ محمد اکرام اپنی کتاب رود کوثر میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال کی تفصیل کو فارسی میں منتقل کیا ہے، اپنی ابتدائی تصنیف "جواہر خمسہ" میں ان کی ایک آدھ جھلک دکھائی، اس سے شطاریہ طریقہ کے اس ارتباط پر روشنی پڑتی ہے جو اس کو ہندو یوگا سے تھا" (ص ۳۴-۳۶)

[3] مشائخ شطاریہ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

[4] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "العاشقیہ" تصنیف عارف علی، یا "نزہۃ الخواطر" جلد پنجم۔

گراں گزرا، اور اس میں انھوں نے اپنی توہین محسوس کی، اور اس شعار اسلام اور سنت خیر الانام کی تضحیک کی، بدایونی نے ان کا اچھا نقشہ نہیں کھینچا ہے، اور ان کے استہزاء کے واقعات لکھے ہیں۔[1]

ان حضرات کے علاوہ شاہ عبد اللہ سندیلوی (۹۲۴ھ - ۱۰۱۰ھ) اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندی خلیفہ حضرت شیخ لشکر محمد عارف باللہ (جو حضرت مجدد صاحب کے معاصر اور قریب العمر ہیں) نامور مشائخ عشقیہ شطاریہ میں تھے۔[2]

سلسلۂ عشقیہ شطاریہ کے ان نامور مشائخ کے علاوہ ہندوستان میں دوسرے جلیل القدر مشائخ بھی موجود تھے، جن کا دوسرے سلسلوں سے تعلق تھا، ان میں سے ایک شیخ جائیں لدہ سہنویؒ[3] (م ۹۹۸ھ) ہیں، وہ "فصوص" اور "نقد النصوص" کا درس دیتے تھے، اکبر ان کا معتقد تھا، ایک دن ان کو صلوٰۃ معکوس پڑھتے دیکھا تو چلا گیا،[4] دوسرے شاہ عبد الرزاق جھنجھانوی (۸۸۶ھ - ۹۴۹ھ) قادری چشتی تھے، وہ صاحب تدریس و تصنیف عالم ہونے کے باوجود اپنے عہد میں وحدۃ الوجود اور شیخ اکبر کے مسلک کے سب سے بڑے علمبردار تھے، ان کے اس موضوع پر کئی رسائل ہیں، شیخ عبد العزیز شکر بار (۸۵۵ھ - ۹۷۵ھ) بھی وحدۃ الوجود کے قائل اور صاحب حال بزرگ تھے، وہ بھی "فصوص الحکم" اور اس کی شروح کا درس دیتے تھے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اجداد مادری میں بھی ہیں۔

اسی صدی میں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) کا آفتابِ ارشاد نصف النہار پر پہونچا، اور ان سے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کو نئی تازگی اور طاقت حاصل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "منتخب التواریخ" ملا عبد القادر، یا "نزہۃ الخواطر" جلد ۵۔ [2] ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵

[3] سہنہ ضلع گڑگانوہ (مشرقی پنجاب) میں ایک قصبہ ہے جہاں کا گرم چشمہ مشہور ہے۔ [4] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

ہوئی، وہ وحدۃ الوجود کے اسرار برملا زبان سے کہتے اور اس کے داعی تھے، جونپور میں شیخ قطب الدین بینا دل (۸۷۶ھ۔ ۹۲۵ھ) طریقۂ قلندریہ میں، اور کیتھل (ضلع انبالہ) میں شیخ کمال الدین (م ۹۷۱ھ) سلسلۂ قادریہ کے سرحلقہ اور صدرنشین تھے، جن سے ان دونوں طریقوں نے نئی آب و تاب پائی، شیخ کمال کیتھلی کے متعلق حضرت مجدد صاحب نے اپنے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحد سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ "جب نظر کشفی سے دیکھا جاتا ہے تو اس سلسلۂ عالیہ (قادریہ) میں پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر کے بعد ان سے بلند مرتبہ و باکمال شیخ نظر نہیں آتا"[1] اودھ میں شیخ نظام الدین امیٹھوی معروف بہ بندگی میاں (۹۰۰ھ۔ ۹۷۹ھ) سلسلۂ چشتیہ کے بڑے شیخ، حامی شریعت، اور متبع سنت بزرگ تھے، "احیاء العلوم" اور "عوارف" و "رسالہ مکیہ" پر ان کا عمل تھا، ایک شخص کے ہاتھ میں "فصوص" دیکھی تو اس کو چھین لیا، اور دوسری کتاب مطالعہ کو دی، ان کے سلسلہ میں اگرچہ سماع عام تھا، لیکن وہ اس سے محترز تھے۔[2]

یہ تھی اس وقت دنیائے اسلام کی مذہبی و روحانی صورت حال، اور یہ تھے ہندوستان کے مختلف المشرب اور متفاوت الدرجات شیوخ طریقہ اور اصحاب سلسلہ جو دسویں صدی ہجری میں مختلف مقامات پر اپنے روحانی اور تربیتی مرکز قائم کئے ہوئے تھے، اور ہندوستان میں گہرا دینی رجحان رکھنے والے طالب خدا اور محب الفقراء عوام و خواص ان سے کسی نہ کسی درجہ میں وابستہ اور ان کے حلقہ بگوش تھے، اس کو تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا، تاکہ مجدد صاحب کے عہد کی فضا، مذاق، رجحان، اور اس عہد میں دین کے احیاء و تجدید کے کام کے امکانات اور مشکلات دونوں کا اندازہ ہو۔

[1] زبدۃ المقامات ص۱۰۱   [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

علمی حالت

دسویں صدی ہجری اگرچہ علمی اختراع و ابتکار، مجتہدانہ فکر و نظر، علوم کی تدوینِ جدید اور ان میں وقیع اضافہ کی صدی نہیں تھی، یہ خصوصیات آٹھویں صدی کے وسط تک نمایاں نظر آتی ہیں، جس میں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ) علامہ علاء الدین الباجی (م ۷۱۴ھ) علامہ جمال الدین ابوالحجاج المزی (م ۷۴۲ھ) اور علامہ شمس الدین الذہبی (م ۷۴۸ھ) علامہ ابوحیان نحوی (م ۷۴۵ھ) جیسے سرآمد روزگار علماء پیدا ہوئے، جنھوں نے حدیث، اصول و علم کلام، فن رجال، اور علوم عربیت میں بلند پایہ اور گرانقدر تصنیفات یادگار چھوڑیں، امام فنِ حدیث علامہ ابن حجر العسقلانی صاحبِ "فتح الباری" (م ۸۵۲ھ) کا دور بھی گذر چکا تھا، جن کی بے نظیر شرح بخاری کے متعلق کہا گیا ہے کہ "لا ھجرۃ بعد الفتح"۔

دسویں صدی زیادہ ترجمع و ترتیب، اور تسہیل و تلخیص کی صدی تھی، پھر بھی اس کے اوائل میں علامہ شمس الدین سخاوی (م ۹۰۲ھ) اور علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) جیسے علوم دینیہ کے بحر زخار، اور اسلام کے مصنفین کبار گزرے ہیں، علامہ سخاوی کے متعلق بعض علماء کا قول ہے کہ امام شمس الدین ذہبی کے بعد علم حدیث، فن رجال اور تاریخ میں ان کے پایہ کا شخص پیدا نہیں ہوا، ان کے بعد فن حدیث کا زوال شروع ہوگیا، اصول و مصطلحات الحدیث میں ان کی کتاب "فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث" اور تذکرہ رجال میں "الضوء اللامع لأهل القرن التاسع" اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی ہیں، علامہ سیوطی تعریف و تعارف سے مستغنی ہیں کہ ان کا شمار تاریخ اسلام کے عظیم مصنفین میں ہے،

اوران کی بعض کتابیں اپنے موضوع پر دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہیں، اور تفسیر جلالین کے نصف اول نے جو ان کی تصنیف ہے، اور صدیوں سے درس میں داخل چلی آرہی ہے، ان کے نام کو اس وقت تک زندہ اور تابندہ رکھا ہے۔

اس صدی میں مصر وشام وعراق میں فن حدیث وعلم رجال، ایران میں علوم حکمیہ، (منطق وفلسفہ) ترکستان وہندوستان میں علم فقہ (حنفی) کا زور تھا، اور یہی معیار فضیلت اور درجۂ کمال سمجھے جاتے تھے، مصر میں علامہ احمد بن محمد قسطلانی، صاحب شرح صحیح البخاری (م ۹۲۳ھ) اور شیخ الاسلام زکریا انصاری (م ۹۲۵ھ) ترکی میں علامہ ابو السعود صاحب تفسیر (م ۹۵۲ھ) حجاز میں علامہ ابن حجر ہیتمی صاحب "الصواعق المحرقۃ" وکتب کثیرہ (م ۹۷۴ھ) اور علامہ علی متقی صاحب کنز العمال (م ۹۷۵ھ) رونق افروز تھے، اور ایک عالم کو اپنے درس سے مستفید کررہے تھے، مشہور محقق ومنصف حنفی عالم ومصنف ملا علی قاری اگرچہ ہرات افغانستان میں پیدا ہوئے، لیکن مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کرکے ایک عالم کو اپنے علم سے فیضیاب کررہے تھے، ان کا انتقال اگرچہ گیارہویں صدی کے اوائل (۱۰۱۴ھ) میں ہوا، لیکن ان کی علمی وتصنیفی خدمات کا زمانہ دسویں صدی ہجری ہی ہے، اسی صدی کے آخر میں ادیب ومؤرخ علامہ قطب الدین نہروالی[۱] مکی (صاحب "الاعلام فی اخبار بیت اللہ الحرام) نے ۹۹۰ھ میں انتقال کیا، جن کا خمیر ہندوستان کی سرزمین سے اٹھا تھا، اور جن کے کمال کی قدر ترکی وحجاز کے سلاطین وامراء نے کی۔

ایران کی سرزمین علامہ جلال الدین دوانی (م ۹۱۸ھ) ملا عماد بن محمود طارمی (م ۹۴۱ھ) اور علامہ غیاث الدین منصور (م ۹۴۸ھ) کی ذات پر مفتخر ونازاں تھی جنھوں نے

[۱] نہروالا انہلواڑہ کی تعریب ہے جو پٹن (گجرات) کا پرانا نام ہے، اور جس کو ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی نے فتح کیا۔

علم وحکمت کے دریا بہادیئے تھے، جن کی موجیں ہندوستان تک پہونچیں، اس عہد کے آخر کے بہت بڑے علماء میں شیخ محمد بن الشیخ ابی الحسن صدیقی شافعی اشعری مصری تھے، جن کو الاستاذ الاعظم، اور قطب العارفین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا مضامین عجیبہ اور نکات غریبہ بیان کرنے میں فرد فرید تھے، اور ربط آیات اور تفسیر وحدیث وفقہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، جامع ازہر میں درس دیتے تھے، شائقین علم پروانوں کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے، اسی کے ساتھ بڑے صاحبِ باطن، شیخ طریقت اور شاعر وادیب تھے[۱]، ۹۹۳ھ میں ان کا انتقال ہوا، اسی طرح مشہور ہندی محدث رحمۃ اللہ بن عبد اللہ سندھی حنفی (م ۹۹۴ھ) جنھوں نے حجاز میں بیٹھکر حدیث کی دولت عام کی، اور اپنی مہارت فن اور استادی کا دلوں پر سکہ بٹھادیا، ملک العلماء علامہ وجیہ الدین ابن نصر اللہ گجراتی جنھوں نے نصف صدی علوم دینیہ وعقلیہ کا درس دیا، اور جن کے تلامذہ نے ایک صدی سے زائد درس وتدریس کا ہنگامہ گرم رکھا، اسی صدی کے نصف آخر کی زینت تھے، اور اسی صدی کی انتہا پر ۹۹۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، اس وقت یمن روایت واسناد حدیث کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا تھا، اور وہاں محدث یمن طاہر بن حسین بن عبد الرحمن الاہدل مسند آرائے درس تھے، اور اسی سال ۹۹۸ھ میں انھوں نے وفات پائی[۲]۔

اس عہد میں ہندوستان میں فضلائے ایران کی آمد شروع ہوگئی تھی، جو علامہ جلال الدین دوانی ملا عماد ابن محمود طارمی، اور میر غیاث الدین منصور کے فیض یافتہ تھے، ہمایوں کے زمانہ میں مولانا زین الدین محمود کمان گر بہدائی، تلمیذ مولانا جامی ومولانا عبد الغفور لاری، ہندوستان آئے، اور بادشاہ نے ان کی بڑی تعظیم وتکریم کی، اکبر کے زمانہ میں حکیم ابو الفتح گیلانی، حکیم ہمایوں

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "النور السافر" ص۴۱۲-۴۳۹ [۲] حالات وکمالات کے لئے ملاحظہ ہو علامہ محمد بن علی شوکانی کی کتاب البدر الطالع

(حکیم ہمام) اور نورالدین قراری تینوں فاضل بھائی گیلان سے آئے، اور دربار میں رسوخ پیدا کیا، کچھ عرصہ کے بعد ملا محمد یزدی ولایت (ایران) سے آئے، اور امیر فتح اللہ شیرازی بھی بیجاپور ٹھہرتے ہوئے دربار اکبری کی رونق وزینت بنے، وہ میر غیاث الدین منصور کے شاگرد تھے، ۹۹۳ھ میں صدر ہوئے، ہندوستان میں علمائے ایران کی تصنیفات وہی لائے، انھوں نے یہاں کے نصاب اور طریقۂ درس پر ایسا گہرا اثر ڈالا جس نے بالآخر درس نظامی کی ترقی یافتہ شکل اختیار کی، اور جو ہندوستان کے علمی ودرسی حلقوں پر ابھی تک غالب اور حاوی ہے[۱]۔

اس عہد میں بالخصوص جنوبی ہند میں نیشاپور، استرآباد، جرجان، مازندران، اور گیلان، کے بہت سے فضلاء اور ادباء کے نام ملتے ہیں، جو درباروں میں رسوخ رکھتے تھے[۲]۔

افغانستان بھی اپنی سپہ گری اور سیف زنی کے ساتھ علم ودرس کی دولت سے محروم نہ تھا، قاضی محمد اسلم ہروی جن کا انتقال ہندوستان میں ۱۰۶۱ھ میں ہوا، ہرات میں پیدا ہوئے، اور افغانستان ہی میں مولانا محمد فاضل بدخشانی سے تحصیل علم کی، مولانا محمد صادق حلوائی بھی اس وقت افغانستان کے بڑے علماء میں تھے، ہرات ایران کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے علوم حکمت کا مرکز تھا، اور اس کے فرزندوں میں قاضی محمد اسلم ہروی اور ان کے نامور وباکمال فرزند مولانا محمد زاہد نے (جو میر زاہد کے نام سے ہندوستان کے درسی حلقہ میں معروف ومشہور ہیں) علوم حکمیہ میں بڑا نام پیدا کیا، عرصہ تک مؤخرالذکر کے تین حواشی جو "زواہد ثلاثہ" کے نام سے مشہور ہیں، اساتذہ وعلماء کے مرکز توجہ اور معیار فضیلت بنے رہے۔

۱؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" یا اس کا ترجمہ "اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں" اور مضمون "ہندوستان کا نصاب درس" از مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ۔ ۲؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۴۔

علمائے ہند کے تلمذ واستفادہ کا یہ تعلق صرف ایرانی فضلاء اور ولایت کے اساتذۂ فن ہی سے جاری نہیں تھا فضلاء ومحدثین مصر وحجاز اور یمن سے بھی قائم تھا، شیخ راجح بن داؤد گجراتی (م ۹۰۴ھ) نے علامہ سخاوی سے حدیث میں استفادہ کیا تھا، علامہ سخاوی نے ان کو شیخ العلاء البخاری الحنفی کی ابن عربی کے بارے میں رائے اور مسلک بتایا، تاکہ وہ ہندوستان کے علماء ومشائخ کو اس سے باخبر کریں، اور شیخ اکبر کے بارے میں ان کی جو خوش فہمی ہے، وہ زائل ہو[۱]، علامہ سخاوی نے "الضوء اللامع" میں اپنے ان ہندی شاگرد کا تذکرہ لکھا ہے، اور ان کے علمی کمالات کا اعتراف کیا ہے، اپنے زمانہ کے امام فن حدیث شیخ علی بن حسام الدین المتقی صاحب "کنز العمال" جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "سیوطی کا احسان ساری دنیا پر ہے، اور علی متقی کا احسان خود سیوطی پر ہے" علامہ ابوالحسن الشافعی البکری مدرس حرم مکی، اور علامہ شہاب الدین احمد بن حجر مکی مفتی ومحدث مکہ کے تلمیذ رشید تھے۔

سطور بالا سے اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہندوستان سمندر اور فلک بوس پہاڑوں سے گھرے ہوئے ہونے کے باوجود (جس میں باہر کی دنیا سے رابطہ کا ذریعہ بلوچستان کا درۂ بولان اور شمالی مغربی سرحد کا درۂ خیبر تھا) علمی اور ثقافتی طور پر باہر کی دنیا سے کلی طور پر کٹا ہوا نہیں تھا، اس کے استفادہ وافادہ کا سلسلہ جاری تھا، اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کا استفادہ افادہ سے، اور "درآمد" کا عمل "برآمد" کے عمل سے بڑھا ہوا تھا، اور ایسا ہونا قدرتی امر بھی تھا، کہ ہندوستان میں دین اور علم دونوں ترکستان وایران کے راستہ ہی سے پہونچے تھے۔

۱؎ "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

ذہنی بے چینی اور اعتقادی انتشارِ خیال

لیکن دسویں صدی کا سیاسی، دینی و علمی جائزہ نامکمل رہے گا، اگر اس ذہنی بے چینی اور اعتقادی انتشارِ خیال کا ذکر نہ کیا جائے، جو اس دور میں ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں کہیں کہیں پایا جاتا تھا، تاکہ اس ص ی کی صحیح صورت حال سامنے آجائے، اور یہ غلط فہمی نہ ہو کہ زندگی کے دریا میں جو ہزاروں میل کی مسافت میں بہہ رہا تھا، کامل سکون تھا، جس میں دین کی تعلیم و اشاعت، اور اخلاق و روحانیت کی تربیت و ترقی کی کشتی پورے اطمینان کے ساتھ چلائی جا سکتی تھی، اور اس کو کسی تلاطم یا بھنور کا کوئی اندیشہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو "احیاء و تجدیدِ دین" کے بجائے اس دور کے لئے "تعلیم و تربیت" اور "نشر و اشاعت" کا عنوان زیادہ موزوں تھا، ہندوستان کے اسلام کے دینی و ثقافتی مرکز (حجاز مقدس اور مصر و شام و عراق) سے دور ہونے، اسلام کے یہاں ترکستان و ایران کا چکر کاٹ کر پہونچنے، عربی زبان کے رائج نہ ہونے، اور خاص طور پر علم حدیث کی (جس سے دین کی صحیح روح، سنت و بدعت کا فرق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی ضرورت کا احساس، اور صحیح دینی احتساب کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے) عدم اشاعت، حج اور طلب علم کے لئے باہر کے ملکوں کے سفر کی دشواریوں، اور اسلام کے حلقہ بگوشوں کا غیر مسلم اکثریت سے گھرے رہنے نے (جو اپنے مذہب میں سخت راسخ الاعتقاد، غیر اسلامی رسم و رواج کی سختی سے پابند اور حد درجہ توہم پرست تھی) ہندوستان کے مسلمانوں کو انتشار پسند دعوتوں، گمراہ کن فرقوں اور طالع آزما مذہبی پیشہ وروں کی آسان چراگاہ بنا دیا تھا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی تشیع کی وہ غالی اور جارحانہ شکل تھی، جو ایرانیوں کے اثر سے

جنوبی ہند کے بعض مقامات اور کشمیر میں پیدا ہوئی، دسویں صدی کے وسط میں احمد نگر کے والیٔ سلطنت برہان نظام شاہ نے شیخ طاہر بن رضی اسماعیلی قزوینی کے اثر سے (جو ایران سے شاہ اسماعیل صفوی کے خوف سے بھاگ کر احمد نگر آئے تھے) تشیع قبول کیا، اور اس میں بڑا مبالغہ کیا، یہاں تک کہ مساجد، خانقاہوں، بازاروں اور سڑکوں پر خلفاءِ ثلاثہ پر علی الاعلان تبرا کرنے کا حکم دیا، اس خدمت کے انجام دینے والوں کے بڑے بڑے مشاہرے مقرر کئے، اہل سنت میں سے بہت سے لوگوں کو قتل اور گرفتار کیا[1]، دوسری طرف میر شمس الدین عراقی کی کوشش سے کشمیر میں تشیع پھیلا، انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی، کہتے ہیں کہ چونتیس ۳۴ ہزار ہندو شیعہ ہوگئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک جدید مذہب بھی ایجاد کیا جس کا نام نور بخشی تھا، اور فقہ میں ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کے مسائل نہ تو اہل سنت کے مسائل سے اتفاق رکھتے ہیں، نہ فرقۂ امامیہ کے مسائل کے مطابق ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد پڑی جس کا اعتقاد تھا کہ سید محمد نور بخش مہدی موعود تھے[2]۔

۹۵۰ھ میں فوجی مدد اور سلطنت ایران کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہمایوں عازم ایران ہوا، اس وقت ایران میں شاہ طہماسپ تخت نشین تھا، شاہ ایران نے ہمایوں سے مذہب تشیع قبول کرنے کی فرمائش کی، ہمایوں نے کہا کہ ایک پرچہ پر تمام معتقدات لکھ دیئے جائیں، بادشاہ نے بطریق نقل اس کو پڑھ دیا[3]، بادشاہ کے تبدیلی مذہب کی اگرچہ کوئی مستند شہادت نہیں ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ایران کے قیام، شہنشاہ ایران کی فیاضانہ میزبانی و مسافر نوازی اور فراخدلانہ فوجی مدد سے ممنونیت و تشکر کے نتیجہ میں اس کے دل

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ فرشتہ" از محمد قاسم بیجاپوری (مصنف فرقۂ اثنا عشریہ سے تعلق رکھتا تھا)

[2] ملاحظہ ہو "تاریخ فرشتہ" از محمد قاسم بیجاپوری۔ [3] منتخب التواریخ حصۂ اول ص ۴۴۵

میں مذہب اثنا عشری کے لئے وہ نرم گوشہ ضرور پیدا ہو گیا ہوگا، جو اس کے راسخ الاعتقاد تیموری اسلاف کے دل میں (جو راسخ الاعتقاد سنی حنفی تھے، اور ان میں سے بعض کا بعض شائخ نقشبندیہ سے ارادت کا تعلق بھی تھا) پایا نہیں جاتا تھا، ہمایوں کی مدد کے لئے ایران سے امرائے قزلباش آئے تھے، ہمایوں خود نیک دل، شائستہ و مہذب انسان تھا، ہر وقت باوضو رہتا تھا، اللہ رسول کا نام بغیر طہارت کے نہیں لیتا تھا، کتب خانہ کے زینے سے جہاں اذان سن کر بیٹھ گیا تھا، پھسل کر گرا، اور ۱۵ ربیع الاول سنہ ۹۶۳ھ کو وفات پائی۔

اس کے امرائے خاص، اور ارکان سلطنت میں بیرم خانخاناں بڑی خوبیوں اور کمالات کا امیر و سردار تھا، رقیق القلب، جمعہ و جماعت کا پابند، علماء و مشائخ کا قدر دان تھا، لیکن تفضیلی تھا، اس کا مشہور شعر ہے ؎

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر، افسر او
اگر غلامِ علی نیست، خاک بر سر او

میر شریف آملی علوم حکمت میں مہارت تامہ رکھتا تھا، وہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا، اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی، پہلے سنہ ۹۹۳ھ میں کابل، پھر سنہ ۹۹۹ھ میں بنگالہ کی صدارت کے عہدہ پر سرفراز کیا، اور اس کو اجمیر اور موہان میں جاگیر دی، "مآثر الامراء" کے مصنف خوافی خاں کے بیان کے مطابق وہ ملحدانہ خیالات رکھتا تھا، تصوف کو فلسفہ سے مخلوط کیا اور عینیت کا قائل تھا۔

ہندوستان میں دو تحریکیں سخت انتشار انگیز اور اسلامیت کے لئے خطرناک اور باعث تخریب تھیں، ان میں سے ایک ذکری عقیدہ اور فرقہ تھا جس کی بنیاد نبوت محمدی کے الفِ اول پر اختتام، اور الف ثانی سے ایک نئی نبوت اور ہدایت کے آغاز پر ہے،

یہ تحریک بلوچستان میں پھلی پھولی، لیکن وہ جس شخص کو پیغمبر مانتی ہے اس کے بقول اس کا ظہور سنہ ۹۷۷ھ میں بمقام اٹک ہوا، اس فرقہ کی کتاب "ذکری کون ہیں؟" کا مصنف بانی فرقۂ ذکریہ ملا محمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"آپ شب دوشنبہ بوقت بام (صبح) قطب شہر سے بطرف زمین بصورت انسانی ولباس فقیری اٹک کے پہاڑی علاقہ میں ایک اونچی پہاڑی پر ۹۷۷ھ میں قدم مبارک رکھ کر آشکار ہوئے"[1]

ذکری ملا محمد موصوف کو خاتم النبیین اور افضل الرسل، اور نور اولین و آخرین مانتے ہیں، موسیٰ نامہ قلمی میں ہے:۔

"حق تعالیٰ گفت اے موسیٰ بعد از مہدی پیغمبر دیگر نیا فریدم نور اولین و آخرین ہمیں است کہ پیدا خواہم کرد"[2]

اس فرقہ کی کتابوں "معراج نامہ قلمی" "ثنائے مہدی" (مطبوعہ) "سفر نامہ مہدی" "ذکر الٰہی" وغیرہ میں ایسی صریح عبارتیں آئی ہیں، جن سے ملا محمد موصوف کی تنزیہ و تقدیس اور ان کے بارے میں ایسے مبالغہ آمیز عقائد کا اظہار ہوتا ہے، جن سے ان کی تمام انبیاء پر ترجیح اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فضیلت، اور جرأت افترا و تخلیق، اور دجل و تلبیس کے عجیب نمونے ظاہر ہوتے ہیں، انھوں نے اپنا ایک مستقل کلمہ بھی وضع کیا تھا، جو "لا الٰہ الا اللہ نور پاک محمد مہدی رسول اللہ" تھا، نماز پڑھنے والوں کی تکفیر و تضحیک کرتے تھے[3] اسی طرح روزہ، حج، اور زکوٰۃ کے وہ منکر ہیں، بجائے حج بیت اللہ کے حج کوہ مراد کو ضروری سمجھتے تھے[4] تاریخ خوانین بلوچ میں ہے کہ بلوچستان کے کچھ

---

[1] "ذکری کون ہیں؟" ص۱۳ [2] ایضاً ص۱۱ [3] اعتقاد نامہ قلمی [4] ملاحظہ ہو ذکری مصنفین کی تصنیفات "ذکر توحید" (مطبوعہ) "میں ذکری ہوں" "تفسیر ذکر اللہ" (مطبوعہ) اور تصنیفات مذکورۃ الصدر نیز ملاحظہ ہو بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر جس میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ ان کے اور اہل سنت کے عقائد میں بنیادی اختلاف ہے (ص۱۱۶ مطبوعہ)

علاقوں میں ذکری جیسا خلاف اسلام مذہب جاری وساری تھا، اور وہ لوگ مسلمانوں کو نمازی کہہ کر قابل گردن زدنی گردانتے تھے، میر نصیر خاں اعظم نے ایک طرف شرع محمدی کا نفاذ اور اجرا فرمایا اور دوسری طرف ذکریوں کی اسلام دشمنی اور شرک پروری کے خلاف خون آشام سلسلۂ جہاد جاری رکھا تا آنکہ بڑے بڑے خون ریز اور فیصلہ کن معرکوں کے بعد اس بدعت کی مکمل طور پر بیخ کنی کی گئی[1] الخ

ہندوستان میں دوسرا مشتبہ فرقہ فرقۂ روشنائیہ تھا، افغانوں کی زوال پذیر طاقت کو سہارا دینے اور مغلوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کے لئے فرقۂ روشنائیہ نے جو اہم کردار ادا کیا[2]، اس نے اس عہد کے مصنفین کے بیانات کو محل غور اور محتاج تحقیق بنا دیا ہے کہ ان میں سیاسی اغراض کہاں تک کارفرما ہیں، اور تاریخی حقیقت کتنی ہے؟ اس فرقہ کے معتقدوں اور حامیوں اور اس کے مخالفین کے بیانات میں اتنا تضاد ہے کہ ایک بانی فرقہ کو "پیر روشن" کے نام سے یاد کرتا ہے، اور دوسرا "پیر تاریک" کہتا ہے، اس فرقہ کے بانی بایزید انصاری تھے، جو پیر روشاں (یا روشن) بھی کہلاتے ہیں، ان کے والد کا نام عبداللہ تھا، جالندھر میں ۹۳۱ھ میں (بابر کی سلطنت سے ایک سال قبل) پیدا ہوئے، ان کا بچپن اور عنفوان شباب خاندانی کشمکش اور بزرگوں کی بے توجہی میں گزرا، اور اس کی وجہ سے تعلیم ادھوری رہ گئی، کسی سفر کے

---

[1] تاریخ بلوچ، اس مضمون میں رسالہ "الحق" (اکوڑہ خٹک) کے ۱۹۷۹ء کے شمارہ کے ایک مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے جو مولانا عبدالحق صاحب صدر مدرس دارالعلوم تربت بلوچستان کے قلم سے ہے، نیز ملاحظہ ہو ذکری مذہب کا تفصیلی جائزہ "الحق" جنوری ۱۹۸۰ء

[2] اس عہد میں تصوف کا جو اثر اور اس کی غیر معمولی مقبولیت تھی اس کو دیکھتے ہوئے بعض دور اندیشوں اور حوصلہ مندوں کا یہ خیال مستبعد نہیں قرار دیا جاسکتا کہ اس کو پٹھانوں کی شیرازہ بندی کا ذریعہ بنا کر اور انھیں ایک مذہبی تحریک کے پرچم تلے جمع کر کے مغلیہ حکومت کے خلاف آمادۂ جنگ کیا جاسکتا ہے اور اس سے افغانوں کے زائل شدہ اقتدار کو واپس لایا جاسکتا ہے۔

دوران (بعض روایات کے مطابق) ان کی ملاقات سلیمان اسماعیلی سے ہوئی، جوگیوں کی صحبت کا حاصل ہونا بھی بیان کیا جاتا ہے، ان کے تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق انھیں خواب نظر آنے لگے اور عالم غیب سے آوازیں سنائی دینے لگیں، وہ ذکر خفی میں منہمک ہو گئے، اور کچھ عرصہ کے بعد اسم اعظم کے ورد میں ان کو استغراق ہوا جب وہ اکتالیسویں برس کو پہونچے تو انھیں ہاتف نے ندا دی کہ اب انھیں طہارت شرعی کو ترک کر دینا چاہئے، اور مسلمانوں کی نماز کی جگہ انبیاء کی نماز پڑھنا چاہئیے[1]، اس کے بعد وہ سب کو مشرک و منافق سمجھنے لگے، اور چلہ کشی شروع کر دی، اس کے بعد انھیں علانیہ طور پر تبلیغ کرنے کا حکم ملا، دعوائے مہدویت اور الہام ربانی کا بھی ان پر الزام ہے[2]، ان کے مریدوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہونے لگی، انھوں نے بعض کو اپنا خلیفہ مقرر کیا، تاکہ وہ تبلیغ کے کام کو اور زیادہ وسیع کریں۔

لیکن ان کی تصنیف "صراط التوحید" میں ان کی جو تعلیمات آئی ہیں، وہ تصوف کی مائل بافراط تعلیمات اور غالی خود شناسی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، جو کسی شیخ کامل اور کتاب وسنت کے علم راسخ کے بغیر اکثر بطور خود ریاضت کرنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے، اور ان کے بعض اصول وعقائد بیان کئے گئے ہیں، وہ غالباً ان کے ضوابط جنگ ہیں، جو اس زمانہ سے متعلق ہیں، جب وہ مغلوں اور اپنے مخالف افغان قبائل سے برسرپیکار تھے۔

انھوں نے پشاور کے علاقہ میں متعدد افغانی قبائل کو اپنا معتقد و مرید بنا لیا، ہندیوں میں اپنا تبلیغی کام شروع کیا، سندھیوں اور بلوچیوں میں بھی ان کا اثر پھیلنا شروع ہوا، پیروں

---

[1] لیکن خود شیخ بایزید نے اپنی کتاب "مقصود المؤمنین" میں لکھا ہے کہ "شریعت درخت کی چھال کی مانند ہے، اور درخت کی بقا چھال کے بغیر ناممکن ہے" ص۴۴، نسخہ قلمی کتب خانہ جامعہ پنجاب۔ [2] شیخ بایزید نے خود اس بات کی تردید کی ہے کہ وہ مہدی ہیں، جیسا کہ اس مباحثہ کی سرگذشت میں موجود ہے، جو ان کے اور کابل کے قاضی خاں کے درمیان ہوا تھا، نسخہ قلمی جامعہ پنجاب۔

اور علماء کی انتہائی مخالفت کے باوجود ان کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی، شیخ بایزید نے اپنے داعی اور مبلغ ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں، امراء و علماء کے پاس بھیجے، ان میں سے ایک شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھی آیا، ان کی زندگی کے آخری ڈھائی سال مغلوں سے جنگ میں گزرے اور ۹۸۰ھ میں کالاپانی کے مقام پران کا انتقال ہوگیا، اور ہشت نگر میں دفن ہوئے ان کی تصنیفات میں سے تین کتابیں (خیرالبیان، مقصود المؤمنین، صراط التوحید) موجود ہیں، جس میں انھوں نے اپنے بنا کردہ فرقہ کے اصول و عقائد کو بیان کیا ہے، ان میں سے "خیرالبیان" اور "مقصود المؤمنین" ان کے ماننے والوں کے نزدیک نیم مقدس کتابوں کا حکم رکھتی تھیں ان کے سب سے بڑے مخالف اخوند درویزہ تھے، جو سید علی ترمذی المعروف بہ پیر بابا (م ۹۹۱ھ) کے مرید تھے، انھوں نے ان کی تردید میں کتاب "مخزن الاسلام" لکھی، "حال نامہ پیر دستگیر" (فارسی) شیخ بایزید کی خودنوشت سوانح حیات ہے، اس کو علی محمد مخلص نے اضافوں کے ساتھ مرتب کیا۔

اندرونی اور بیرونی جنگوں کی وجہ سے خستہ حال ہوکر نیز علماء کی شدید مخالفت کے باعث اور اس لئے بھی کہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں تتر بتر ہوگئے، اس فرقہ کے افراد کم ہوتے ہوتے بالآخر تقریباً ناپید ہوگئے۔[1]

"داستان ترکتازان ہند" کا مصنف مرزا نصراللہ خاں فدائی دولت یار جنگ اس فرقہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"روشنائی اس فرقہ کا نام ہے، جس کی بایزید نامی ایک شخص نے جو اہل ہند میں سے تھا بنیاد ڈالی، اس نے افغانوں میں جاکر پیغمبری کا دعویٰ کیا، اور اپنے کو پیغمبر روشنائی کہلایا، اور ان کو اپنا پیرو

۱ استفادہ از مقالہ پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم مشمولہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۴۔

بنایا، انھوں نے آسمانی صحیفوں کو جواب دیا اور خدا کی عبادت ترک کی، اس کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحدۃ الوجود کا قائل تھا[1] اور اس کا عقیدہ تھا کہ اس واجب الوجود کے سوا کسی کا وجود نہیں پیغمبر عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کرتا تھا، وہ لوگوں کو بشارت سناتا تھا کہ وہ دن قریب ہے کہ پورا کرۂ ارض ان کے زیر تصرف ہوگا۔

حالنامہ نوشتۂ بایزید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو الہام ہوتا تھا، اور جبریل ان پر نزول کرتے تھے اللہ نے ان کو نبوت سے سرفراز کیا، وہ خود اپنے کو نبی سمجھتے تھے، نماز پڑھتے تھے لیکن قبلہ کا تعین ضروری نہیں سمجھتے تھے "فأینما تولوا فثمّ وجہ اللّٰہ" سے استدلال کرتے تھے پانی سے غسل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، اپنے مخالفین کا قتل جائز سمجھتے تھے"[2]

مصنف نے اس سلسلہ میں ان کے بعض ایسے اقوال بھی نقل کئے ہیں، جو عارفانہ اور متصوفانہ ہیں، اور جن میں کوئی قدح نہیں کی جاسکتی، لیکن اسی کے ساتھ خلاف اسلام خیالات بھی ہیں۔

"ان کے یہاں خودشناسی و خداشناسی سب سے اہم چیز تھی، اگر ہندو کو خود شناس دیکھتے تو مسلمان پر ترجیح دیتے، مسلمانوں سے جزیہ لیتے، خمس بیت المال میں داخل کرتے اور اہل حاجت پر تقسیم کرتے، ان کے سب فرزند فسق و فجور سے مجتنب، اور ظلم و ستم سے بہت دور تھے، عربی، فارسی، ہندی، اور پشتو میں ان کی متعدد تصانیف ہیں ان کی ایک کتاب "خیرالبیان" ہے، جو چار زبانوں میں ہے اور وہ حق تعالیٰ کا براہ راست ان کو خطاب اور ان کے عقیدہ میں آسمانی کتاب ہے"[3]

۱ اس عہد میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی، صوفیا و مشائخ کی اکثریت (کم سے کم ہندوستان میں) اس عقیدہ میں غلو رکھتی تھی۔ (مصنف)

۲ ص ۳۰۴-۳۰۵

۳ منقول از حالنامہ بایزید در دبستان مذاہب ملا محسن خانی ص ۳۰۶-۳۰۹۔

معاصر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیر بایزید نے افغانوں کی ایک بڑی طاقت مہیا کرلی تھی، اور کوہ سلیمان کو مستقر بنا کر درۂ خیبر پر بھی قبضہ کرلیا تھا، اور پاس پڑوس پر بھی حملہ کرنے لگے تھے، اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے اکبر نے ایک فوج بھیجی لیکن وہ اس کا استیصال نہ کرسکی بایزید کے انتقال کے بعد اس کے فرزند اور جانشین سلطنت مغلیہ کے لئے خطرہ بنے رہے، راجہ مان سنگھ، بیربل اور زین خاں بھی ان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوئے، اور بیربل تو ایک مقابلہ میں مارا گیا، مان سنگھ ۹۹۵ھ کے حملہ میں بھی روشنائیوں کے مقابلہ میں ناکام رہا، یہ فتنہ شاہجہاں کے عہد ۱۰۵۰ھ میں ختم ہوا۔[1]

مہدویت

اس عہد کی سب سے زلزلہ انگیز تحریک، تحریک مہدویت تھی، جس کے بانی سید محمد (ابن یوسف) جونپوری (ولادت ۸۴۷ھ) کی وفات اگرچہ دسویں صدی کی ابتدا (۹۱۰ھ) میں ہوگئی تھی لیکن اس کے اثرات دسویں صدی کے اخیر تک باقی رہے، غیر جانب دارانہ تاریخی مطالعہ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو تین صدیوں کے اندر کوئی دینی دعوت اور تحریک اس تحتی براعظم (بشمول افغانستان) میں اتنے وسیع پیمانہ، اور اتنے گہرے اور طاقتور طریقہ پر مسلم معاشرہ پر اثر انداز نہیں ہوئی جتنی کہ یہ دعوت و تحریک، موافقت و مخالفت میں معاصر اور بعد کے مؤرخین و مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطالعہ سے ہم ان نتائج تک پہونچتے ہیں :-

(۱) سید محمد جونپوری باطنی اور خلقی طور پر ان عالی استعداد اور قوی الباطن لوگوں

[1] ملخص از داستان ترکتازان ہند۔

میں تھے، جو زمانۂ دراز کے بعد پیدا ہوتے ہیں، وہ عنفوان شباب ہی میں بڑے جری و شجاع، اپنے ماحول اور دَور کے حالات سے غیر مطمئن، بے محابا امر بالمعروف نہی عن المنکر اور منکرات شرعی پر زجر و توبیخ کرنے والے تھے، اور اسی وجہ سے اسی زمانہ میں ان کو اسد العلماء کا خطاب دیا گیا تھا سلوک کی تعلیم شیخ دانیالؒ[1] سے حاصل کی، اور شدید ریاضت و مجاہدہ کیا، پہاڑوں اور وادیوں میں عرصہ تک گوشہ نشینی اختیار کی جس کا اکثر نتیجہ (بالخصوص جب شیخ کامل کی نگرانی اور رہنمائی حاصل نہ ہو) ایسے واردات و اشارات ہوتے ہیں، جن سے لغزش کا اندیشہ اور بعض اوقات غلط الیقین کا حصول ہوتا ہے، اور ایسا شخص جو مقام تحقیق و رسوخ کو نہ پہونچا ہو الفاظ کو غلط محل پر چسپاں اور اشارات غیبی کو غلط معنی میں سمجھ سکتا ہے، چنانچہ انھوں نے اسی دوران کسی سفر میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اس کے بعد بھی متعدد بار مختلف مقامات پر اپنے "مہدی موعود" ہونے کا اعلان کیا، اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی۔

(۲) وہ کثرتِ ریاضت، قوت باطنی اور جذبۂ امر بالمعروف کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے صاحبِ تاثیر تھے، ان کی شخصیت و صحبت، ان کی گفتگو اور بیان سامعین و حاضرین پر جادو کا اثر رکھتا تھا، اور سلاطین و امراء سے لے کر عوام و خواص تک سب پر بے خودی اور خود فراموشی طاری ہوجاتی تھی، اور ان کے لئے بڑے سے بڑے منصبوں اور جاہ و حشمت کو خیرباد کہہ کے، ترک دنیا اور ترک وطن کرکے ان کے ہمرکاب ہوجانا، اور اپنے کو ان کے حوالہ کردنیا آسان ہوجاتا تھا، دارالحکومت مانڈو میں یہی غیاث الدین شاہ خلجی کے ساتھ پیش آیا، اور یہی جانپانیر گجرات میں محمود شاہ گجراتی پر اثر ہوا، یہی احمد نگر، احمد آباد، بیدر

[1] افسوس ہے کہ کتب تراجم و تذکرہ میں ان کے حالات نہیں ملتے، "مآثر الامراء" تالیف نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ دانیال راجی حامد شاہ مانکپوری کے خلیفہ تھے (ج ا ص ۱۲۴) راجی حامد شاہ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے بلند مرتبہ و نامور مشائخ میں ہوئے ہیں۔

اور گلبرگہ میں دیکھنے میں آیا، ایک خلقت کی خلقت نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، اور ہزاروں آدمی ان کے قافلہ میں شامل ہوگئے، سندھ کے علاقہ میں بھی ایک شہر آشوب کا منظر نظر آیا، اور لوگوں کو تھامنا مشکل ہوگیا، قندھار میں بھی ان کے بیان نے قیامت برپا کردی، اور حاکم قندھار مرزا شاہ بیگ کا ان کی طرف میلان ہوگیا۔

(۳) ان کی زندگی ترک وتجرید، زہد واستغناء، قطع ماسوی اللہ کی زندگی تھی، اور سفر وحضر میں ان کے "دائرہ" میں اسی زہد وایثار اور ذکر وعبادت کی فضا نظر آتی تھی، کھانا اور ہر چیز برابر برابر کسی کی خصوصیت کا لحاظ کئے بغیر تقسیم ہوتی تھی، اور اس میں خود ان کی اور ان کے گھر کے افراد کی رعایت نہیں ہوتی تھی، اس فضا سے کوئی نووارد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

(۴) اس دعوت نے متعدد ایسے بے لوث، سرفروش وخود فراموش داعی پیدا کردیئے تھے، جنھوں نے "کلمۃ حق عند سلطان جائر" کا فریضہ بڑی شجاعت اور قوت کے ساتھ ادا کیا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلہ میں سخت اذیتیں برداشت کیں، اور اس راہ میں ہنسی خوشی جان دی، انسان ان کے حالات پڑھ کر متاثر ہوئے اور سید محمد جونپوری کی تربیت اور صحبت کی تاثیر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مثال کے طور پر شیخ علاء بن حسن البیانوی (شیخ علائی) (م ۹۵۷ھ) کے حالات ملاحظہ ہوں، جنھوں نے سلطان سلیم شاہ ابن شیر شاہ سوری کے دربار میں دعوت وتذکیر کا فرض انجام دیا، اور آداب شاہی اور کورنش کے بجائے سلام مسنون پر اکتفا کیا، اور دوسری مرتبہ سفر کی خستگی اور طاعون کی بیماری کی حالت میں کوڑے کھائے، اور اس سے جانبر نہ ہونے پر ان کا جسم ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دیا گیا، اور لشکر میں اس کو پھرایا گیا۔[1]

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ترجمہ شیخ علاء بن حسن البیانوی "نزہۃ الخواطر" جلد ۴، یا منتخب التواریخ از ملا عبدالقادر بدایونی
(باقی ص۵۵ پر)

(۵) ان کی دعوت کے پانچ ارکان تھے (۱) ترک دنیا (۲) عزلت عن الخلق (۳) ہجرت عن الوطن (۴) صحبت صدیقین (۵) دوام ذکر (حفظ انفاس کے طریقہ پر) وہ مشاہدہ الٰہی کو (خواہ وہ بچشم سر ہو یا بطریق قلب، بیداری میں ہو یا خواب میں) ضروری اور شرط ایمان قرار دیتے تھے۔

(۶) حالت سُکر میں، یا مفہوم ومراد صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر ان سے اپنی ذات کے متعلق متعدد بار اور صریح طریقہ پر ایسے اقوال اور دعاوی صادر ہوئے[1] جن کی تاویل وتوجیہ مشکل ہے، اور جنھوں نے ان کے متبعین کو (ابتدا میں ان کی نیت کتنی ہی صحیح اور ان کا جذبۂ دینی کتنا ہی قابل قدر ہو) آسانی کے ساتھ ایک مخالف جمہور، اور مخالف اہل سنت فرقہ کی شکل دے دی، جس نے ان اقوال کا سہارا لیا، اور ان پر اپنے عقیدہ کی بنیاد رکھی، بعد کے آنے والوں اور غالی معتقدین نے (جیسا کہ قاعدہ ہے) ان میں اور اضافہ کیا، اور ان کی تقدیس وتعظیم میں اتنا غلو سے کام لیا کہ ان کو انبیاء کا ہمسر اور بعض سے افضل وبرتر بنادیا، اور بعض بعض انتہا پسندوں اور غالیوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہمسری ومساوات کے عقیدہ تک پہونچا دیا (اگرچہ سید محمد ان کے نزدیک بھی آپ کے پیرو اور دین محمدی کے تابع تھے) اور بعض نے یہاں تک غلو کیا، کہ "اگر کتاب وسنت ان کے کسی قول وفعل کے مخالف ہوں تو کتاب وسنت کا اعتبار نہیں" اسی طرح سے اس بارے میں بھی بہت غلو کیا گیا کہ جو مسلمان انوار الٰہی کا مشاہدہ اپنی آنکھ یا دل سے سوتے یا جاگتے

(باقی ص۵۴ کا) مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں شیخ علائی کی شہادت کی دل دوز داستان مفصل وموثر طریقہ پر بیان کی ہے (ملاحظہ ہو "تذکرہ" ص۵۳ تا ۶۱)

[1] اور ایسے اقوال بہت سے غالی صوفیوں، اور شدید ریاضت کرنے والے عابدوں سے منقول ہیں۔

کبھی نہ کرے وہ مومن نہیں ہے، عام مسلمانوں اور اس فرقے کے درمیان یہ خلیج مرورِ زمانہ سے وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ مہدوی ایک الگ فرقہ بن کر اہل سنت والجماعت سے کٹ گئے، اور وہ مقاصد فوت ہو گئے جن کے لئے یہ تحریک شروع ہوئی تھی، اور جو غالباً اس تحریک کے بانی کے پیش نظر تھے۔

دسویں صدی کے وسط تک اس جماعت کے اثرات ہندوستان اور افغانستان پر قائم رہے، اور دکن میں اس کے پیروؤں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں، دسویں صدی کے آخر میں مہدویوں کی طاقت اور تعداد میں جو اضافہ ہو چکا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسماعیل نظام شاہ بن برہان نظام شاہ ثانی کے زمانۂ حکومت (۹۹۶ - ۹۹۸ھ) میں جمال خاں مہدوی نے جو منصب داران صدہ میں سے تھا، احمد نگر میں مہمات شاہی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اسماعیل نظام شاہ کو بھی (جو خورد سال تھا) اپنے مذہب میں لے آیا، تھوڑے زمانہ میں ہندوستان کے اطراف وجوانب سے طائفہ مہدویہ جمع ہو گیا، جمال خاں کے گرد و پیش دس ہزار کے قریب مہدوی جمع ہو گئے، اور اس نے احمد نگر کی سلطنت پر پورا تسلط حاصل کر لیا، جب برہان نظام شاہ جو باہر چلا گیا تھا، احمد نگر ۹۹۶ھ میں واپس ہوا تو اس نے مذہب مہدویہ کو جس کا رواج ہو گیا تھا، خارج کیا، اور سابق کی طرح مذہب اثنا عشری نے رواج پایا۔[1]

دسویں صدی کے اخیر میں مہدویت کی تحریک میں نمایاں ضعف پیدا ہوا، اس دعوت اور سید محمد جونپوری کے دعاوی اور زیادہ تر ان کے غالی معتقدین کے تشدد سے عقائد میں ایک تزلزل اور مسلم معاشرہ میں ایک انتشار اور اضطراب پیدا ہو رہا تھا، اس سے

۱۔ ملخص از تاریخ ہندوستان جلد چہارم از مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی۔

اس عہد کے علماء راسخین جو کتاب وسنت پر گہری نظر اور علوم دینیہ میں رسوخ تام رکھتے تھے، پریشان اور فکر مند تھے اور وہ اس کو ایک بڑی ضلالت اور فتنہ کا پیش خیمہ سمجھنے لگے تھے، چنانچہ اس عہد کے سب سے بڑے عالم حدیث وسنت علامہ محمد طاہر پٹنی (۹۱۳ھ - ۹۸۶ھ) مصنف "مجمع بحار الانوار" نے اس کی تردید اور انسداد کا بیڑا اٹھایا، اور یہ عہد کیا کہ جب تک اس بدعت کا (جس کے اثر میں پورا گجرات آگیا تھا) خاتمہ نہیں ہو جائے گا، وہ اس وقت تک پگڑی نہیں باندھیں گے، اکبر نے ۹۸۰ھ میں جب گجرات فتح کیا، اور علامہ محمد طاہر کی ملاقات ہوئی تو اپنے ہاتھ سے ان کے دستار باندھی، اور کہا کہ "دین کی وہ نصرت وحمایت اور اس نئے فرقہ کا استئصال (جس کا آپ نے بیڑا اٹھایا تھا) میرے ذمہ ہے" اس نے مرزا عزیز الدین کو (جو اس کا رضاعی بھائی تھا) گجرات کا حاکم مقرر کیا، اور اس نے اس کام میں ان کی مدد کی، اور اس کے زمانہ میں ان کا زور کم ہو گیا، لیکن جب مرزا عزیز اپنے اس منصب سے سبکدوش ہوا، اور اس کی جگہ پر عبدالرحیم خانخاناں کو گجرات کی عملداری ملی تو مہدویوں کو پھر طاقت حاصل ہو گئی، اور وہ میدان میں آگئے، پھر علامہ محمد طاہر نے پگڑی اتار دی اور دارالحکومت کا قصد کیا، لیکن ان کے پیچھے پیچھے مہدویوں کی ایک جماعت بھی روانہ ہوئی، اور اُجین پہونچتے پہونچتے ان کو شہید کر دیا۔[1]

بے چینی اور انتشار خیال کے اسباب

تاریخ وفلسفۂ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ذہنی بے چینی، ردِ عمل کی جارحانہ تحریکیں اور انتشار خیال پیدا ہونے کے قوی اسباب ومحرکات عام طور پر حسب ذیل ہوا کرتے ہیں۔

۱۔ "نزہۃ الخواطر" جلد ۴

(۱) معاشرہ کے قول و عمل اور عقیدہ و زندگی میں عدم مطابقت اور تضاد، جو بےچین اور ذکی الحس طبیعتوں میں شدید بے اطمینانی پیدا کرتا ہے، اور وہ ایک خاص مرحلہ پر پہونچ کر باغیانہ دعوتوں اور تحریکوں میں پناہ لیتی ہیں، اور اگر وہ خود کوئی تحریک نہیں پیدا کر سکتی ہیں، تو تشکک و ارتیاب کا شکار ہو جاتی ہیں، عام طور پر یہ تحریکیں بہت جلد غلو اور انتہا پسندی اختیار کر لیتی ہیں، اور خود اس فاسد اور کمزور معاشرہ سے زیادہ دینی حیثیت سے گمراہ، سیاسی حیثیت سے خطرناک، اور معاشرہ کے لئے انتشار انگیز بن جاتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں مال و دولت کی فراوانی، عہدوں اور منصبوں کی طمع اور ان میں مسابقت کے جذبہ نے یہ تضاد پیدا کر دیا تھا، اور دنیاداروں اور دنیا پرستوں کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا، جو دینی اور اخلاقی تعلیمات و اصول کو بالائے طاق رکھ کر حصول جاہ و منصب، یا لذت و تمتع کے لئے ہر طرح کی بے عنوانی اور بے راہ روی اختیار کرنے لگا تھا، یہ طبقہ عام طور پر ایسے زمانہ میں پیدا ہوتا ہے، جب وسیع اور مستحکم سلطنتیں قائم ہو جاتی ہیں، اور امن و استقرار کا دور آتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوری خاندان کی حکومت کے آخری دور اور مغلیہ سلطنت کے قیام کے بعد ہندوستانی معاشرہ میں یہی کیفیت نمایاں ہو گئی تھی، اور بہت سے خلاف اسلام اور خلاف شریعت اعمال و رسوم اور آئین جاری ہو گئے تھے[1] سلطنت اموی اور سلطنت عباسی میں بھی یہ طبقہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا تھا، اور اسی کو پہلی صدی ہجری کے آخر کے سب سے بڑے مصلح و داعی حضرت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) "منافقین"

[1] تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان سلیم شاہ (یا اسلام شاہ) کے زمانۂ حکومت میں ہر ولایت (یا سرکار) کے مستقر پر جمعہ کے دن تمام شاہی عہدیدار امراء جمع ہوتے تھے اور ایک بلند شامیانہ میں کرسی پر سلطان سلیم شاہ کی جوتی رکھ کر اس کے روبرو سر جھکاتے تھے، اور مجموعۂ قوانین شاہی پڑھا جاتا تھا (تاریخ ہند سید ہاشمی فرید آبادی جلد سوم ص۴۴)

کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

(۲) سلاطین و حکام کا استبداد، ان کی مطلق العنانی، جبر و تعدی، احکام شریعت سے چشم پوشی اور کھلی ہوئی نفس پرستی، جو دینی حوصلہ مندوں کو انقلابی تحریک اور بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔

(۳) رسمیت اور ظاہر پرستی جب اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے، معاشرہ اخلاقی و ذہنی انحطاط اور علمی حلقے سخت ترین جمود کا شکار ہو جاتے ہیں[1] اور نظام تعلیم بے روح، حقیقت پسندی سے دور اور ذہین طبیعتوں کو تسکین و تسلی دینے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے، تو لوگ ایسی تحریکوں میں اپنے ذہن کی تسکین کا سامان پاتے ہیں، (جو غلط یا صحیح طریقہ پر) اس محدود دائرہ سے باہر قدم نکالتی ہیں، کتاب و سنت کی تعلیم سے غفلت اور حدیث سے ناواقفیت بھی اس کا ایک اہم سبب اور قوی محرک ہے، جس سے ہر دور میں دین کا صحیح مزاج پیدا ہوتا ہے، اور جس سے اس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ امت کے فہم و عمل میں اصل دین

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس عہد کی تصویر کھینچتے ہوئے اور مرض کی صحیح تشخیص کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ:-

"مسلمانوں کی عام سماجی اور اخلاقی حالت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی تھی، افسانۂ شاہان اور تاریخ داؤدی میں جن قصوں کو عجائب روزگار بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ اخلاقی پستی اور اعتقاد کی زبوں حالی کے آئینہ دار ہیں، فقیروں کی عیاشانہ زندگی، طالب علموں کی بے راہ روی، تعویذ گنڈوں میں بے جا اعتقاد، جنوں اور دیووں کے قصے، چراغ سلیمان کی داستانیں، کسی مضبوط معاشرہ یا محکم اخلاقی نظام میں اس طرح عام نہیں ہو سکتی تھیں، حقیقت میں مہدوی تحریک اسی ذہنی انحطاط اور مذہبی جمود کو دور کرانے کی ایک کوشش تھی۔"

("سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" ص۴۵۱)

اسوۂ رسول اور طریقۂ صحابہ و تابعین سے کتنا بُعد اور انحراف پیدا ہو گیا۔

(۴) کسی ایسی دینی شخصیت کا فقدان جو ذہنی و باطنی دونوں حیثیتوں سے عام سطح سے بلند، طاقتور و دلآویز شخصیت اور مؤثر و طاقتور روحانیت کی مالک ہو، اور جو ذہن کی بے چینی، روح کی بیتابی کو دور اور معاشرہ کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک سکے اور اسلام کی ابدیت، شریعت محمدی کی صداقت اور کمال و ترقی کے وسیع امکانات پر نیا یقین و اعتماد پیدا کر سکے۔

دسویں صدی کی تاریخ کے مطالعہ سے (تراجم و تذکرے کی کتابوں، اور حوادث و واقعات کی روئیدادوں کی مدد سے) معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں اس بے چینی اور انتشارِ خیال کے یہ قدرتی اسباب پچھلی صدیوں کے مقابلہ میں بڑھ گئے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ذہنی بے چینی، اور انتشار انگیز تحریکیں اس صدی میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

دسویں صدی کا فتنۂ کبریٰ

"الف ثانی" سے ایک نئے نظام عالم کے آغاز کا مغالطہ

الف ثانی کا مغالطہ

دسویں صدی ہجری اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے اختتام پر اسلامی تقویم کے ایک ہزار سال کی تکمیل اور دوسرے ہزار سال (الف ثانی) کا آغاز ہوتا ہے، عام حالات میں یہ تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، دنیا کی طویل عمر اور حیات انسانی کی وسیع تقویم جس طرح ہر صدی پر ایک ورق الٹتا ہے، ایک ہزار سال پر بھی گیارہویں صدی کا نیا ورق الٹنے والا تھا، لیکن جب ذہنوں میں شدید قسم کا انتشار، عقائد میں عظیم تزلزل، دین کی صحیح تعلیم اور کتاب و سنت کے علم سے نہ صرف غفلت و جہالت بلکہ وحشت و نفرت ہو، اہلِ یونان کے علوم کو عقلِ انسانی کی آخری منزل قرار دیا جائے، اور انھیں کا نام "حکمت"، "علوم دانشمندی" اور انسانی علوم و کمالات کے وسیع آفاق میں "الافق المبین"[1] قرار دیا جائے، بات کا بتنگڑ بنا لینا، اور رائی کا پربت کھڑا کر لینا، نظام تعلیم، نصابِ درس اور علمی حلقوں کا کمال سمجھا جائے، علوم نبوت، صحف آسمانی، وحی و تنزیل اور نصوص قرآنی کی تضحیک و تحقیر کی جائے، اور ان پر ایمان لانے کو

۱؎ ملا باقر داماد کی کتاب "الافق المبین" کی تلمیح۔

جہل، کورانہ تقلید اور عقل دشمنی کا مرادف قرار دیا جائے، پھر اس کے ساتھ اس وقت کی حکومتوں اور سیاسی نظاموں سے (جو غلط اور صحیح طریقہ پر مذہب کا سہارا لیتے تھے اور اس کو اپنے اقتدار کا پشت پناہ سمجھتے تھے) بیزاری بھی بغاوت و اشتعال کی حد تک پہونچ گئی ہو پھر سونے پر سہاگہ جب ایسے حوصلہ مند اور طالع آزما افراد پیدا ہو جائیں، جو ذہانت اور اس وقت کے علم و حکمت سے مسلح بھی ہوں، اور وہ نئے دور کا بانی و رہنما، اور احترام و اقتدار کا مالک ہونے کے سہانے خواب بھی دیکھنے لگیں، اور ان کے دل و دماغ میں یہ تمنا کروٹیں لینے لگے، کہ ماہ و سال کی گردش سے وہ بھی وہی فائدہ اٹھائیں جو پچھلے پیشوایانِ مذاہب نے (ان کے بقول) اٹھایا، اور ان کی تحریک و دعوت سے قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ایک نئی تقویم کا آغاز ہوا جس کی ان کے خیال میں سب سے کامیاب اور مکمل شکل اس عہد کا آغاز تھا، جو بعثت محمدی اور ظہور اسلام سے عرب میں شروع ہوتا ہے اور ساری دنیا کو اپنے سایہ میں لے لیتا ہے، ان کے نزدیک اس دین کی تاریخ اور دنیا کی تقویم میں الف اول کا ختم ہونا اور الف ثانی کا شروع ہونا ایک اہم حادثہ اور ایسا زریں موقعہ ہے، جو جلد جلد اور بار بار ہاتھ نہیں آتا، اور اگر اس کو گنوا دیا جائے گا تو پھر ایک ہزار سال کا انتظار کرنا پڑے گا، اس لئے اس موقعہ کو کسی طرح سے جانے نہیں دینا چاہیئے، ورنہ صدیوں کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

دسویں صدی کے نصف آخر میں ہمیں عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں اور خاص طور پر اس کے سب سے بے چین طباع، اور تخلیقی و اختراعی صلاحیت رکھنے والے خطہ ایران میں (جس کو بہت سی مماثلتوں کی بنا پر مشرق کا یونان کہنا صحیح ہوگا) اس خیال کے عکس نظر آتے ہیں، ظہور اسلام کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک ہزار سال پورے ہو رہے تھے، اور دوسرا ہزار شروع ہونے کو جا رہا تھا، ہر صدی کے سرے پر مجدد کا ظاہر ہونا، حدیث سے ثابت ہوتا ہے، اور

تاریخ بھی اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے، اس لئے بعض ذہین لوگ دوسرے ہزار سال کے شروع ہونے پر مجدد سے زیادہ دینِ جدید کے موسس اور عالم کے نئے دور کے فاتح کے ظہور کے خواب دیکھنے لگے تھے، اور ان میں بہت سے منچلے لوگوں نے اپنا نام اس منصب کے امیدواروں کی فہرست میں لکھانے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی، افسوس ہے کہ اس دور کی کوئی ذہنی و فکری تاریخ مرتب نہیں کی گئی جس میں اس عہد کے قلب و دماغ، جذبات و خیالات، تمناؤں اور آرزوؤں کی پرچھائیاں نظر آئیں، پہلے اور پچھلے دوروں کی طرح سب تاریخیں "سرکار دربار" کے گرد گھومتی ہیں، اور ان میں زیادہ تر انقلابات سلطنت، فتح و ہزیمت، بادشاہوں کی داد و دہش، اہلکاران سلطنت کے عزل و نصب، اور امراء کے عیش و عشرت کی داستانیں، اور رزم و بزم کے افسانے ملتے ہیں، اگر دسویں صدی کے عالم اسلام کی کوئی فکری تاریخ ہوتی تو ہمیں صاف نظر آتا کہ الف ثانی کے قرب نے کتنے دلوں میں تمنائے خام کے چراغ روشن کر دیئے تھے، اور انھوں نے ایک نئی مسندِ پیشوائی اور ایک نئی سیادت و قیادت کا خیمہ نصب کرنے کے لئے چوب اور طنابیں مہیا کرنی شروع کر دی تھیں۔

صفوی حکومت کے قیام کے بعد جس نے شیعیت کو حکومت کی طاقت اور اقبال سے سارے ایران کا مذہب بنا دیا تھا، اور اگرچہ اس سلطنت کے بانیوں کے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین مسلکاً و ذوقاً صوفی تھے، لیکن شیعیت کو چونکہ تصوف سے بیر ہے، اس کے دور اقتدار میں اس ایران میں جس نے امام غزالی طوسی، شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری، مولانا جلال الدین رومی[1]، اور مولانا عبدالرحمن جامی جیسے عارف و محقق پیدا کئے تھے، اور جس سے بغداد و دہلی و اجمیر کو پیران پیر سید نا عبدالقادر جیلانی، شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی، خواجہ بزرگ شیخ معین الدین چشتی، اور شہید عشق خواجہ قطب الدین بختیار کعکی اوشی میسر آئے تھے، تصوف کا چراغ بالکل گل ہو گیا، دوسری طرف کتاب و سنت کا

[1] آپ اصلاً بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے حال واقع ملک افغانستان۔

وہ علم اور فنِ حدیث جس کا ایران بڑا مرکز رہ چکا تھا، اور جس نے تاریخ اسلام کو مسلم بن الحجاج القشیری نیشاپوری، ابو عیسیٰ ترمذی، ابو داؤد سجستانی، ابن ماجہ قزوینی اور حافظ ابو عبد الرحمٰن نسائی جیسے امام حدیث اور مصنفین صحاح عطا کئے، وہ اب کتاب و سنت اور علم حدیث سے بالکل بیگانہ اور تہی دامن تھا، اب اس کے علم کا تمام تر سرمایہ اور اس کے امتیاز و تفوق کا میدان یونانی علوم و حکمت (فلسفہ و منطق) تھے، اس انقلاب نے جس نے نبی عربیؐ کے صحابۂ کرام، اور ان کی سنت و احادیث سے اس مردم خیز اسلامی ملک کا رشتہ پہلے ہی کاٹ دیا تھا، ملک کے ذہین اور طباع طبقہ کا رابطہ نبوت محمدی، عقیدۂ ختم نبوت اور دین اسلام کے خلود و بقاء کے عقیدہ سے اگر منقطع نہیں کیا تو کمزور ضرور کر دیا، اور اگر اہلِ بیت کرام سے (تشیعیت کی بنیاد پر) عقیدت و نسبت نہ ہوتی تو اس ملک کا مجوسیت، ماقبل اسلام کی تہذیب، اور شاہنامۂ فردوسی کے رستم و اسفندیار کے دور کی طرف واپس چلے جانے کا خطرہ تھا۔

ایسی حالت میں نویں اور دسویں صدی کے ایران میں انتشار انگیز تحریکوں، اور اسلام کے خلاف عقلی و فلسفی سازشوں کا پیدا ہونا خلاف قیاس اور خلاف توقع نہیں، جس کی سب سے ترقی یافتہ مثال نویں صدی کے اخیر اور دسویں صدی کے ابتدا کی نقطوی تحریک ہے، جو ایران کی اس بے چین روح کا بہترین مظہر ہے، جس نے کبھی مزدک کی شکل میں، کبھی مانی کے روپ میں، اور کبھی حسن بن صباح کے لباس میں ظہور کیا تھا، اور جو خالص ایک ملحدانہ تحریک ہے، بقول اسکندر منشی کے :-

آن طائفہ بمذہب حکماء عالم را قدیم شمردہ اند، و اصلاً اعتقاد بحشر اجساد و قیامت ندارند، و مکافات حسن و قبح

اعمال را در عافیت و مذلت دنیا قرار دادہ، بہشت و دوزخ ہما نرامی شمارند۔[1]

یہ فرقہ حکماء کے مذہب کے مطابق عالم کو قدیم مانتا ہے، اجسام انسانی کے دوبارہ زندہ ہونے اور حشر و نشر کا مطلق عقیدہ نہیں رکھتا، اعمال کے حُسن و قبح کی جزا و سزا کو دنیا کی راحت و ذلت کی شکل میں قرار دے کر اسی کو بہشت و دوزخ سمجھتا ہے۔

شاہ نواز خاں ان کے متعلق لکھتا ہے :-

علم نقطۂ الحاد و زندقہ و اباحت و توسیع مشرب است مثل حکماء بقدم عالم گروند، و انکار حشر و قیامت نمایند، و مکافات حسن و قبح اعمال، و جنت و نار در عافیت و مذلت دنیا قرار دہند۔[2]

علم نقطۂ الحاد و زندقہ اباحت (سب کچھ جائز ہے) اور وسیع المشربی (سب صحیح ہے) کا نام ہے، حکماء قدیم کی طرح وہ قدم عالم کے قائل اور حشر و قیامت کے منکر ہیں، اعمال کے حسن و قبح کا انعام و سزا، اور جنت و دوزخ اسی دنیا کی خوشحالی اور تنگ حالی کو سمجھتے ہیں۔

وہ نظریۂ ارتقاء کے قائل ہیں، اور ان کا عقیدہ ہے کہ جمادات و نباتات ترقی کرتے کرتے انسان کے درجہ تک پہونچ جاتے ہیں،[3] نباتات کے اگنے میں قدرت خداوندی کا کوئی دخل نہیں، وہ محض کواکب و عناصر کی ترکیب کا عمل ہے،[4] قرآن پاک کو نبی کریم کی تصنیف

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی جلد ۲ ص ۳۲۵ [2] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۶۱۹

[3] دبستان مذاہب ص ۳۰۰

[4] مبلغ الرجال ورق ۲۵ الف نسخہ قلمی موجود مولانا آزاد کلیکشن، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سمجھتے ہیں، اور مسائل شریعت کو اہل الرائے کا طبع زاد، اس فرقہ کے پیرو نماز، حج، اور قربانی کا مذاق اڑاتے ہیں[1]، ماہ رمضان کا نام انھوں نے "ماہ گرسنگی و تشنگی" رکھا ہے، طہارت وغسل کے مسائل کی بھی تضحیک کرتے ہیں[2]، اور محرمات ابدیہ کی حرمت کے بھی قائل نہیں، وہ نقلیات کے منکر اور عقلیات کے داعی ہیں[3]۔

اس فرقہ کا بانی محمود بسیخوانی[4] کو بتایا جاتا ہے، اس فرقہ نے دسویں صدی ہجری میں ہندوستان و ایران کے ہزاروں لوگوں کو متأثر کیا، اور ایران میں اس کے پیروؤں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی، نقطویوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اول ظہور سے محمود بسیخوانی تک آٹھ ہزار[8000] سال کی مدت ہوتی ہے، یہ دور عربوں کی سیادت کا دور تھا، کیونکہ اس مدت میں پیغمبر صرف عربوں ہی میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔

---

[1] ایضاً [2] ایضاً

[3] ایضاً، اس مضمون میں پروفیسر محمد اسلم کی کتاب "دین الٰہی اور اس کا پس منظر" نیز ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کتاب "تاریخی و ادبی مطالعے" سے استفادہ کیا گیا ہے، مزید تفصیل اور مستند معلومات کے لئے ملاحظہ ہو "نقطویان یا پسیخوانیاں" از دکتر صادق کیا، [4] محمود بسیخوانی یا پسیخانی گیلانی نے استرآباد میں ۸۰۰ھ میں اس نئے مذہب کا اعلان کیا، ۸۳۲ھ میں اس کی وفات ہوئی، اس فرقہ کی بنیاد ایران میں نویں صدی ہجری کی بالکل ابتدا میں ہوئی، رفتہ رفتہ اس نے بڑا زور پکڑا، یہاں تک کہ دسویں صدی اور گیارہویں صدی میں ایران اور ہندوستان میں اس فرقہ کے پیروؤں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی تھی، اس فرقہ کو ملاحدہ تناسخیہ اور اہل زندقہ کے نام سے ایرانی مورخین اور مسلمان مصنفین نے یاد کیا ہے، اور چونکہ محمود کے نزدیک ہر چیز کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے اور وہ خاک کو نقطہ کہتا ہے، یا اس لئے کہ اس نے مطالب قرآن کو اپنے خیال کو بیان کرنے میں حرفوں اور نقطوں کی تعداد سے مدد لی ہے، اس فرقہ کو نقطوی یا اہل نقطہ کہتے ہیں، (ماخوذ باختصار از مضمون "فرقۂ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر" مشمولہ "تاریخی و ادبی مطالعے" از ڈاکٹر نذیر احمد)۔

محمود بسیخوانی کے ظہور سے عربوں کی سیادت ختم ہوگئی ہے[1]، لہذا آئندہ آٹھ ہزار[8000] سال تک پیغمبر عجمیوں ہی میں پیدا ہوا کریں گے[2]۔

نقطویوں کے عقائد کے سلسلہ میں جن کا کسی قدر یہاں بیان ہوا، ان کا یہ نظریہ بنیادی اور انقلابی اہمیت رکھتا ہے (اور ہماری اس بحث اور مجدد صاحب کے تجدیدی کارنامہ کا اس سے خاص تعلق ہے) کہ "مذہب اسلام منسوخ ہوچکا ہے، اس لئے محمود کا لایا ہوا دین قبول کئے بغیر چارہ نہیں"، "دین اسلام کی میعاد ختم ہوچکی ہے، اس لئے اب نئے دین کی ضرورت ہے[3]"، دسویں صدی میں اس عقیدہ کا ظہور و اعلان صاف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس عقیدہ الفی کے قائل ہیں، اور الف ثانی سے اپنا کام زور شور سے شروع کرنے والے ہیں، شاہ عباس صفوی نے ایران میں نقطوی مذہب کی پیروی کے الزام میں ہزاروں نقطویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، بادشاہ اس معاملہ میں اپنے پیشروؤں سے زیادہ سخت واقع ہوا تھا، بادشاہ کی نظر میں اس سے زیادہ خطرناک کوئی دوسرا گروہ نہ تھا، چنانچہ ۱۰۰۲ھ میں اس نے بڑے وسیع پیمانہ پر ان کا قتل عام کیا، اس قتل و غارتگری کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے نقطوی جان بچا کر ہندوستان بھاگ آئے، اس میں مولانا حیاتی کاشی بھی تھے، جو دو سال تک قید میں رہنے کے بعد شیراز آئے اور ۹۸۶ھ میں وطن میں کچھ دن قیام کرکے بالآخر ہندوستان چلے آئے، ۹۹۳ھ میں وہ احمد نگر میں موجود تھے، شریف آملی جو بڑا باکمال عالم تھا، اس فرقہ کے اکابر سے تعلق رکھتا تھا، وہ اپنے زمانہ کی سخت گیریوں سے تنگ آکر ہندوستان چلا آیا تھا، اکبر بادشاہ اس کے ساتھ

---

[1] محمود یا اس کے کسی پیرو کا شعر ہے ؎

گذشت آنکہ عرب طعنہ بر عجم میزد | رسید نوبت رندان عاقبت محمود

[2] دبستان مذاہب ص۳۰۱ [3] ایضاً ص۳۰۰

پیر جیسا سلوک کرتا تھا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ میر شریف آملی نے محمود بسیخوانی کی تحریروں سے ثبوت پیش کر کے اکبر کو دین نو کے اختراع کی ترغیب دی، اس نے محمود کی پیشگوئی بیان کی کہ ۹۹۰ھ میں ایک شخص ظاہر ہوگا جو دین باطل مٹا کر دین حق قائم کرے گا۔

بدایونی اور خواجہ کلاں[1] دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ شریف آملی نے ایران سے بھاگ کر بلخ میں مولانا محمد زاہد نبیرۂ شیخ حسین خوارزمی کی خانقاہ میں پناہ لی، اور صوفیوں کی طرح رہنے لگا، اس کی طبیعت کو چونکہ درویشی سے کوئی مناسبت نہ تھی، اس لئے اس نے ہرزہ سرائی اور شطامی کو اپنا شعار بنا لیا، جب مولانا محمد زاہد کو اس کے عقائد معلوم ہوئے تو انھوں نے اس کو اپنی خانقاہ سے نکال دیا، اور وہ دکن چلا گیا۔

دکن میں ان دنوں شیعیت کا دور دورہ تھا، اس لئے لوگوں نے شریف آملی کو شیعی عالم سمجھتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ لیا، جب لوگوں کو اس کے عقائد معلوم ہوئے تو وہ اس کے درپے آزار ہوئے، بدایونی کے الفاظ میں:۔

حکام دکن می خواستند کہ لوح ہستی — دکن کے حکام اس کا نقش حیات ہی
او را از نقش حیات پاک سازند، — مٹا دینا چاہتے تھے، لیکن بعد ازاں
عاقبت بر سوائی خر قرار یافتہ بر سوائی — انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے گدھے پر
تشہیرش نمودند[2] — بٹھا کر اس کی تشہیر کی جائے۔

اکبر نے ہزاری منصب دے کر اسے اپنے مقربین کے زمرہ میں شامل کر لیا[3]، بنگالہ میں اس کو دین الٰہی کا داعی مقرر کیا، اور وہ اکبر کے چار مخلص یاروں میں شامل تھا، دین الٰہی کے

---

[1] خواجہ عبید اللہ فرزند خواجہ باقی باللہ مصنف مبلغ الرجال۔ [2] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۴۶
[3] مبلغ الرجال ورق ۳۲ ب

مریدوں اور معتقدوں کے سامنے اکبر کی وہ نیابت بھی کرتا تھا[1]، "مآثر الامراء" میں ہے "تصوف وحقائق بسیار ورزیدہ والحاد و زندقہ را بداں خلط دادہ، دعوائے "ہمہ اوست" می کرد و ہمہ را اللہ می گفت[2]"۔ ابو الفضل علامی کے متعلق بعض معاصر تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ وہ نقطوی تحریک سے متأثر تھا، شاہ عباس صفوی نے نصر آباد کاشان میں ممتاز ترین نقطوی داعی اور ذمہ دار میر سید احمد کاشی کو جب قتل کیا تو اس کے کاغذات کے ذخیرہ میں جن نقطویوں کے خطوط ملے ان میں ابو الفضل کا بھی ایک خط تھا، معاصر تاریخ نویس اسکندر منشی تاریخ عالم آرائے عباسی میں لکھتا ہے:۔

"ہندوستان سے آنے جانے والوں سے معلوم ہوا کہ ابو الفضل پسر شیخ مبارک بھی جو ہندوستان کے فضلاء میں ہے اور دربار اکبری میں بہت زیادہ تقرب حاصل کر چکا ہے اسی مذہب کا پیرو ہے، اس نے اکبر بادشاہ کو وسیع المشرب بنا کر جادۂ شریعت سے منحرف کر دیا ہے، اس کا خط جو میر احمد کاشی کے نام لکھا گیا تھا، اور جو میر مذکور کے کاغذات میں دستیاب ہوا ابو الفضل کے نقطوی ہونے پر دلالت کرتا ہے[3]۔"

خواجہ کلاں اپنی کتاب "مبلغ الرجال" میں محمود بسیخوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"شیخ ابو الفضل ناگوری بساط آں آئین خسارت قرین را در مملکت ہندوستان گسترد[4]۔"

ان تاریخی شہادتوں کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نقطوی فرقہ یا تحریک کے داعیوں اور علمبرداروں نے ہندوستان اگر الف ثانی کے لئے نئے دور، نئے دین اور نئے آئین کے لئے کس طرح ایک تخت اور مسند تیار کر رکھی تھی، جس پر مسند آرا ہونے کے لئے ایک با اختیار و طاقتور موزوں شخصیت درکار تھی، اور اس کے لئے ان کی نظر میں اکبر سے زیادہ کوئی اہل نہ تھا۔

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۲۵-۲۴۸ [2] مآثر الامراء جلد ۳ ص ۲۸۵ [3] مستفاد از مضمون "فرقہ نقطوی پر ایک طائرانہ نظر" مندرجہ کتاب "تاریخی و ادبی مطالعے" از ڈاکٹر نذیر احمد ص ۲۶۱ [4] مبلغ الرجال ورق ۳۱ نیز ملاحظہ ہو ورق ۳۲-۳۳

بابِ دوم

اکبری عہدِ حکومت اور اس کے دو متضاد دور

اکبر کی مذہبی اور دیندارانہ زندگی

عہدِ اکبری اور ہندوستان کے تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ اکبر کی تخت نشینی اور ابتدائی عہدِ حکومت نہ صرف ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے شروع ہوا، بلکہ خوش عقیدگی اور مذہبی غلو اور تقشُّف کے ساتھ اس کا آغاز ہوا، اس کے ثبوت کے لئے "دربارِ اکبری" کے مشہور مصنف و عالم اور عہدِ اکبری کے مورخ ملا عبدالقادر بدایونی (م ۱۰۰۴ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب "منتخب التواریخ" سے منتخب کر کے عہدِ اکبری کے اس دور کے چند متفرق واقعات اور بادشاہ کے حالات نقل کئے جاتے ہیں، جب وہ اپنے اسلاف کی طرح ایک سیدھا سادہ خوش اعتقاد مسلمان تھا، اور دینی تعلیم بلکہ مطلق تعلیم نہ ہونے، ماحول کے اثر اور اپنے عہد کے رواج کے مطابق (جس میں مشائخ و مزارات کے بارے میں غلو، حد سے بڑھی ہوئی خوش عقیدگی اور بدعات عام تھیں) بزرگوں کے مزارات کے لئے طول طویل سفر (شدِّ رحال) کرتا تھا، بدعقیدگی اور خلافِ جمہور عقائد کے الزام پر سخت سزا دیتا تھا، اولیاء اللہ کے مزارات پر نذر گزرانتا تھا، خود ذکر میں انہماک کے ساتھ مشغول رہتا، علماء اور صلحاء کی صحبت میں وقت گزارتا،

اور مجلسِ سماع میں شرکت کرتا تھا۔

اکبر کی دینداری اور مذہبی غلو کی شہادت میں ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ اس پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے، اور اس سے اکبر کی تعریف نکلتی ہے، اور اس بارہ میں ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ و تصنیف میں کسی مخالفانہ جذبہ کے کام کرنے یا عناد کا کوئی سوال نہیں، البتہ اکبر کی زندگی کے دوسرے دور (دینِ الٰہی کے نظریہ کی اشاعت وحدتِ ادیان کے عقیدہ، اسلام سے بُعد و وحشت، مذاہبِ غیر کے بارہ میں حد سے بڑھی ہوئی رواداری اور اسلام کے بارے میں معاندانہ رویہ) کی شرح و تفصیل میں ہم ملا عبدالقادر کے بیانات نقل کرنے میں (جن کی صحت و استناد، اور ان کی تاریخی غیر جانبداری کے سلسلہ میں ان اخیر برسوں میں بعض حلقوں کی طرف سے بڑا شک و اشتباہ پیدا کر دیا گیا ہے[1])

---

[1] اکبر کے دورِ ثانی کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی کے بیانات اور شہادتوں کو ان کے دینی تعصب اور اکبر سے ذاتی عناد و مخالفت پر محمول کرنے اور ان کی کتاب "منتخب التواریخ" کو مجروح و ساقط الاعتبار کرنے کی پچھلے برسوں سے جو مہم شروع ہوئی ہے، اس کی کوئی مثبت علمی بنیاد اور تاریخی ثبوت نہیں، اس الزام کی بنیاد بھی محض جذباتِ اکبر کی عظمت اور اس کو ہر طرح کے الزامات سے بری کرنے کے جذبہ (جو خاص تعلیم و تربیت اور ماحول و زمانہ کا نتیجہ اور ایک مقصد کے ماتحت تاریخ نویسی کا اثر ہے) سوءِ ظن اور منفی رویہ پر ہے، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر "منتخب التواریخ" کا مطالعہ کرے گا، وہ مصنف کے خلوص و صداقت، دردمندی اور جرأتِ مندانہ حق گوئی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کتبِ تاریخ کا وسیع مطالعہ کرنے والے کو تاریخ و افسانہ میں امتیاز کرنے اور مصنف اور اس کی کتاب کے پایہ کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ خود صراف کی طرح کھرے کھوٹے کا فرق سمجھنے لگتا ہے۔

الیٹ "منتخب التواریخ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "بہت کم ایسے واقعہ نگار ہیں، جو بدایونی کی طرح

(باقی ص ۷۲ پر)

...احتیاط برتیں گے، اور تنہا ان کے بیانات پر انحصار نہیں کریں گے، بلکہ ان کو اکبر کے مخلص وفادار ارکان سلطنت، مؤرخین دربار اور اس عہد کے غیر جانبدار مؤرخوں کے بیانات اور شہادتوں کی محض تائید میں پیش کریں گے۔

"منتخب التواریخ" کے حسب ذیل بیانات ملاحظہ ہوں:-

"شہزادہ سلیم کی ولادت کے شکرانہ میں بادشاہ نے اجمیر کا پیادہ پا سفر کیا، واپسی میں دہلی میں پڑاؤ ڈالا، اور اولیائے دہلی کے مزارات کی زیارت کی"[1]

"اجودھن جا کر حضرت شیخ المشائخ فریدالدین گنج شکر کی زیارت کی، مرزا مقیم اصفہانی کو میر یعقوب کشمیری کے ساتھ رفض کے الزام میں سزا ملی"[2]

"اوائل شعبان میں بادشاہ نے اجمیر کا سفر کیا، سات کوس سے پیادہ پا مزار پر حاضر ہوا، نقارہ نذر گزرانا، اہل اللہ علماء اور صلحاء کے ساتھ صحبت اور مجلس سماع گرم رہی"[3]

"عبادت خانہ میں "یاہو" اور "یا ہادی" کے ذکر میں انہماک رہتا تھا، (۹۸۰ھ میں... عبادت خانہ کی تین عمارتوں کی تعمیر کا تفصیلی ذکر)"[4]

"عبادت خانہ میں ہر شب جمعہ کو سادات و مشائخ، علماء و امراء کی طلبی ہوتی، بادشاہ خود ایک حلقہ میں آتا، اور مسائل کی تحقیق کرتا۔

اسی زمانہ میں قاضی جلال اور دوسرے علماء کو حکم ہوا کہ قرآن مجید کی تفسیر بیان کی جائے"[5]

(باقی ص۷۵ کا) اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں خصوصاً جو شاہی کانوں کو ناگوار ہوں، یا جو اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو اس صفائی اور بے پروائی کے ساتھ آشکارا کر دیتے ہوں" (الیٹ جلد ۵ ص۴۷۸)

۱؎ منتخب التواریخ جلد ۲ ص۱۲۳ ۲؎ ایضاً ص۱۲۴ ۳؎ ایضاً ص۱۸۵ ۴؎ ایضاً ص۲۰۰-۲۰۱ ۵؎ ایضاً ص۲۱۱

۹۸۶ھ کے واقعات میں فتح پور سیکری میں عبادت خانہ میں علماء و مشائخ کی صحبت شب جمعہ کی شب بیداری کا ذکر آتا ہے۔

"جب خان زماں نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اس کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے بادشاہ دہلی کے تمام اولیاء اللہ کے مزارات پر بغرض دعا حاضر ہوا"[1]

ماہم آنکہ کے تعمیر کردہ مدرسہ خیر المنازل کے پاس سے گزرتے ہوئے، فولاد نامی ایک شخص نے (شرف الدین حسین کے ایماء سے) بادشاہ پر ایک تیر چلایا، بادشاہ کو معمولی سا زخم آیا، جو چند روز کی مرہم پٹی سے درست ہو گیا، اس ناگہانی حملہ سے بچ نکلنے کو بقول بدایونی "از تنبیہات غیبی و کرامات پیران حضرت دہلی دانستہ" اولیاء دہلی کی کرامت سمجھا"[2]

"ایک بار اجمیر جاتے ہوئے اس عہد کے مشہور بزرگ شیخ نظام نارنولی کی (جن کے زہد و اتقا کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی) خدمت میں حاضر ہوا"[3]

"۹۸۰ھ میں اجمیر میں سید حسین خنگ سوار کے مزار پر اور اس کے چند سال بعد ہانسی میں حضرت قطب جمال کے مزار پر بڑی عقیدت و نیاز کے ساتھ حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی"[4]

"شیخ سلیم چشتی کے ساتھ عقیدت خاص تھی، ان کا روضہ بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا، اور اس عقیدت و محبت کی بناء پر ولی عہد سلطنت (جہانگیر) کا جو کہا جاتا ہے کہ ان کی دعا سے پیدا ہوا سلیم نام رکھا، بادشاہ نے سلیم کی ولادت سے قبل رانی جودھا بائی کو شیخ کے گھر بھیج دیا تھا، تا کہ ان کی توجہ اور دعا ان کے شامل حال رہے"[5]

"اسی طرح شہزادہ مراد کی ولادت بھی شیخ ہی کے گھر میں ہوئی تھی"[6]

۱؎ منتخب التواریخ جلد ۲ ص۲۵۲ ۲؎ ایضاً ص۲۶۲ ۳؎ ایضاً ص۲۵۲

۴؎ ایضاً ص۲۳۲ ۵؎ ایضاً ص۱۰۸ ۶؎ ایضاً ص۱۲۳

"شہزادہ سلیم جب مکتب نشینی کے قابل ہوا تو اس کی رسم تسمیہ خوانی کے لئے اپنے عہد کے مشہور محدث مولانا میر کلاں ہروی کو زحمت دی اور انھوں نے بادشاہ اور عمائدین سلطنت کی موجودگی میں شہزادہ کی بسم اللہ کرائی۔"[1]

"جب شہزادہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گیا تو اسے حکم دیا کہ شیخ عبدالنبی کے گھر جا کر ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کرے اور اس نے مولانا جامی کی چہل حدیث ان سے پڑھی"[2] اکبر کو شیخ عبدالنبی (نبیرۂ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی وصدر جہاں عہد اکبری) سے اتنی عقیدت تھی کہ اکثر وہ ان کے گھر جا کر ان کے درس میں شرکت کرتا، ایک دو مرتبہ ان کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔"[3]

"اکبر نے ان کے لئے کارخانہ شاہی میں خصوصی دوشالہ تیار کروایا، اور ملا عبدالقادر کے ہاتھ ان کی خدمت میں بھیجا، اور کہا کہ یہ آپ ہی کے لئے شاہی کارخانہ میں تیار ہوا ہے۔"[4]

"اس عہد کے مشہور شطاری شیخ شیخ محمد غوث گوالیاری کے گزارہ کے لئے ایک کروڑ (دام) سالانہ آمدنی کی جاگیر مخصوص کردی، ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند شیخ ضیاء اللہ کے ساتھ بھی نیازمندانہ طریقہ پر پیش آتا۔"[5]

بزرگوں سے یہ عقیدت مندی اکبر کو موروثی طریقہ پر ملی تھی، اس کے تیموری آباء و اجداد خواجہ ناصر الدین عبید اللہ احرار کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے، بابر کا دادا سلطان ابوسعید پاپیادہ ان کی خدمت میں جایا کرتا تھا، اور ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا، بابر کے والد عمر شیخ مرزا کو بھی خواجہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی، خود بابر بھی اپنی تزک میں ان کا ذکر بڑے احترام سے کرتا ہے، اکبر کے خاندان کی خواتین و بیگمات کے رشتے نقشبندیہ خاندان کے بزرگوں سے ہوئے، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے اخلاف میں سے ایک بزرگ خواجہ یحییٰ ہندوستان

لہ ایضاً ص۱۷۰ ۔ ۲ ایضاً ص۲۰۴ ۔ ۳ ایضاً ص۲۰۲ ۔ ۴ ایضاً ص۲۲۷ ۔ ۵ ایضاً ص۲۰۳

تشریف لائے تو اکبر نے ان کا بڑا اعزاز کیا، ان کے مصارف کے لئے ایک جاگیر عطا کی اور انھیں امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ روانہ کیا، واپسی پر انھیں مستقل طور پر آگرہ میں ٹھہرایا۔[1]

"اکبر نے ہفتہ کے سات دنوں کے لئے سات امام مقرر کر رکھے تھے، جو باری باری مقررہ دن میں نماز کی امامت کرتے تھے، بدھ کے روز کی امامت ملا عبدالقادر بدایونی سے متعلق تھی۔"[2]

"ہر سال ایک بڑی تعداد کو سرکاری خرچ سے حج کے لئے بھیجتا تھا، امیر حاج کے ہاتھ شریف مکہ کے لئے تحائف اور اہل حرم کے لئے نقد و جنس بھیجتا تھا۔"[3] قافلہ کی روانگی کے دن حاجیوں کی طرح احرام باندھ کر سر کے بال تھوڑے سے ترشوا کر تکبیر کہتا ہوا ننگے سر، برہنہ پا دور تک انھیں رخصت کرنے جاتا، اِس منظر سے ایک شور برپا ہوتا، اور لوگوں پر رقت طاری ہوتی۔"[4]

جب ہندوستان میں شاہ ابوتراب حجاز سے قدم رسول لے کر تشریف لائے اور وہ آگرہ کے قریب پہونچے تو بادشاہ امراء، علماء کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ شہر سے چار کوس باہر نکل کر استقبال کے لئے گیا۔

آخر میں اس کی دینداری کی شہادتوں کو ہم عہد سلطنت مغلیہ کے مشہور مورخ میر عبدالرزاق خافی خاں معروف بہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں (۱۱۱۱ھ۔۱۱۷۱ھ) کی مشہور کتاب "مآثر الامراء" کے اس بیان پر ختم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

اکبر بادشاہ بہ ترغیب شیخ در اجراء احکام	اکبر بادشاہ شیخ کی ترغیب سے احکام شرعیہ
شرعی و امر معروف و نہی منکر فراواں	کے اجراء امر معروف و نہی منکر کے سلسلہ میں بڑی
جہدمی فرمود و خود اذان می گفت	کوشش کرتا تھا، خود اذان کہتا اور امامت
و امامت می کرد حتی بقصد ثواب	کرتا حتی کہ ثواب کی نیت سے مسجد

لہ ایضاً ج ۳ ص۱۰۰ ۔ ۲ ایضاً ج ۲ ص۲۲۰ ۔ ۳ ایضاً ص۲۵۱ ۔ ۴ ایضاً ص۲۳۹

بسجد جاروب می زد۔[1] میں جھاڑو بھی دیتا تھا۔

اکبر کے مزاج میں تغیر اور عہد اکبری کا دور ثانی[2]

اکبر کی دینداری اور مذہبی شغف کی اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں، پڑھنے والے ان سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ ایسی سطحی اور عامیانہ قسم کی مذہبیت تھی، جس کی بنیاد دین کے صحیح فہم کتاب و سنت سے واقفیت اور براہ راست علم و مطالعہ پر نہیں تھی، اور وہ بجائے علمائے راسخین کی تعلیم اور صحیح دینی صحبت و تربیت کی رہینِ منت ہونے کے محض مذاق زمانہ، مزاج سپاہیانہ اور وسط ایشیاء کے دین سے ناواقف امراء و اہل حکومت کی تقلید و نقالی، اور خوش عقیدگی بلکہ ضعیف الاعتقادی پر مبنی تھی، اس دینداری کا رکن اعظم مزارات پر حاضری دینا، کوسوں پیادہ پا چل کر وہاں آنا، وہاں کے سجادہ نشینوں کے ساتھ (جو اکثر بے علم، اسلاف کے کمالات سے عاری اور صحیح روحانیت سے خالی ہوتے تھے) اپنی نیازمندی اور فدویت کا اظہار، خانقاہوں کی جاروب کشی، مجالس ذکر و سماع میں شرکت اور "درباری سرکاری" علماء و مشائخ کی

---

[1] مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۶۱

[2] بیان کیا جاتا ہے کہ جہانگیر نے چھوٹی توزک میں اکبر کے انتقال کا جو حال لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی غلط روی کا احساس ہو گیا تھا، اور اس نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اس حالت میں جان دی کہ سورۂ یٰسین اور دعا پڑھی جا رہی تھی، ہم کو اس باب میں اس سے بحث نہیں کہ خدا کا معاملہ اس کے ساتھ کیا رہا، اور وہ دنیا سے کس حال میں رخصت ہوا، ہمیں اس کے ان اقدامات اور کارروائیوں سے بحث ہے جو اس نے نئے دین و آئین کے جاری کرنے میں کیں اور ان اثرات سے جو ان کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں پر مترتب ہوئے۔

توقیر و تعظیم تھی، اکبر کے حالات سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ ناخواندۂ محض تھا،[1] تیموری خاندان کے مزاجوں میں عام طور پر غلو، انتہا پسندی، اور حد سے بڑھی ہوئی خوش عقیدگی داخل ہے، ہمایوں کے متعلق تاریخ میں آتا ہے کہ وہ محنت کرنے، میدان جنگ کی سختیاں اٹھانے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے پر آتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ گوشت پوست کا نہیں لوہے کا بنا ہوا ہے اور انسان نہیں، جن ہے، لیکن جب آرام کرنے پر آتا تو سب بھول جاتا، اور معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ میدان جنگ کا ایک جانباز سپاہی ہے، جہانگیر میں بھی یہ تضاد اور بے اعتدالی نظر آئے گی۔

پھر یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جن ناہموار اور غیر معمولی حالات میں اس کا بچپن اور عنفوان شباب گزرا تھا، چچاؤں کی جس بے مروتی بے مہری، اور خون کے سفید ہو جانے کا اس نے مشاہدہ کیا تھا، اور جو کڑوے بلکہ زہر آلود گھونٹ اس نے باپ کی شکست اور سفر ایران کے زمانہ میں پئے تھے، پھر بیرم خاں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، اس سب نے اس کی طبیعت میں انسانی فطرت کی طرف سے بدگمانی، بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے آدمی کے خلوص و وفاداری کے بارہ میں شک اور مزاج میں ایک طرح کا تلون پیدا کر دیا تھا۔

---

[1] اکبر جب چار سال چار ماہ چار دن کا ہوا تو رواج زمانہ کے مطابق اس کی مکتب نشینی کی رسم ادا ہوئی اور ملا زادہ عصام الدین ابراہیم اتالیق مقرر ہوئے، لیکن ملا کو اندازہ ہوا کہ اکبر کو تعلیم کی طرف رغبت نہیں، اسے معلم کی ناکامی اور بے توجہی پر محمول کیا گیا، اور ملا زادہ کی جگہ مولانا بایزید کا تقرر ہوا، مگر اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر بادشاہ نے مولانا عبد القادر بدایونی کو منتخب کیا، مگر بلند اقبال شہزادہ کی طبیعت تعلیم پر مائل نہ ہوئی، سیاسی حالات اور ان کے نتیجہ میں سرگردانی و نقل مکانی نے اس کو اور ہوا دی، اور اکبر تعلیمی لحاظ سے بے سواد اور ناخواندہ رہ گیا۔

(ملخص از تواریخ عہد اکبری)

مذاہب کا تقابل و تحقیق اور مجالس مناظرہ، اور ان کا اثر

اِس صورت حال کی اصلاح اس کی ان کمزوریوں پر غلبہ حاصل کرنے اور اس کو اسلام سے وابستہ اور دین سے منسلک رکھنے بلکہ بہت سے سلاطین اسلام کی طرح (جن میں سے بعض اس کے خاندان میں بھی پیدا ہوئے) دین کا حامی و ناصر بنائے رکھنے کے لئے موزوں صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اکبر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ وہ غیر تعلیم یافتہ اور ناخواندہ ہے (اور یہ ایسی کمزوری تھی، جو بابر سے لے کر سلطنت مغلیہ میں بہادر شاہ تک کسی میں پائی نہیں گئی) مہمات سلطنت اور توسیع مملکت پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا، جس کی اس کے اندر خداداد صلاحیت اور غیر معمولی لیاقت تھی، وہ مذہبی امور میں دخل نہ دیتا، ایک سیدھے سادھے سلمان اور سپاہی کی طرح مذہبی امور کو علماء اور ذی علم ارکان سلطنت کے حوالہ کرتا، جیسا کہ بابر اور ہمایوں نے (تعلیم یافتہ ہونے اور علمی ادبی ذوق رکھنے کے باوجود) کیا تھا، اور خاص طور پر نازک اعتقادی و کلامی مسائل، مذاہب کے تقابل، اور ماوراء الطبیعاتی (غیبی) حقائق کی تحقیق کے میدان میں قدم نہ رکھتا، جہاں ذرا سی غلطی یا بے احتیاطی سے آدمی کفر و الحاد کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے، اور دین و ایمان کا سرمایہ کھو بیٹھتا ہے، اور جس کے مبادی و مقدمات سے بھی اکبر ناآشنائے محض تھا، اور جو سیاسی مصالح اور ایسے بادشاہ کے مفاد کے بھی خلاف تھا، جس نے چارسو برس کی مسلمان سلطنتوں سے ملک کا چارج لیا تھا، ان نازک اعتقادی اور کلامی مسائل میں دخل دینے اور اس میں سلطنت کے اثر و رسوخ کے استعمال کرنے کی غلطی مامون الرشید (۱۷۰ھ - ۲۱۸ھ) جیسے عالم و ذہین خلیفہ کو بھی راس نہ آئی، اور وہ اس سے کوئی مفید نتیجہ حاصل نہ کر سکا۔[۱]

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول "فتنۂ خلق قرآن" صفحہ ۹۴ تا ۱۰۱

لیکن اکبر نے بے چین طبیعت اور متجسس دماغ پایا تھا، اِدھر اقبال مندی اور مسلسل کامیابیوں اور فتوحات نے اس کو اپنے بارہ میں کسی قدر خوش فہمی اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا، وہ سمجھنے لگا تھا کہ جس طرح وہ سیاسی گتھیوں کو سلجھاتا اور ملکی مسائل کو حل کرتا ہے اسی طرح وہ مذہب و عقائد کی پُرخار وادیوں میں بھی کامیاب تُرکتازیاں کر سکتا ہے۔

دوسری طرف بعض شاطر ارکانِ دربار نے کچھ تو اپنا ذہنی تفوق ظاہر کرنے کے لئے اور کچھ بادشاہ کی تفریح طبع اور رونق مجلس کے لئے بجائے مرغوں اور بٹیروں کی پالیوں اور سانڈوں اور ہاتھیوں کی لڑائی کے (جو مشرقی سلاطین و امراء کی قدیم تفریح تھی) مختلف مذاہب اور فرقوں کے علماء کے دنگل قائم کئے، اور اس کو تحقیق مذہبی اور علمی مباحثہ کا نام دیا، یہ بالکل بدیہی حقیقت ہے (اور مذاہب و افکار کی تاریخ میں اس کا سیکڑوں بار تجربہ ہو چکا ہے) کہ اگر ان مناظروں، علماء، اور مذاہب کے وکلاء کی "بیت بازیوں" کا سننے والا گہرا اور وسیع علم اور دقیقہ رس دماغ نہیں رکھتا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ توفیق الٰہی اس کا ساتھ نہیں دیتی، تو اس کا تشکک و ارتیاب، سوفسطائیت اور لاادریت کی وادی میں بھٹکنا یا الحاد و زندقہ کی عمیق خندق میں گر جانا بالکل قدرتی امر ہے۔

جہانگیر جس کی اکبر کے بارہ میں شہادت سے زیادہ کوئی شہادت معتبر نہیں ہو سکتی، تزک میں لکھتا ہے۔

پدر من در اکثر اوقات با دانایان ہر	والد ماجد اکثر ہر دین و مذہب کے
دین و مذہب صحبت می داشتند،	دانشوروں سے ملاقات کرتے تھے،
خصوصاً با پنڈتاں و دانایان ہندو	خصوصاً ہندستانی فاضلوں اور
بآنکہ اُمّی بودند از کثرت مجالست	پنڈتوں سے، اور اُمّی ہونے کے باوجود

با دانایان و ارباب فضل در گفتگو ہا چناں
ظاہر می شد کہ ہیچ کسے بامی بودن ایشاں
نمی برد و بدقائق نظم و نثر چناں می
رسید کہ مافوقے براں تصور نہ بود۔[1]

کثرت مجالست کے سبب علماء و
فضلا کے ساتھ گفتگو میں کسی کو ان کے
امی و ناخواندہ ہونے کا احساس نہیں
ہوتا تھا، نظم و نثر کی باریکیوں کو اس طرح
سمجھتے تھے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

اسلام ہندو مذہب اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب و فرق ہی کے نمائندوں، وکیلوں ہی پر اس بارہ میں اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ نوبت دانایان فرنگ تک پہونچی، خود ابو الفضل لکھتا ہے کہ "دربار کی طرف سے توریت و انجیل و زبور کے ترجمے اور ان کے مطالب کو بادشاہ تک پہونچانے کا اہتمام کیا گیا، اور اس کے لئے ایک درباری فاضل سید مظفر کو متعین کیا گیا، اور بعض عیسائی اہل سلطنت کو لکھا گیا۔

در اوقات طیبہ با دانایان جمیع ادیان
صحبت داشتہ از کلمات نفیسہ و مقاصد
عالیہ ہر کدام مستفید و مستفیض می شویم
چوں تباین السنۃ و تغایر لغات درمیان
ست لائق آں کہ بارسال ایں طور
کسی کہ آں مطالب عالیہ با حسن عبارت
خاطر نشاں کند مسرور سازند و بسمع ہمایوں
رسیدہ کہ کتب سماوی مثل توریت و

ہم فارغ اوقات میں تمام مذاہب
کے دانشوروں سے ملتے اور ان کے
کلمات پاکیزہ اور بلند خیالات سے
مستفید ہوتے ہیں، زبانوں کی اجنبیت
حائل ہے، اس لئے کسی ایسے شخص کو
بھیج کر مسرور کریں جو ان مطالب
عالیہ کو اچھی عبارت کے ذریعہ
دلنشیں کرے سمع ہمایوں تک یہ بات

[1] تزک جہانگیری ص ۱۵

انجیل و زبور بزبان عربی و فارسی در آوردہ
اند اگر آں کتب مترجم باغیر آں کہ نفع آں عام
و فائدہ آں تام باشد دراں ولایت بودہ
باشد فرستند در نیولا بجہت تاکید مراسم
وداد و تشیید مبانی اتحاد بسیادت مآب
فضائل اکتساب صادق العقیدہ والاخلاص
سید مظفر را کہ بمزید التفات عنایت سرفراز
و مخصوص بودہ فرستادیم نسخہ چند بالمشافہ
خواہد گفت اعتماد نمایند و ہموارہ ابواب
مکاتبات و مراسلات را مفتوح دارند۔[1]

پہنچی ہے کہ کتب سماوی توریت انجیل
و زبور کے ترجمے عربی فارسی میں ہوئے ہیں،
اگر وہ مترجم کتابیں اس ملک میں ہوں تو
افادۂ عام کے لئے انھیں بھیج دیں، رسم
محبت کی تجدید اور بنیاد اتحاد کی پختگی کے
خیال سے ہم نے بسیادت مآب سید مظفر کو
(جو ہماری عنایات سے سرفراز ہیں) ان
تراجم کے چند نسخوں کے لئے بھیجا ہے، وہ آپ سے
بالمشافہ گفتگو کریں گے آپ اُن پر اعتماد
کریں اور برابر خط و کتابت کرتے رہیں۔

ترجمہ کے علاوہ خود عیسائی پادری دربار میں حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنے مذہب کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور عقیدۂ تثلیث اور عیسائیت کو دلائل سے ثابت کیا، ملا صاحب لکھتے ہیں:-

دانایان مرتاض ملک افرنجہ کہ ایشاں
را پادھری و مجتہد ایشاں را پاپا می
گویند انجیل آوردو بر ثالث ثلثہ
دلائل گزرانیدہ و حقیقت نصرانیت
اثبات کردہ۔[2]

دربار میں ملک فرنگ کے مرتاض دانشمندوں کا بھی
ایک گروہ تھا، ان لوگوں کو پادری کہتے ہیں اور
ان کے بڑے مجتہد کا نام پاپا (پوپ) ہے ان لوگوں نے
انجیل پیش کی اور ثالث ثلثہ کے متعلق دلائل
پیش کئے اور نصرانیت کو حق ثابت کیا۔

اکبر کا یہ شوق اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ گوا کے پادریوں کی مجلس کے صدر کو اس نے ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا:

[1] انشائے ابو الفضل ص ۳۹ [2] منتخب التواریخ ۲۶۰/۲

"مجھے امید ہے کہ میرا خط ملتے ہی عزت مآب پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے کچھ پادریوں کو میرے دربار میں بھیجدیں گے تاکہ اپنے علما سے مباحثہ کرا کے میں ان کے علم و اخلاق کا اندازہ کر سکوں اور اپنے علماء پر جنھیں ہم قاضی کہتے ہیں، ان کی فوقیت کا مشاہدہ کر سکوں اور اس طرح وہ انھیں حق کی تعلیم دے سکیں"[1]

مجالس مناظرہ کا پرانا تجربہ ہے کہ کسی مذہب کی صداقت اور اس کی ترجیح کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیشہ دلائل کی قوت اور علمی ثبوت کافی اور فیصلہ کن نہیں ہوتا، اس کا بہت کچھ دارومدار اس مذہب کے وکیلوں اور نمائندوں کی چرب زبانی اور قوت بیانی پر ہے بعض مرتبہ ایک کمزور مذہب کے وکیل زیادہ قادر الکلام خوش بیان، نفسیات انسانی سے واقف اور موقع شناس ہوتے ہیں، وہ سننے والے کو متاثر اور معتقد بنا لیتے ہیں، ایک صحیح مذہب کے ترجمان (کسی وجہ سے) ان خصوصیات سے عاری اور ان کلامی اسلحہ سے خالی ہوتے ہیں، اور وہ اپنے اس نقص کی وجہ سے بازی ہار جاتے ہیں، اس میں بہت شبہ ہے کہ اکبر کے دربار میں اسلام کی نمائندگی اور ترجمانی کرنے والے جو علماء موجود تھے، اور جو اُن دانایانِ فرنگ کے مقابلہ میں کھڑے کئے جاتے تھے، ان کا تورات و انجیل و مذہب عیسوی کا مطالعہ اور اس کی کمزوریوں سے واقفیت اور اسلام کو عقلی و علمی طور پر پیش کرنے کی صلاحیت اس درجہ کی تھی کہ وہ ان کو ان مغربی فضلاء کا مدمقابل بنا سکے اور وہ اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کر سکیں، اس صورتِ حال سے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ان غیر ملکی عیسائی فضلاء کی علمی و عقلی برتری کا نقش قائم ہو گیا ہو اور علمائے اسلام (جو اس میدان کے مرد نہ تھے) اس کی نظر سے گر گئے ہوں۔

اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا، ملا عبد القادر لکھتے ہیں :۔

اہل بدع واہوا بمقتضائے آرائی　　　اہل بدعت اور ہوا پرست اپنی غلط آراء

[1] ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔ مغل سلطنت ص ۳۷۵ DR. ISHWARI PRASAD. THE MUGHAL EMPIRE. (ALLAHABAD, 1974) p. 375.

فاسدہ وشبہات باطلہ ازکمیں برآمدہ باطل را بصورت حق وخطا را بلباس صواب جلوہ دادہ، پادشاہی را کہ جوہری نفیس وطالب حق بود اما عامی محض ومتالف ومتأنس بکفرہ واراذل، در شک انداختہ حیرت بر حیرت افزود ومقصود از میاں رفت، وسد سدید شرع مبین ودین متین شکست وبعد از پنج شش سال خود اثری از اسلام نماند وقضیہ منعکس شد۔[1]

اور باطل شبہات کے سبب کمین گاہوں سے نکل آئے اور باطل کو حق کی صورت میں اور خطا کو صواب کے لباس میں پیش کرنے لگے، اور بادشاہ کو جو جوہر ذاتی رکھتا تھا، اور طالب حق مگر امی محض اور کافروں سے مانوس تھا، شک میں مبتلا کر دیا، اور اس کی حیرت میں اضافہ کر دیا اور مقصد فوت ہو گیا اور شریعت کا بندھ ٹوٹ گیا، اور پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا کوئی اثر نہ رہ گیا اور معاملہ بالکل الٹ گیا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

در ہر رکنے از ارکان دین وعقیدہ از عقیدۂ اسلامیہ چہ در اصول وچہ در فروع مثل نبوت وکلام ورویت وتکلیف وتکوین، وحشر ونشر شبہات گوناگوں بہ تمسخر واستہزاء آوردہ۔[2]

ارکان دین کے ہر رکن اور اسلامی عقائد کے ہر عقیدہ کے متعلق خواہ ان کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے مثلاً نبوت و مسئلہ کلام دیدار الٰہی انسان کا مکلف ہونا، عالم کی تکوین حشر و نشر وغیرہ کے متعلق تمسخر اور ٹھٹھے کے ساتھ طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کئے جانے لگے۔

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۵۵ [2] ایضاً ص ۳۰۷

اس پر طرہ یہ ہوا کہ تفسیر و تاریخ جیسے نازک مضمون جن میں ناخدا ترس اور غیر راسخ العلم لوگوں کو ذہنی انتشار پیدا کرنے کی بڑی گنجائش ہے اس امی بادشاہ کے دربار اور ایک غیر سنجیدہ اور بے باک فضا میں پڑھے جانے لگے۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:۔

ودریں ایام قاضی جلال ودیگراں	انہی دنوں میں قاضی جلال اور دوسرے
را از علماء فرمودند تا تفسیر قرآن مجید	علماء کو حکم ہوا کہ تفسیر قرآن بیان کریں
می گفته باشند، ودرمیان علماء بر سر آں	اور خود علماء کے درمیان اس معاملہ
غوغائی بود و دیب چند مسخرہ راجہ	میں بڑی کشمکش تھی، دیپ چند مسخرہ
منبھولہ می گفت کہ اگر گاؤ نزد حق تعالیٰ	راجہ منجھولہ کہتا تھا کہ اگر حق تعالے
معظم نبودی در اول سورہ قرآنی چرا	کے نزدیک گائے محترم نہ ہوتی تو قرآن
مذکور شدی، وچوں تاریخ خواندہ می شد	کی پہلی سورہ میں کیوں مذکور ہوتی؛ اور
روز بروز اعتقاد از اصحاب فاسد شدن	جب تاریخ پڑھی جانے لگی تو روز بروز صحابہ سے
گرفت وگام فراخ ترنہادند و نماز	لوگوں کا اعتقاد خراب ہونے لگا اور
وروزہ وجمیع نبوات تقلیدیات	اس سے آگے بڑھ کر، نماز روزہ اور تمام نبوی
نام نہادند یعنی غیر معقول ومدار دین	تعلیمات کو تقلیدیات کا نام دینے لگے یعنی
بر عقل گزاشتند نہ نقل، وآمد ورفت	انھیں غیر معقول کہنے لگے اور دین کا
فرنگیاں نیز شد وبعضی اعتقادیات	مدار بجائے نقل کے عقل پر رکھنے لگے،
عقلی ایشاں را فرا گرفتند۔[1]	فرنگیوں کی آمد ورفت بھی ہونے لگی،

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۱۲

چنانچہ ان کے بھی بعض اعتقادات قبول کرلئے۔

اکبر کے تغیر مزاج وانحراف میں علمائے دربار وارکان سلطنت کی ذمہ داری

اکبر کو اسلام کی صراط مستقیم پر قائم رکھنے اور اس کے مزاج کو بے اعتدالی اور انحراف سے بچانے میں علمائے دربار وارکان سلطنت بھی بڑا بنیادی اور مفید کردار ادا کر سکتے تھے، لیکن اس کے لئے ایک طرف ایسے علماء کی ضرورت تھی، جو حکمتِ دین اور "تفقہ" کا جوہر رکھتے ہوں، ان کی نظر جزئیات سے زیادہ کلیات پر ہو، وسائل سے زیادہ مقاصد پر اور "فصل" سے زیادہ "وصل" کی اہمیت وضرورت پر ہو، اخلاق عالیہ سے متصف بے لوث اور بے غرض، جاہ طلبی اور حب دنیا سے امکانی حد تک دور ہوں، اور ان کا کسی درجہ میں "تزکیۂ نفس" ہو چکا ہو، وہ اس عظیم نوخیز اسلامی سلطنت کی اہمیت ونزاکت کو خوب سمجھتے ہوں جو اس غیر مسلم اکثریت سے (جس میں اب بھی اپنے سلطنت واقتدار سے محرومی کا احساس باقی ہے اور جس کے تعاون کے بغیر کوئی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی) گھری ہوئی ہے اور یہ کہ ان کو جس تیموری سلطنت کی خدمت ورہنمائی کا زریں اور تاریخی موقع ملا ہے، وہ اس وقت ترکی کی عثمانی سلطنت کے بعد مملکت کی وسعت، وسائل کی کثرت، انسانی طاقت اور مذہبی جذبہ کی حکمرانی ہر لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی مسلم سلطنت ہے، اس لئے اس کی حفاظت، اس کا اسلام سے رشتہ قائم رکھنے، اس کے سربراہ کو ان نازک حالات میں اس "شیشہ وآہن" اور اس "پنبہ وآتش" کو جمع رکھنے میں مدد دینا وقت کی سب سے بڑی عبادت اور دین وملک کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

دوسری طرف ایسے ارکان سلطنت اور مشیران دربار کا مہیا ہوجانا ضروری تھا،

جو اس دین پر (جس کو بابر نے رانا سانگا (۹۳۳ھ) کے مقابلہ میں میدان جنگ میں منہیات شرعیہ سے توبہ کرکے اور خدا سے بندگی کا عہد استوار کرکے سلطنت کی بنیاد بنادیا تھا[1]) خود بھی مستحکم عقیدہ رکھتے ہوں، اور بادشاہ کے لئے بھی اسی کو پسند کرتے ہوں، وہ ہر قسم کے ذہنی انتشار سے محفوظ اور ان تخریبی اور ملحدانہ تحریکوں سے دور ہوں، جو دسویں صدی میں ایران و ہندوستان میں پیدا ہوگئی تھیں، اور جو سلطنت و معاشرہ کا رابطہ کمزور کرنے والی، اعتقادی و اخلاقی انارکی پھیلانے والی تھیں، ان میں سلطنت کے نظم و نسق اور دستور سازی کی صلاحیت کے ساتھ اخلاقی بلندی، دینی استقامت اور مذہبی پابندی بھی پائی جاتی ہو۔

اگر یہ دونوں عنصر اکبر اور اس کی سلطنت کو میسر آجاتے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سلطنت مشرق میں حمایت اسلام اور خدمت دین کا وہی کردار ادا کرتی جو مغرب میں آل عثمان کی سلطنت نے ادا کیا بقول اقبال ؎

> نہ تھے ترکان عثمانی سے کم ترکان تیموری

لیکن یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ اکبر کو (اس کی اقبال مندی اور خوش نصیبی کے ساتھ) ان دونوں جماعتوں میں سے جو عنصر ملا وہ اتنا ہی نہیں کہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں خدمت کے بجائے بدخدمتی، اکبر کو دین سے قریب کرنے کے بجائے اس کو دین سے دور، متوحش و متنفر بنانے اور ان مخالف اسلام دعوتوں اور تحریکوں سے دور رکھنے یا ان کے استئصال پر آمادہ کرنے کے بجائے اس کو ان دعوتوں اور تحریکوں کا علمبردار بلکہ ان کا رمز و نشان بنانے کی خدمت انجام دینے والے تھے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ۔

علمائے دربار

ہم پہلے عنصر علمائے دربار کو پہلے لیتے ہیں، جن کا اکبر شروع سے غاشیہ بردار رہا تھا، اور جن پر اس نے سب سے زیادہ اعتماد کیا، اور جن کو خود بھی دربار میں سب سے پہلے تقرب حاصل ہوا، اور جو اسلام کے ایک بڑے عالم و مبصر حضرت عبداللہ بن مبارک کی نظر میں تین عناصر فساد میں سے ایک اہم عنصر ہیں ؎

> وهل افسد الدين الا الملوك — واحبار سوء ورهبانها

دین کو سلاطین، علمائے سوء اور زاہدان دنیا دار کے سوا کس نے بگاڑا ہے؟

ہم اس موقع پر بھی ملا عبدالقادر بدایونی کی شہادتیں نقل کرتے ہیں، جو خود ارکانِ دربار میں سے تھے، اور ان کے ان بیانات میں بھی جو انھوں نے ایک تاریخی شہادت کے طور پر خود اپنی جماعت اور رفقاء کے متعلق دیئے ہیں، ان کی کوئی ذاتی غرض اور عناد معلوم نہیں ہوتا، علمائے دربار کی تصویر کشی انھوں نے اس طرح کی ہے:۔

"عبادت خانہ میں ہر شب جمعہ کو سادات و مشائخ اور علماء و امراء کی طلبی ہوتی، آگے پیچھے بیٹھنے میں مشائخ و علماء سے نفسانیت کا اظہار ہوا، ہر ایک دوسرے سے آگے اور ممتاز جگہ بیٹھنا چاہتا تھا، بادشاہ نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ حکم دیا کہ امراء جانب مشرق بیٹھیں، سادات جانب مغرب، علماء جنوب میں، اور مشائخ شمال میں، بادشاہ خود ایک حلقہ میں آتا، اور مسائل کی تحقیق کرتا۔"[1]

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ایک رات علماء بڑے زور زور سے بولنے اور بحث کرنے لگے،

---

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۲

بادشاہ کو اس سے تنغّص پیدا ہوا، اور اس نے اس کو بے تمیزی اور دنیا داری پر محمول کیا۔[۱]

بایک دیگر تیغ زبان کشیدہ در مقام
تنافی و تقابل بودند و اختلاف بجائے
ایں رسید کہ تکفیر و تضلیل ہم دیگر می نمودند،
رگ گردن علماء زمان برآمد، آوازہائے
بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد، ایں معنی
برخاطر اشرف گراں آمدہ۔

باہم دگر تیغ زبان کھینچ کر مدّ مقابل ہوگئے
اختلاف یہاں تک بڑھ گیا کہ ایک
دوسرے کی تکفیر و تضلیل پر اتر آئے
اس وقت کے علماء کی گردنوں کی
رگیں پھولی ہوئیں اور آوازیں بہت
بلند تھیں، اس بات سے خاطر اشرف
پر گرانی ہوئی۔

اکبر نے اس پر آزردہ اور مکدّر ہو کر ملا عبد القادر سے کہا کہ جو عالم اس مجلس میں بدتمیزی کا مظاہرہ کرے اسے وہاں سے اٹھا دیا جائے۔

اعلیٰ دینی عہدہ داروں میں ایک اہم رکن ملا عبد اللہ سلطانپوری تھے[۲] جن کا عہدہ اور خطاب مخدوم الملک تھا، انھوں نے محض اس لئے کہ حج نہ کرنا پڑے فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دیا تھا، زکوٰۃ کے سلسلہ میں بھی حیلۂ شرعی[۳] سے کام لیتے تھے، اور اس کی فرضیت سے بچ جاتے تھے، انھوں نے عہد اکبری اور اپنے عروج کے زمانہ میں اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق ان کے آبائی قبرستان سے برآمد ہوئے، جنھیں مُردوں کے

۱؎ ایضاً ص۲۰۳ ۲؎ یہ سلطان پور مشرقی پنجاب میں جالندھر کے قریب ہے، ان کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵۔

۳؎ یعنی حولان حول ہونے (ایک سال گزر جانے) سے پہلے وہ رقم جس پر زکوٰۃ فرض ہو رہی تھی، اہلیہ یا کسی دوسرے عزیز کو دے دیتے، وہ لینے کے بعد واپس کر دیتا، اس طرح وہ اس سال زکوٰۃ سے بچ جاتے کہ حولان حول کی شرط ہے، آئندہ سال بھی یہی عمل کرتے۔

بہانہ سے انھوں نے دفن کر دیا تھا۔[۱]

مخدوم الملک کے بعد دوسرا درجہ صدر الصدور مولانا عبد النبی کا تھا[۲] جو اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے عالم، اور خاص طور پر فن حدیث کے ماہر سمجھے جاتے تھے، لیکن منتخب التواریخ کی بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا علمی پایہ کچھ بلند نہ تھا، اور عربی کے بعض الفاظ کی تصحیح و تحقیق بھی پورے طور پر نہ تھی،[۳] اکبر نے ان کو صدر الصدور کا عہدہ دیا، اور ان کو ایسا جاہ و جلال اور اختیار و اقتدار حاصل ہوا کہ ان کے سامنے اچھے اچھے ارکان سلطنت کا چراغ نہیں جلتا تھا، بادشاہ نے کئی بار اپنے ہاتھوں سے ان کو جوتے پہنائے، بڑے بڑے علماء شرف باریابی حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں ان کے دروازے پر کھڑے رہتے، سارے ہندوستان کے علماء و مشائخ اور سجادہ نشینوں کو جاگیریں عطا کرنا، معافیاں دینا، اور وظائف جاری کرنا ان کا کام تھا، اور اس میں انھوں نے ایسی دریا دلی سے کام لیا کہ پچھلی سلطنتوں میں بھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

لیکن ملا عبد القادر کے بیان کے مطابق (جو ان کے معاصر دوست اور شریک دربار تھے) معلوم ہوتا ہے کہ وہ علماء کے اعلیٰ اخلاق، اپنے خاندان کی بہترین روایات و خصوصیات بلکہ عام تہذیب اور موقع شناسی سے بھی عاری تھے، ممکن ہے کہ اس اعلیٰ عہدہ نے ان میں یہ تبدیلی

۱؎ ایک روایت ہے کہ ان قبروں سے تین کروڑ روپئے مالیت سونے کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔

۲؎ شیخ عبد النبی شیخ احمد گنگوہی کے صاحبزادہ اور حضرت شاہ عبد القدوس گنگوہی کے پوتے تھے، لیکن علمائے حجاز سے حدیث کی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ان کو اپنے خاندانی مسلک وحدۃ الوجود اور سماع سے اختلاف ہو گیا تھا، اور ان کے تعلقات اپنے والد سے اچھے نہیں رہے تھے، حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵۔ ۳؎ علمائے حجاز بالخصوص علامہ شہاب الدین احمد بن حجر مکی کی جیسے اساتذۂ وقت سے علم حدیث حاصل کرنے اور صاحب تصنیف ہونے کے ساتھ یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ وہ معمولی عربی الفاظ کو غلط (مثلاً جحر کو جس میں پہلے جیم منقوطہ ہے، ہجر جس میں پہلے ہائے مہملہ ہے) پڑھیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پیدا کردی ہو، ان کا اخلاقی اثر بھی بادشاہ و ارکانِ دربار پر اچھا نہیں پڑتا تھا، ملا عبدالقادر ان کو
اپنے عہدہ و رسوخ کا غلط استعمال کرنے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا الزام دیتے ہیں،
وہ لکھتے ہیں کہ "انھوں نے سارے ہندوستان کے مذہبی جاگیرداروں کو دوڑانا شروع کیا، لوگ
شیخ کے وکیلوں ان کے فراشوں و دربانوں، سائیسوں، حلال خوروں (مہتروں) تک کو رشوت
دینے پر مجبور ہو گئے کہ اس کے بغیر کاربرآری نہیں ہوتی تھی"[1]

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دینی احتساب کرنے میں وہ حکمت و موقع و محل کی رعایت
سے بالکل کام نہیں لیتے تھے، اور بعض اوقات خود بادشاہ اس کی زد میں آجاتا تھا، "ماثر الامراء" کی
ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ "اکبر کی ایک سالگرہ کے موقعہ پر امراء، علماء و مشائخ بادشاہ کو
مبارکباد دے رہے تھے، بادشاہ کے بدن پر زعفرانی رنگ کا لباس تھا، شیخ نے اس لباس پر
اعتراض کیا، اور دوسرا لباس پہننے کی تاکید کی، لیکن یہ تاکید اس جوش سے کی کہ ان کے عصا کا
سرا بادشاہ کے لباس شاہی کو جا لگا، بادشاہ نے اس کو برداشت کر لیا لیکن اس کو اپنی سخت
ہتک محسوس ہوئی، اور جب وہ حرم میں گیا تو اپنی والدہ سے شیخ کی شکایت کی، والدہ نے جو
ایک بزرگ خاندان کی بیٹی تھیں بادشاہ کو سمجھایا کہ اس وقت اس کا یہ تحمل تاریخ میں اس کے
مناقب میں لکھا جائے گا کہ ایک عالم نے جو رعیت میں سے تھا، جہاں پناہ کو عصا مارا اور وہ
محض شریعت کے احترام میں خاموش رہا"[2]

اس کے علاوہ مصیبت یہ پیش آئی کہ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی دونوں ایک دوسرے
کے حریف و رقیب ہو گئے، مخدوم الملک شیخ عبدالنبی کو الزام دیتے تھے، اور شیخ عبدالنبی
مخدوم الملک کی تجہیل و تکفیر کرتے تھے، اور ان کے حامی ایک دوسرے کے صف آرا بن جاتے

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۰۵ [2] ماثر الامراء جلد ۲ ص ۵۶۱

تھے، مخدوم الملک اور صدر شیخ عبدالنبی کے حالات سے (اگر وہ بالکل اسی طرح ہیں جو تاریخ
میں آئے ہیں) اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات علم و حکمتِ دینی اور تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس
کسی لحاظ سے اس نازک زمانہ (عہد اکبری) اور اس اہم اور پیچیدہ ماحول (دربار اکبری) میں دین کی
صحیح نمائندگی اور نیابت رسول کے کام کے لئے موزوں نہ تھے، اس کے لئے اگر سلیمان بن عبدالملک
خلیفہ اموی کے مشیر و وزیر رجاء بن حیوۃ اور خلیفہ ہارون رشید کے دینی مشیر و قاضی القضاۃ قاضی
ابویوسف کے درجہ کا عالم و متقی اور فرزانہ و مدبر نہ ہوتا تو کم سے کم عبدالعزیز آصف خاں اور قاضی
شیخ الاسلام[1] جیسے صاحب کمال، عالی دماغ اور زاہد و متقی مشیر سلطنت ہوتے، اکبر کے دربار
میں جیسا کہ آگے آئے گا "ایران و ہندوستان کے جو ذہین و متبحر علمائے معقولی اور ادیب جمع
ہو گئے تھے" ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ان دونوں سے کہیں بہتر صلاحیتوں، دین و شریعت کے
نمائندوں اور سلطنت کے مذہبی محافظوں اور مشیروں کی ضرورت تھی۔

اکبر نے جو (ملا عبدالقادر کے بیان کے مطابق) ان علماء کو جو اس کے عہد کی زینت تھے،
غزالی و رازی سے بہتر سمجھتا تھا جب ان کی یہ سخیف حرکتیں دیکھیں تو علمائے سلف کو بھی انہیں
پر قیاس کر کے سرے سے علماء ہی کا منکر ہو گیا۔

ارکان سلطنت و مشیران دربار

ارکان سلطنت کے بارے میں اکبر کی بدقسمتی علمائے دربار سے کم نہ تھی، علم و ثقافت سے
سادہ لوح ہونے کی بنا پر اس پر سحر زبان آور ذہین و طباع کا جادو چل جاتا تھا، خاص طور پر
جب وہ ولایت (ایران) سے آیا ہو جس کو ہندوستان و افغانستان کے رہنے والے یونان کا

[1] ان دونوں کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو یاد ایام (تاریخ گجرات) از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی مرحوم

درجہ دیتے تھے۔ اسی زمانہ میں جب اکبر کے قدم دین کے میدان میں لڑکھڑا رہے تھے، ایران سے تین بھائی حکیم ابوالفتح گیلانی حکیم ہمایوں (حکیم ہمام) اور نورالدین قراری آئے، اور دربار میں اونچی جگہ پائی، کچھ عرصہ کے بعد ملا یزدی ولایت سے آئے اور صحابۂ کرام کے حق میں بیباکانہ زبانِ طعن کھولی، حکیم ابوالفتح نے قدم آگے بڑھایا اور حقائق دینی (وحی، نبوت، معجزات) وغیرہ کا برملا انکار کیا[1]، اسی عرصہ میں شریف آملی کی ایران سے آمد ہوئی جو (جیسا کہ اوپر کہا گیا) محمود بسیخوانی کے نقش قدم پر تھا، اور ملحدانہ عقائد رکھتا تھا۔

ان ایرانی فضلاء و اہل کمال کے علاوہ اعتقادی تزلزل اور ذہنی انتشار کے اسی دور میں کالپی کا رہنے والا ایک حاضر جواب علم مجلسی میں کمال رکھنے والا اور بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہندو برہم داس نامی دربار میں داخل ہوا اور بہت جلد بادشاہ کے مزاج میں دخیل اور دربار میں کرسی نشیں ہوگیا، اور مصاحب خاص کا اعزاز پاکر راجہ بیربر کے نام سے مشرف و مفتخر ہوا[2]، اس نے ہوا کا رخ دیکھ کر مذہبی معاملات میں اور نازک اسلامی عقائد و مسائل میں بیباکانہ اور استہزائی رویہ اختیار کیا، اور چونکہ یہی "سکۂ رائج الوقت" تھا، اس لئے ہر طرف سے داد پائی، بادشاہ کے مزاج کو دین کے معاملہ میں غیر سنجیدہ بنانے میں اس کو بھی بڑا دخل ہے[3]۔

ملا مبارکؒ اور ان کے فرزند فیضی و ابوالفضل

اس پر طرفہ یہ ہوا کہ دربار میں ملا مبارک ناگوری کی آمد و رفت شروع ہوئی[4]، اور اس کے

---

[1] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۱۱ [2] راجہ بیربل کے اخلاق و کیرکٹر کا اندازہ کرنے کے لئے ملاحظہ ہو دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص ۳۶۲ تا ۳۸۳ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۱۶۱

[4] ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ملا مبارک کے اول مرتبہ دربار میں پہونچنے کو بارھویں سال کے واقعات میں بیان کیا ہے۔

دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو بادشاہ کے مزاج میں ایسا درخور اور دربار میں ایسا اعزاز حاصل ہوا جو اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہوا تھا، ملا مبارک اور ابوالفضل، فیضی تینوں کے حالات کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے عہد کے نہایت ذکی، اعلیٰ علمی استعداد اور تبحر رکھنے والے، علوم عقلیہ و ادبیہ پر حاوی، فارسی کے شاعر و انشاپرداز، غرض یہ کہ اس زمانہ کے نظام تعلیم، طرز تدریس و تحقیق اور رائج و مقبول علوم و فنون کے لحاظ سے لائق فاضل و "دانشمند" تھے، اگر اس تبحر و تفنن علمی ذہن کی درّاکی، طبیعت کی موزونیت اور زبان و قلم کی ہم زبانی کے ساتھ ان باپ بیٹوں میں دین میں استقامت رسوخ فی الدین، خداترسی و آخرت کوشی اور اخلاص و للّٰہیت بھی ہوتا تو وہ اس عہد کی ایسی خدمت انجام دے سکتے تھے اور اس کو وقت کے فتنوں سے محفوظ رکھ سکتے تھے جس کی نظیر ملنی مشکل ہوتی، لیکن ان کے حالات اور خود ابوالفضل و فیضی کی تصنیفات کے مطالعہ سے حسب ذیل حقائق کا علم ہوتا ہے:۔

(۱) ملا مبارک (جو اس مثلث کا نقطۂ آغاز تھے) کی طبیعت میں بے چینی اور دماغ میں فطرتاً شورش تھی، مذاہب اربعہ اور ان کے اختلافات سے واقف ہونے کے بعد ان کے اندر بجائے جمع و تطبیق اور تاویل و توجیہ کے سب سے انکار و بیزاری کا رجحان پیدا ہوگیا، اور وہ اس پورے فقہی ذخیرے اسلاف کی محنت سے بے اعتقاد ہوگئے، ادھر شیراز کے مشہور فاضل معقولات ابوالفضل گازرونی کے حلقہ میں شریک ہوکر ان پر تفلسف کا غلبہ ہوا، بجائے مشائخ و ائمہ فن سے سلوک و تزکیہ میں کسب فیض کرنے اور مکائد شیطان اور امراض نفس سے واقف ہونے کے تصوف و اشراق کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کرکے غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے اور ان سب کوچوں سے گزرنے کے بعد ان کے اندر ایک تلوّن و انتشار پیدا ہوگیا، اور ان میں ہر رنگ میں

رنگ جانے اور ؏ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" پر عمل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی، حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ خواجۂ کلاں جن کی تربیت شیخ مبارک کی بیٹی کے گھر میں ہوئی تھی[1]، ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

در ہر عصر ہم مشرب و مذہب شعار	ہر زمانے کا وہ مروجہ مذہب و مشرب
وقت خودمی ساخت کہ ملوک و امرائے عصر	اپنا لیتے تھے جس سے امراء و ملوک
بداں مذہب رغبت داشتند[2]	بھی رغبت رکھتے تھے۔

سر ولیزلی ہیگ لکھتا ہے کہ "شیخ مبارک مختلف ادوار میں سنی، شیعہ، صوفی اور مہدوی کے علاوہ خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا"[3]

(۲) طبیعت میں حوصلہ مندی اور جاہ طلبی تھی، اس لئے علم و درس کے محدود دائرہ میں محبوس رہنا ان کی مواج طبیعت کو گوارہ نہ ہوا، ان کو سرکار دربار پر اپنے علم و ذہانت کا سکہ بٹھانے کا شوق ہوا، اور وہ اکبر کے سایہ میں (جو سایۂ ہُما کی طرح سمجھا جانے لگا تھا) آگئے اور خود تو نہیں لیکن اپنے دونوں بیٹوں کو دخیل بنا دیا۔

(۳) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمائے زمانہ (اور خاص طور پر مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی جو دربار پر حاوی تھے) نے ان کو وہ مقام نہیں دیا تھا جس کے وہ اپنی ذہانت اور فضیلت کی بنا پر اہل تھے، اور ان کے بعض عقائد و خیالات اور تلون مزاجی کی بنا پر ان کی دینی حلقوں میں مخالفت کی گئی یا ان سے بے اعتنائی برتی گئی، اس کا زخم ان کے دل پر گہرا لگا مولوی محمد حسین آزاد

[1] خواجہ کلاں نے حضرت خواجہ حسام الدین کے گھر میں تربیت پائی تھی، خواجہ حسام الدین کی اہلیہ ملا مبارک کی دوسری بیٹی تھیں (تاریخ ہندوستان جلد ۵ ص ۹۴۷)
[2] مبلغ الرجال ورق ۳۳ الف
[3] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۴ ص ۱۱۴

کے ادیبانہ الفاظ میں "شیخ مبارک نے ان لوگوں کے تیر ستم بھی اتنے کھائے کہ دل چھلنی ہو رہا تھا شیخ (ابو الفضل) اور شیخ کے باپ ملا مبارک نے مخدوم اور صدر وغیرہ کے ہاتھوں برسوں تک زخم کھائے تھے جو عمروں میں بھرنے والے نہ تھے"[1] دوسری جگہ لکھتے ہیں، "شیخ مبارک پر جو مصیبتیں مخدوم کے ہاتھوں گزری تھیں، بیٹوں کو بھولی نہ تھیں، انھوں نے ان کے تدارک کی فکر کی کے اکبر کے کان بھرنے شروع کئے اور اکبر کے خیالات بھی بدلنے لگے"[2] مولوی محمد حسین آزاد، آزاد خیال ہونے کے باوجود خود بھی لکھتے ہیں کہ "فیضی اور ابو الفضل کا معاملہ ان کے باپ کی طرح گومگو رہا"۔

علماء کی اس مخالفت اور زمانہ کی اِس ناانصافی نے اس پورے گھرانہ کے اندر "احساس کہتری" پیدا کر دیا، جو مختلف شکلوں میں اور اکثر اوقات "احساس برتری" کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا ہے، اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کے علم و ذہانت کے سامنے کسی کا چراغ جل نہیں سکتا، اِس کوشش میں اسلام اور پورا دینی نظام زد میں آگیا، یہاں تک کہ جب سب چراغ ان دونوں بھائیوں کے علم و ذہانت کے چراغ کے سامنے گُل یا ماند پڑ چکے تھے، اور اس مملکت میں انھیں کا طوطی بول رہا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی چمن اسلام ان کی آنکھوں کے سامنے جل رہا تھا تو (ملا عبد القادر کے بیان کے مطابق) ابو الفضل کی زبان پر یہ دو شعر تھے، جو بالکل حسب حال تھے ؎

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش	چو خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش	اے وائے من و دست من و دشمن خویش

ملا مبارک کے دو لائق و باکمال فرزند تھے، ابو الفیض فیضی (ولادت ۹۵۴ھ) اور ابو الفضل علامی (ولادت ۹۵۸ھ)۔

[1] دربار اکبری ص ۵۰،۱۴۹
[2] ایضاً ص ۳۸۹

فیضی علوم ادبیہ میں کمال رکھتا تھا، اور اس کی فارسی شاعری اور اس کے استاد ہونے میں دورائیں نہیں، مولانا شبلی نے "شعر العجم" میں صحیح لکھا ہے کہ "فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے جن کو اہل زبان کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا خسرو اور فیضی"۔

"فیضی کو خواجہ حسین مروی سے تلمذ تھا، اور اس نے ہر فن میں کمال پیدا کیا، ۹۷۴ھ ۱۲ جلوس میں وہ دربار میں پہونچا اور شاہانہ نوازش سے بہرہ یاب ہوا فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہیں کی، طبیب تھا مصنف تھا شاعر تھا، اور انھیں مشغلوں میں بسر کرتا تھا شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا، چنانچہ ۱۲ جلوس میں شہزادہ دانیال کی تعلیم و تربیت سپرد ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اس کو ضروری مراتب سکھا دیئے، اس سن میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوی سے مسجد میں جا کر خطبہ پڑھا۔۔ خطبہ فیضی نے لکھا تھا، اکبر نے شیخ عبد النبی کا زور توڑ کر صدارت کے ٹکڑے کر دیئے تھے، چنانچہ ۹۹۰ھ میں آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی، ۹۹۳ھ میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم میں مامور کیا گیا، ۹۹۶ھ میں جو اکبر کی تخت نشینی کا ۳۳ واں سال تھا فیضی کو ملک الشعراء کا خطاب ملا، ۳۶ جلوس مطابق ۹۹۹ھ میں فیضی کو خاندیس کی سفارت پر متعین کیا گیا، اور اس نے بڑی کامیابی سے یہ خدمت انجام دی، صفر ۱۰۰۴ھ ۴۰ جلوس میں انتقال کیا"۔[1]

ادبی تصنیفات، سنسکرت کے تراجم اور منظومات اور دیوان کے علاوہ اس کی سب سے مشہور تصنیف "سواطع الالہام"[2] ہے، جو قرآن مجید کی غیر منقوط تفسیر ہے، دو سال کی مدت

[1] ملخص از شعر العجم حصۂ سوم (ص۲۸-۴۲) [2] فیضی نے یہ تفسیر جس میں اس کی پابندی کی ہے کہ کوئی نقطہ والا (باقی ص۹۷ پر)

میں ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی، اکبر نے اس کے صلہ میں فیضی کو دس ہزار روپے دیئے،[1] فیضی کو اس تصنیف پر ناز تھا، اور اس سے عربی زبان و لغت پر اس کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، بدایونی اختلاف مذہبی کے باوجود اس کے کمال علمی اور تبحر کی شہادت دیتے ہیں، لکھتے ہیں:۔

درفنون جزئیہ از شعر و معمہ و عروض و	فنون جزئیہ یعنی شعر و معمہ، عروض و
قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشاء	قافیہ، تاریخ و لغت، طب و انشاء
عدیل در روزگار نداشت۔	میں یکتائے روزگار تھا۔

کتابوں کا نہایت شائق تھا، ایک گراں مایہ کتب خانہ جمع کیا تھا، جس میں ۴ ہزار ۶ کتابیں تھیں، اور اکثر خود مصنف کی یا اس کے زمانہ کی لکھی ہوئی تھیں۔

ملا عبد القادر بدایونی اور اس زمانہ کے وہ تمام لوگ جن کے دل میں اسلام کی حمیت تھی،

(باقی ص۹۶ کا) حرف نہ آنے پائے اور جس کی اس کے زمانہ اور اس کے زمانہ کے بعد دھوم مچ گئی، اپنی قابلیت کا ثبوت اور اس الزام کی تردید میں لکھی کہ اس کو علوم دینیہ سے اشتغال نہیں ہے، لیکن اس کام سے اس کی عربی زبان پر قدرت کا کتنا ہی اظہار ہو اس میں کوئی علمی و عملی افادیت نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض خطاط چاول پر قل ہو اللہ لکھ کر اپنی باریک نویسی اور خطاطی کا ہنر ظاہر کرتے تھے، اس تکلف کی وجہ سے تحریر میں نمک اور کلام میں کوئی لطف اور رونق نہیں ہے۔

شائد اس سے زیادہ مفید اور قابل قدر علمی کارنامہ وہ قرار پائے گا جو اسی زمانہ کے ایک شامی عالم محمد بدر الدین معروف بابن الغزی الدمشقی (م ۹۸۴ھ) نے انجام دیا، انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر ایک لاکھ اسی ہزار اشعار میں کی، اس کا ایک منظوم خلاصہ بھی تیار کیا، اور اس کو سلیمان اعظم کی خدمت میں پیش کیا، سلطان نے علماء کو دکھایا کہ اس میں کوئی چیز جمہور کے عقیدہ کے خلاف یا تحریف کی تو نہیں ہے، علماء نے اس کی تصدیق و تعریف کی سلطان نے اس پر مصنف کو بڑا انعام دیا، الکواکب السائرہ نجم الدین الغزی، نیز (البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع للعلامہ محمد بن علی الشوکانی الیمنی صاحب نیل الاوطار (م ۱۲۵۰ھ) جزء ثانی ترجمہ محمد بن محمد الغزی ص۲۵۲)

[1] مآثر الامراء جلد ۲ ص۵۸۷

اور عہد اکبری کی اس صورت حال سے سخت مغموم و بیزار تھے، اس بات پر متفق ہیں کہ فیضی بھی اپنے والد کی طرح عقائد میں تزلزل اور ذہنی انتشار میں مبتلا تھا، اور اس کو اکبر کو لامذہب و ملحد بنانے میں خاص دخل ہے، مولانا عبد القادر نے "منتخب التواریخ" میں فیضی کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں سے مبالغہ اور انشاء پردازی کے حصہ کو نکالنے کے بعد بھی اس کی آزاد خیالی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا، مولانا شبلی نے "شعر العجم" میں اس کی طرف سے پورا دفاع کیا ہے، پھر بھی لکھتے ہیں کہ "بایں ہمہ وہ فراخ مشرب اور آزاد خیال تھا، اور جانتا تھا کہ متعصب مولویوں نے مذہب کی جو صورت بنا رکھی ہے، وہ اسلام کی اصل تصویر نہیں، شیعہ سنیوں کے جھگڑوں کو وہ اصل مذہب سے غیر متعلق سمجھتا تھا، ان خانہ جنگیوں کی ہنسی اڑاتا تھا" پھر مولانا نے اس کی عرضداشت کے چند اقتباسات پیش کئے ہیں، جن میں تمسخر اور استہزاء کا انداز ہے[1]، مولانا لکھتے ہیں کہ "فیضی اور ابو الفضل نے علمی مجلسیں قائم کرائیں، جن میں درباریوں کو علانیہ نظر آیا کہ ان متعصبوں کے پاس لعن و تکفیر کے سوا کوئی اوزار نہیں"۔

معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کی زندگی ہی میں اس کے ملحدانہ خیالات کی شہرت ہو گئی تھی، لوگوں نے اس کی وفات کی جو تاریخیں نکالی ہیں، اس سے اسی کا اظہار ہوتا ہے، اس کے انتقال کی روایت بھی بڑی عبرت انگیز ہے[2]۔

ابو الفضل بھی اپنی ذہانت، طباعی اور تفنن علمی میں نوادر روزگار میں سے تھا، اور جس طرح اس کے بڑے بھائی فیضی کو شاعری میں دستگاہ کامل حاصل تھی، وہ تحریر و انشا پردازی میں ید طولیٰ رکھتا تھا، اکبر نامہ جلد سوم ص ۸۳-۸۴ میں وہ لکھتا ہے کہ کمسنی ہی میں اپنی خود بینی اور

---

[1] شعر العجم حصہ سوم ص ۴۹-۵۰ [2] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۴۰۶-۴۰۵ فیضی کے مذہب پر تبصرہ مولوی محمد حسین آزاد کے قلم سے دربار اکبری ص ۴۷۱ پر ملاحظہ ہو۔

خویشتن آرائی ظاہر بینی اور تقلید کے خلاف اس کو جنون پیدا ہو گیا تھا[1]۔

۹۸۱ھ میں وہ آگرہ میں دربار میں باریاب ہوا، اور اس نے آیۃ الکرسی کی تفسیر بادشاہ کو پیش کی پھر ۹۸۲ھ میں سورۃ الفتح کی تفسیر کا ہدیہ گزرانا اس وقت اس کا تقرب برابر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وزارت جلیلہ و وکالت مطلقہ کے منصب پر سرفراز ہوا، اس کا سب سے بڑا کارنامہ "آئین اکبری" ہے، "آئین اکبری" کو تیموری دور کے ملکی، حربی، صنعتی، زراعتی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی، خانگی، علمی اور مذہبی حالات و واقعات کا آئینہ سمجھنا چاہئے، اس کی دوسری مایہ ناز تصنیف "اکبر نامہ" ہے[2]، جو ہندوستان کے تیموری سلاطین کے حالات پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ انشائے ابو الفضل کے نام سے اس کے خطوط کا مجموعہ اور دوسری تصنیفات ہیں، ۱۰۱۱ھ میں جہانگیر کے اشارہ سے بیر سنگھ دیو بنڈیلا نے اس کو قتل کر دیا، اکبر کو اس کا بڑا رنج ہوا اور اس نے آنسو بہائے۔

ڈاکٹر محمد باقر اپنے مضمون "ابو الفضل" مشمولہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لکھتے ہیں:۔

"ابو الفضل نے اکبر کے مذہبی عقائد میں اچھا خاصا دخل پیدا کیا، چنانچہ جب اکبر نے ۹۸۲ھ ۱۵۷۵ء میں فتح پور سیکری میں مذہبی علماء کے مباحثے سننے کے لئے عبادت خانہ قائم کیا، تو ابو الفضل علماء کے ان باہمی مباحثوں میں شریک ہوتا اور ہمیشہ اکبر کے عقائد کی طرفداری کرتا، یہاں تک کہ اس نے اکبر کو یہ سمجھایا کہ مذہب کے متعلق اس کے نظریات معاصر علماء سے کہیں افضل اور برتر ہیں اور ۱۵۷۹ء میں دربار شاہی سے ایک محضر جاری کیا، اس کی رو سے مذہبی علماء کے اختلافات

---

[1] بزم تیموریہ ص ۱۶۳ [2] اکبر نامہ کے متعلق مشہور فرانسیسی فاضل کارا ڈی واکس لکھتا ہے کہ "وہ ایک ایسی علمی دستاویز ہے، جس پر مشرقی تمدن کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے، جن انسانوں کی ذہانتوں نے اس ضخیم کتاب کے ذریعہ اپنا تعارف کرایا ہے، وہ حکومت اور انتظام کے فن میں اپنے زمانہ سے بہت آگے معلوم ہوتے ہیں"۔

CARRA DE VAUX ; LES PENSEURS DE L'ISLAM — PARIS 1921

بتانے کے لئے آخری حکم اکبر کو بنا دیا گیا، عبادت خانہ کے مناظروں کے درمیان ہی میں اکبر کو ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا شوق چرّایا، اور اس نے ۱۵۸۲ء میں دین الٰہی کی بنیاد رکھی اسے ابوالفضل نے بھی قبول کیا۔[1]

یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے ابوالفضل کے ذہن و دماغ کی گہرائیوں میں جھانکنے میں مدد ملتی ہے، اور اسلام کے بارہ میں اس کے نفسیاتی و قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عبادت خانہ میں قرآن اور انجیل کے محاسن پر بحث نے ایک موقعہ پر کافی گرمی پیدا کر دی تھی، کیونکہ دونوں کتابوں کے ماننے والے اس پر مُصر تھے کہ انھیں کا صحیفہ آسمانی ہے، اکبر نے شیخ قطب الدین نامی ایک مجذوب کو بلوا بھیجا، انھوں نے عیسائی پادریوں کو چیلنج کیا کہ آگ جلائی جائے، اور اس میں سے نکل کر اپنے صحیفہ کی حقانیت ثابت کی جائے، بدایونی کے مطابق آگ جلائی گئی، اور شیخ قطب الدین نے عیسائی پادری کا کوٹ پکڑ کر گھسیٹا اور کہا "آؤ، خدا کے نام پر اس میں داخل ہو" لیکن کسی پادری کی ہمت نہ ہوئی کہ اٹھ کر اس میں جلتا۔[2]

ابوالفضل نے اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:۔

"پادری رادلف (RUDOLF) نے جو علم و دانش میں یکتائے روزگار تھا، دانشمندانہ دلائل دیئے لیکن یہ جھوٹ بولنے والے متعصب بے ڈھنگے پن سے اس کا جواب دینے لگے، لیکن ان کے دلائل میں کوئی جان نہیں تھی، اس لئے رادلف کے مخالفین شرمندہ اور خجل ہو کر مباحثہ کا جواب دینے کے بجائے انجیل کو بُرا بھلا کہنے لگے، اس وقت رادلف نے انھیں آگ میں چل کر اپنی حقانیت کا ثبوت پیش کرنے کا چیلنج دیا، لیکن یہ بزدل اور سیاہ قلب ڈر گئے،

۱؎ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱ ص ۸۸۹۔۸۹۰ ۲؎ منتخب التواریخ، جلد دوم ص ۲۹۹

اور چیلنج کے جواب میں اپنے تعصب اور کج بحثی کا مظاہرہ کرنے لگے، ان کی اس بزدلی سے اکبر کے انصاف پسند دل کو صدمہ پہونچا۔"[1]

دربار اکبری میں حاضر ہونے والے اٹلی کے پادری روڈلف اکویا (RUDOLF AQUAVIVA) کے ساتھ ایک اسپینی انطونی مانسریٹ (ANTONY MONSERRATE) اور ایک ایرانی فرانسیس ہنریکیس (FRANCIS HENRIQUEZ) جس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، بھی موجود تھے، مانسریٹ نے دربار اکبری سے متعلق اپنے تاثرات لیٹن زبان میں ایک کتاب (MONGOLICAE LEGATIONIS COMMENTARIUS) کی شکل میں مرتب کئے تھے، ابھی وہ روڈلف کی بزدلی کی مدافعت کرتا ہے لیکن اس کا اقرار کرتا ہے کہ مسلمان عالم کی جانب سے ہی یہ چیلنج کیا گیا تھا، اور روڈلف نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا تھا کہ اس کا مطلب تو خدا کا امتحان لینا ہے، جو عیسائی مذہب کے اصولوں کے خلاف ہے۔[2]

اس قصہ کو جس طرح ابوالفضل نے توڑ مروڑ کر بیان کیا ہے اور جس طرح وہ روڈلف کی حمایت کرتا ہے، اور جو زبان اپنے مخالفین کے لئے استعمال کرتا ہے، اس کی اسلام سے نفرت ظاہر کرنے کے لئے بہت کافی ہے اس کے جیسے ذہین اور طبّاع شخص کے لئے یہ مشکل نہیں تھا کہ بادشاہ کے دل میں شک و شبہ اور بے دینی کی چنگاری اس طرح روشن کر دے جو بھڑک کر اسے اسلام سے ہی منحرف کر دے۔

"مآثر الامراء" میں ہے کہ جنت مکانی یعنی جہانگیر بادشاہ خود لکھتا ہے کہ "شیخ ابوالفضل نے

۱؎ اکبر نامہ جلد سوم ص ۲۵۵ ۲؎ FATHER ANTONY MONSERRATE, MONGOLICAE LEGATIONIS COMMENTARIUS, TRANSL. J. S. HOLLAND AND S. N. BANERJI, OXFORD UNIVERSITY PRESS. 1922, pp. 39-42.

میرے والد کے یہ ذہن نشین کرا دیا تھا، کہ جنابِ ختمی پناہ میں بڑی فصاحت تھی، قرآن انھیں کا کلام ہے، اس لئے جب وہ دکن سے آرہا تھا تو میں نے بیر سنگھ دیو سے کہا کہ وہ اس کو قتل کر دے، اس کے بعد میرے والد اس عقیدہ سے باز آگئے"۔[1]

خود ابوالفضل کی ایک عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے علم و ذہانت سے کام لے کر بادشاہ کی خواہشات کو علمی جامہ پہنانے اور اس کو علمی اسلحہ فراہم کرنے اور اکبر کو فرمانروائے سلطنت کی سطح سے امام زماں اور ہادئ دوراں کے منصبِ رفیع تک پہونچانے میں جو کردار ادا کیا تھا،[2] اس پر اس کا ضمیر مطمئن نہیں تھا، اور وہ کبھی کبھی اپنی زندگی و بیداری کا ثبوت دیتا تھا، وہ اپنے ایک خط میں جو اس نے خانخاناں کو لکھا ہے، اپنے بارہ میں لکھتا ہے:۔

"وشمۂ از آلام و اسقام ایں قصۂ پر غصہ کہ راقم سطور	اس دردناک کہانی کا ایک معمولی المیہ یہ ہے کہ
در ہاویۂ مشاغل لایعنی منہمک شدہ از عبد اللہی	راقم سطور مشاغل لایعنی کے جہنم میں پھنس کر بندۂ
بعید الطبعی در آمدہ در شرف آں شدہ کہ عیاذاً باللہ	خدا کے مرتبہ سے گر کر بندۂ فطرت ہو گیا اور اس کے
از عبد اللہی بعبد الدراہمی والدنانیری موصوف	قریب پہونچ گیا کہ خدا کی بندگی کے بجائے
گردد، در قید عبارت در آوردہ تام زدگی	بندۂ درہم و دینار کہا جانے لگے۔ وہ اس تحریر
خود را ظاہر سازد داند کہ از تردّدات و محاربات	میں اپنا یہ غم ظاہر کر رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا
ناقصانہ بے تو زگانہ کہ در فطرت و طبیعت	میں گزرے ہوئے ان تینتالیس[43] برسوں کی احمقانہ

[1] ص ۱۷۶، سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب لکھتے ہیں کہ "تزک جہانگیری" کے نولکشور ایڈیشن میں تو جہانگیر کا یہ بیان نہیں ہے، لیکن تزک جہانگیری کے اس انگریزی ترجمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، جو میجر ڈیوڈ پرائس نے کیا تھا۔ ص ۵۳-۵۴ (بزم تیموریہ ص ۱۶۶) [2] ابوالفضل اپنی تصنیفات میں اکبر کے لئے امام معصوم، خلیفۃ اللہ، واقف اسرارِ خفی و جلی اور قاسم ارزاق بندگانِ الٰہی کے جیسے مبالغہ آمیز الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ہے، اور ان خوارق و کرامات کی نسبت کرتا ہے جو اس کو مافوق الفطرت انسان ثابت کرتی ہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ مہابھارت فارسی)

دریں سی و چہار سال دنیا خصوصاً دریں دوازدہ	دوڑ دھوپ سے اور خصوصاً اس بارہ سالہ کشمکش
سال کہ در کشمکش ابنائے زماں افتادہ است نہ قدرت	سے جو ابنائے زمانہ کی صحبت میں رہی مجھ میں
شکیب و نہ قوت گریز و نہ طاقت پرہیز دارد	نہ طاقت صبر ہے، نہ قوت گریز و پرہیز میں اس چیز کو
بعبارت در آوردہ اعلام آں استظہار الانامی نماید	قید تحریر میں لا کر اس کا علانیہ اظہار کر رہا ہوں۔

صبرے نہ کہ از عشق بہ پرہیزم من ‏— بختے نہ کہ با دوست در آمیزم من
دستے نہ کہ با قضا آویزم من ‏— پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من[1]

راجپوت رانیوں کا اثر

اکبر کے لئے ایک بڑی آزمائش کی بات اور اسلام سے اس کے مزاج کے منحرف ہونے کا ایک قوی سبب یہ تھا کہ اس نے استحکام سلطنت کے لئے راجپوت راجاؤں کے ساتھ رشتے ناطے کئے[2] اور ان کا اعلیٰ ترین مناصب پر تقرر کیا اور ان کا پورا اعتماد حاصل کرنے اور ان کو شیر و شکر کرنے کے لئے بہت سے ایسے کام کئے جو اس کے پیشرو سلاطین نے ابھی تک نہیں کئے تھے مثلاً ذبح گاؤ کی ممانعت، آفتاب کے رخ بیٹھ کر جھروکا درشن، ڈاڑھی منڈوانا، بھدر کروانا، قشقہ لگوانا، ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر تمام ہندوانہ رسوم میں حصہ لینا، ان ہندو رانیوں کا اور ان کے واسطہ اور رشتہ سے ان کے بھائیوں اور عزیزوں کا اکبر پر خاصا اثر تھا، اور یہ بالکل قدرتی بات تھی، دین کے ایوان میں سب سے پہلا تزلزل جو واقع ہوا وہ اسی تعلق کا نتیجہ تھا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ متھرا کے قاضی عبد الرحیم نے ایک مسجد کی تعمیر کے لئے سامان جمع کیا، لیکن قریب کے ایک برہمن نے راتوں رات وہ سامان اٹھا کر مندر کی تعمیر میں لگا دیا، جب مسلمانوں نے

[1] انشائے ابوالفضل دفتر دوم ص ۱۰۲ (لکھنؤ ۱۸۸۳ء) [2] مثلاً امبیر (جے پور) اور بیکانیر کے راجاؤں کی لڑکیوں سے شادی کی بعض مورخین نے جودھا بائی کا بھی نام لیا ہے، جو دھپور کی رانی تھی مگر اس میں اختلاف ہے۔

اس سے باز پرس کی تو وہ اسلام اور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا، قاضی عبدالرحیم نے شیخ عبدالنبی صدر الصدور کی عدالت میں مرافعہ کیا، شیخ عبدالنبی نے اس کی طلبی کا فرمان جاری کیا، تحقیق سے واقعہ کی تصدیق ہوئی، اور صدر الصدور نے سزائے موت کا حکم جاری کیا، لیکن وہ برہمن، رانی جودھ بائی کا پروہت تھا، رانی اکبر پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ اس برہمن کو سزا سے بچائے، بادشاہ عدالتی کارروائی میں مداخلت، اور صدر الصدور کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا، صدر الصدور نے سزا کا نفاذ کیا، لیکن یہ معاملہ بجائے ختم ہونے کے اور بھی نازک صورت اختیار کر گیا، اور بقول بدایونی :-

"دختران راجہائے عظیم ہند نے بادشاہ کے کان بھرے کہ اس نے ملاؤں کو ایسا سر چڑھالیا کہ وہ منشائے سلطانی کی بھی پروا نہیں کرتے، دربار میں یہ سوال اٹھا کہ مذہب حنفی میں شاتمِ رسول کی سزا موت نہیں ہے اس لئے یہ اقدام اس مذہب کے بھی خلاف ہے جس کا قانون اس ملک میں چلتا ہے۔"

محضرِ اجتہاد و امامت

اس واقعہ نے شیخ مبارک کو یہ موقعہ بھی فراہم کر دیا کہ وہ اکبر کو علمائے اسلام کی پیروی سے پیچھا چھڑانے کا طریقہ بتلا سکے، جب اکبر نے اس معاملہ میں اس کی رائے طلب کی تو اس نے جواب دیا "جہاں پناہ! امام اور مجتہدِ وقت ہیں، انھیں اپنے فرمان کے اجراء میں خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی کسی عالم دین کی مدد کی کیا ضرورت ہے۔؟"[1]

یہی موقعہ تھا جب ملا مبارک نے بادشاہ کی دستگیری کی اور وہ اہم اور تاریخی محضر تیار کیا، جو اکبر اور اس کی مملکت کے رُخ کے پھیرنے میں سنگ بنیاد ثابت ہوا، اور جو ذہنی و تہذیبی ارتداد کے پورے قصر کا صدر دروازہ کہا جا سکتا ہے،[2] اس محضر میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ :-

[1] منتخب التواریخ جلد سوم ص۸۳ [2] اس محضر کا پورا متن منتخب التواریخ جلد ۲ ص۲۷۱-۲۷۲ طبقات اکبری ص۳۴۳-۳۴۴ میں ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۵ میں اس کا پورا عربی ترجمہ ہے۔

"خدا کے نزدیک سلطان عادل کا مرتبہ مجتہد کے مرتبہ سے زیادہ ہے، اور حضرت سلطان کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی سب سے زیادہ عدل والے، عقل والے اور علم والے ہیں، اس بنیاد پر ایسے دینی مسائل میں جن میں مجتہدین باہم اختلاف رکھتے ہیں اگر وہ اپنے ذہن ثاقب اور رائے صائب کی روشنی میں بنی آدم کی آسانیوں کے مدنظر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اسی کو معین کر دیں، اور اس کا فیصلہ کریں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا فیصلہ قطعی اور اجماعی قرار پائے گا، اور رعایا اور برایا کے لئے اس کی پابندی حتمی و ناگزیر ہوگی۔"

یہ محضر نامہ رجب ۹۸۷ھ میں تیار کیا گیا اور اس کا مملکت میں نفاذ ہوا، بادشاہ کے ایماء پر تمام علماء نے اس محضر پر دستخط کئے اور اس کی رو سے بادشاہ امام مجتہد واجب الاطاعت اور خلیفۃ اللہ قرار پایا اور یہی اس سفر کا نقطۂ آغاز ہے جو نہ صرف دین اسلام سے انحراف بلکہ اس سے عناد و اختلاف پر جا کر مکمل ہوا۔

محضر پر ایک نظر

سلاطین وقت اور اصحاب اقتدار کی غیر مشروط تائید و حمایت، ان کی لغزشوں اور بے عنوانیوں کی توجیہ و تاویل اور ان کے احکام جائزہ (اور بعض اوقات اسلام کو صریح طور پر نقصان پہونچانے اور اس کو بدنام کرنے والے) غلط اقدامات اور منصوبوں کے لئے علمی دلائل اور فقہی و کلامی سندیں فراہم کرنے کی نظیروں سے مسلم سلطنتوں کی طویل تاریخ خالی نہیں علمائے وقت سے بارہا لغزشیں اور غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، اور انھوں نے (کسی اختیاری مصلحت یا کسی اضطراری ضرورت کی بناء پر) اپنے منصب و مقام کے خلاف کام کیا ہے، لیکن ایسے شاہانِ وقت کی پُشت پناہی بلکہ دین و شریعت کے خلاف منصوبہ بندی کے سلسلے میں اس محضر کی

جس کو شیخ مبارک نے اکبر کے لئے تیار کیا تھا مشکل سے نظیر ملے گی، اس میں ایک ایسے جواں[1] سال بادشاہ کو مجتہد سے اونچا درجہ دیا گیا ہے، اور اس کو مجتہدین کے اختلافی مسائل میں ترجیح اور انتخاب کا حق عطا کیا گیا ہے، اور اس کو اعدل و اعقل و اعلم باللہ مانا گیا ہے جو ناخواندۂ محض ہے، جس کی طبیعت میں پہلے سے بے قیدی اور حد سے بڑھی ہوئی آزادی ہے، جس کا علمائے اسلام اور شارحین دین و شریعت پر سے اعتقاد و اعتماد اٹھ چکا ہے، اور اپنے گھر اور دربار کے ہندوانہ ماحول سے بشدت متأثر اور تیزی کے ساتھ ہندوانہ خیالات و رسوم و عادات کے اختیار کرنے کی طرف مائل ہے، جو مطلق العنان سلطنت اور کامل اختیارات کا مالک ہے، اس کا فائدہ صرف اہل ہوئی و ہوس کو یا ان درباری علماء کو پہونچتا تھا جو بادشاہ کے نام سے اور اس کے احکام و فرامین کے پردہ میں آزادی و بے قیدی کی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے، شریعت اسلامی کو بازیچۂ اطفال بنانا چاہتے تھے، یا اپنے پرانے دشمنوں یا حریفوں سے انتقام لینے کا خواب دیکھ رہے تھے، شیخ مبارک جیسے ذہین و فطین انسان سے اس اقدام کے عواقب و نتائج مخفی نہیں رہ سکتے تھے اس لئے اس کی توجیہ بڑی مشکل ہے کہ اس محضر کے پیچھے کیا منصوبہ کام کر رہا تھا؟ ایک بالغ نظر مؤرخ جس کی اس طرح کے اقدامات کے نتائج و عواقب پر نظر ہے، آج ملا مبارک کی روح کو مخاطب کر کے کہہ سکتا ہے ؎

فان کنتَ لاتدری، فتلک مصیبۃٌ وان کنتَ تدری، فالمصیبۃُ اعظمُ[2]

مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زوال

اس محضر کے صدور اور ملا مبارک کی علمی پشت پناہی اور اس کے باکمال فرزندوں فیضی اور

---

[1] اس محضر کے صدور کے وقت اکبر کی عمر ۳۸ سال کی تھی۔ [2] اگر تم کو اس طرز عمل کا قدرتی نتیجہ معلوم نہیں تھا، تو یہ ایک افسوسناک بات ہے، اور اگر معلوم تھا، اور تم نے دانستہ یہ کام کیا تو معاملہ اور زیادہ افسوسناک اور حیرت انگیز ہے۔

ابوالفضل کے دربار میں آنے جانے کے بعد مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اور صدر الصدور مولانا عبدالنبی گنگوہی کا زوال شروع ہو گیا، مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کو جو دربار کا یہ رنگ دیکھ کر خانہ نشین ہو گئے تھے، ایک دن زبردستی لایا گیا اور جوتوں کی صف میں بٹھایا گیا[1] مخدوم الملک کو حجاز جانے کا حکم ہوا، ۹۸۷ھ میں وہ حجاز گئے، وہاں کے اکابر علماء نے ان کا بڑا استقبال کیا اور استاذ العلماء شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی مکی بڑی تعظیم سے پیش آئے، مکہ معظمہ میں تقریباً تین سال قیام کر کے وہ ہندوستان واپس ہوئے، لیکن گجرات پہونچے تھے کہ ان کو زہر دے دیا گیا، اور وہیں ۹۹۰ھ یا ۹۹۱ھ میں انھوں نے انتقال کیا، اس بات کے پورے قرائن موجود ہیں کہ زہر خورانی کا یہ عمل اشارۂ سلطانی سے ہوا، خوافی نے "ماثر الامراء" میں اس کی تصریح کی ہے[2]۔

شیخ عبدالنبی نے بھی حجاز کا قصد کیا، کچھ مدت وہاں قیام بھی کیا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنا جاہ و جلال اور عہد رفتہ کی یاد بھولی نہ تھی، وہ ہندوستان آئے اور بادشاہ سے عفو و درگزر کی درخواست کی، ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو حکم دیا کہ ان سے حساب فہمی کرے، راجہ نے ان کو محبوس کر لیا، اور ان سے سخت دارو گیر کی، اسی دارو گیر میں ان کا انتقال ہو گیا، لیکن "ماثر الامراء" میں ہے کہ بادشاہ نے ان کا معاملہ ابوالفضل کے سپرد کیا، اسی نے ان کو گلا گھونٹ کر مار دیا[3]۔

الف ثانی کی تیاری اور دین الٰہی کا اجراء

بادشاہ کو مجتہد مطلق، اور مطاع برحق بنا دینے کے بعد دوسرا قدم یہ تھا کہ ظہور اسلام پر ایک ہزار سال گزر رہے ہیں، اور دوسرے ہزار سال کا آغاز ہو رہا ہے، اس نئے ہزار سال سے

---

[1] منتخب التواریخ حصہ ۳ ص ۷۹-۸۳ [2] "نزہۃ الخواطر" جلد ۴ [3] ایضاً

دنیا کی ایک نئی عمر شروع ہوگی، اس کے لئے ایک نیا دین، ایک نیا آئین، اور ایک نیا شارع اور نیا حاکم چاہئے، اور اس کے لئے اکبر جیسے صاحب تاج ونگیں اور امام عادل اور عاقل سے بڑھ کر کوئی موزوں نہیں، ملا عبد القادر لکھتے ہیں:۔

چوں در زعم خویش مقرر ساختند کہ	بادشاہ کے ذہن میں چونکہ یہ بات
ہزار سال از زمانہ بعثت پیغمبر اسلام	راسخ ہوگئی تھی کہ پیغمبر اسلام کی بعثت
علیہ السلام کہ مدت بقاء ایں دین بود	کی مدت کے ہزار سال پورے ہوچکے
تمام شدو ہیچ مانع برائے اظہار دواعی	جو اس دین کی عمر طبعی ہے اور اب کوئی
خفیہ کہ در دل داشتند نماند۔[1]	مانع ان پوشیدہ دلی تقاضوں کے
	اظہار میں نہیں رہا۔

اس فیصلہ کے بعد وہ تمام تبدیلیاں شروع کر دی گئیں جن سے یہ خیال مملکت میں عام اور پختہ ہو جائے، چنانچہ سکہ پر (جو ہر ایک کے ہاتھ میں جاتا ہے اور جس سے بڑھ کر کوئی اشتہار نہیں) الف کی تاریخ ثبت کر دی گئی،[2] تاریخ عالم میں ایک حد فاصل قائم کرنے کے لئے اور اس کو دو دوروں میں تقسیم کرنے کے لئے تاریخ الفی کے نام سے ایک نئی تاریخ کی تدوین کا کام علماء کے ایک بورڈ کے سپرد ہوا، اس میں سنین میں بجائے ہجرت کے رحلت کا ذکر کیا گیا، لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ:۔

"اس صاحب زماں کا وقت آگیا ہے جو ہندو مسلمان کے بہتر ۷۲ فرقوں کے اختلاف کا مٹانے والا ہوگا اور وہ بادشاہ کی ذات قدسی صفات ہے۔"[3]

اسی سے دین الٰہی اکبر شاہی کا آغاز ہوا، جس میں توحید کے بجائے (عبادت آفتاب کی

[1] منتخب التواریخ ص ۳۰۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۲۷۹

شکل میں) شرک صریح، کواکب پرستی، ایمان بالبعث کے بجائے عقیدۂ تناسخ تھا، اکبر باقاعدہ بیعت لیتا تھا، اس دین میں داخل ہونے والوں سے جو کلمہ پڑھوایا جاتا تھا، اس میں لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ بھی شامل کیا جاتا تھا، کلمہ کے ساتھ ایک اقرار نامہ بھی ہوتا تھا جس میں کہا جاتا تھا کہ:۔

"میں اپنی خواہش اور رغبت و دلی شوق کے ساتھ مجازی و تقلیدی دین اسلام سے جو باپ داداؤں سے سنا اور دیکھا تھا علیحدگی اور جدائی اختیار کرتا ہوں، اور اکبر شاہی دین الٰہی میں داخل ہوتا ہوں، اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں، یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس و عزت، ترک دین کو قبول کرتا ہوں۔"[1]

اس دین میں سود، جوئے اور شراب اور لحم خنزیر کی حلت تھی، اور ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت قانون نکاح میں ترمیمات کی گئی تھیں، پردہ اور رسم ختنہ کی ممانعت تھی، جسم فروشی کے کاروبار کو منظم کر دیا گیا تھا، اور اس کی جگہ مقرر کر دی گئی تھی، اور اس کے لئے قانون بنا دیا گیا تھا، تدفین کے طریقہ میں بھی ترمیم کر دی گئی تھی، غرض ایک مستقل ہندی اکبری دین کی تدوین ہوئی تھی، جس میں فطرت انسانی کے قانون قدیم کے مطابق اس دین اور طریقۂ زندگی کا پلڑا جھکا ہوا تھا جس کی طرف طبعی میلان اور تسکین نفس کا سامان تھا، اور خارجی وملی وسیاسی مصالح اس کی ترجیح کے حق میں تھے۔[2]

[1] منتخب التواریخ ص ۲۷۳ [2] اس رواداری اور صلح کل تحریک یا نئے دین و آئین میں اسلام اور ہندو مذہب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ قائم نہیں رہ سکا، قدرتاً اس مذہب اور فرقہ کا پلڑا جھک گیا جس کا دربار میں رسوخ اور طبیعت میں رجحان تھا، مختصر تاریخ ہند کے مصنفین، ڈبلیو ایچ، مورلینڈ اور اے، سی، چٹرجی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ "اکبر نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے گاؤ کشی بھی بند کر دی تھی، اور اس کے اس حکم کی (باقی صفحہ ۱۱۴ پر)

اکبر کے دینی و مزاجی انحراف و اختلال کا نقطۂ عروج

اکبر کا یہ دینی و مزاجی انحراف و اختلال کس نقطہ تک پہونچ گیا تھا اس کے لئے ہم سب سے پہلے اکبر کے عقل کل اور نفس ناطقہ ابوالفضل علامی کے اقتباسات پیش کریں گے، یہ اس ہمہ گیر تبدیلی اور انحراف کی متفرق کڑیاں ہیں، جو ابوالفضل کے بیانات میں پائی جاتی ہیں، ان کو جمع کر کے اس زنجیر آتشیں کا کچھ تصور کیا جا سکتا ہے، جو اس وقت اسلام کے گلے میں ڈال دی گئی تھی۔ ع

تو خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل

آتش پرستی

گیہان فروز روشن دل، نور دوستی را
ایزد پرستی شمارد، و ستائش الٰہی اندیشد،
نادان تیرہ خاطر داور فراموشی و آذر پرستی
خیال کند۔[1]

جہاں پناہ اپنی روشن ضمیری سے
روشنی کو بیحد عزیز رکھتے ہیں، اور اس کی
تعظیم و تکریم کو خدا پرستی اور ستائش الٰہی
خیال فرماتے ہیں، نادان کور باطن
اس کو خدا فراموشی و آتش پرستی کہتے ہیں۔

(باقی صـ۱ کا) خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں، اکبری قوانین دین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے، اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔

A SHORT HISTORY OF INDIA کا اردو ترجمہ از مولانا محمد یوسف کوکن صـ۲۵۱

[1] آئین اکبری جلد ۱ صـ۲۸ (طبع لکھنؤ ۱۸۸۲ء)

وچوں روشنی بخش جہاں، نور خویش
برگیرد خدمت گزاران سعادت
گرائے در دوازدہ لگن ہائے زریں
وسیمیں کافوری شمعہا افروختہ درپیشگاہ
حضور آورند و یکے از سرایندگان
شیوہ زبان شمع در دست ایزدی سپاس
برگزارد و بگوناگوں نمط سراید و پسیں
دعائے دولت روز افزوں برخواند۔[1]

آفتاب کے غروب ہونے کے بعد خدمت
گزار بارہ کافوری شمعیں روشن کرتے
ہیں، —— اور ہر چراغ چاندی اور
سونے کی لگن میں رکھ کر بادشاہ کے حضور
میں لاتے ہیں اور ان میں سے ایک شیریں
زبان، خوش گلو خادم شمع کو ہاتھ میں لئے
مختلف دلکش سروں میں خدا کی حمد کے
اشعار گاتا ہے اور آخر میں خود جہاں پناہ
کے ازدیاد عمر و دولت کی دعا کرتا ہے۔

آفتاب پرستی

دو آشیانہ منزل ایزد پرستش دریں
نزہت کدہ شود، و نیایش خورشید والا
ازیں جا ایش آغاز باشد۔[2]
می فرمودند خورشید والا را بفرمانروایان
عنایت ست خاص وازیں رو نیایشگری
بدو نمایند والٰہی پرستش برشمردند و
کوتاہ بین در بدگمانی در افتد۔

دو آشیانہ منزل نام کی عمارت میں
ایزد پرستی ہوتی تھی اور یہیں سے آفتاب
کی تعظیم کی ابتدا ہوتی تھی۔
فرماتے ہیں کہ آفتاب کی سلاطین کے
حال پر ایک خاص عنایت ہے اسی
وجہ سے اس کی عبادت خدا کی عبادت
خیال کی جاتی ہے، لیکن کوتاہ بیں شخص

---

[1] ج ۱ صـ۲۹ [2] ج ۱ صـ۳۲

می فرمودند عامہ بخیال نفع چگونہ خواستہ داران (مالداران) سیہ دروں را بزرگ دارند و از نابینائی در احترام این چشمۂ نور کوتہی رود و بر بنیانگر زبان پیغارہ (طعن) برکشایند اگر خرد را آفتے نرسیدہ سورۂ والشمس چرا از یاد رفت۔[1]

بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عوام کس لئے سیہ دل دولتمندوں کی اپنے نفع کی غرض سے عزت کرتے ہیں اور اپنی نابینائی کی وجہ سے اس چشمۂ نور کے احترام میں کوتاہی کرتے ہیں اور عبادت گزار پر طعنہ زنی کرتے ہیں، اگر خود ان کی عقل پر آفت نہ آگئی ہے تو سورۂ والشمس کیوں فراموش کر دی گئی ہے۔

گنگا جل

در سفر و حضر آب گنگ برآشامد و چندے از راستان سعادت گرائے بر ساحل آن باشند باحتیاط برگیرند و کوزہ ہا سر بمہر آید۔

دراں ہنگام کہ مرکب اقبال در دار الخلافت آگرہ و فتحپور بود، از قصبۂ سوروں می آوردند امروز کہ عرصۂ پنجاب بقدوم شاہنشاہی آرامگاہ، از ہردواری آرند

بادشاہ سفر و حضر ہر وقت گنگا کا پانی نوش فرماتے ہیں معتمد ملازمین کا ایک گروہ دریا کے کنارے مامور ہے جو سر بمہر کوزوں میں پانی بھر کر لاتا ہے۔

جب جہاں پناہ آگرہ اور فتحپور میں قیام فرماتے ہیں تو قصبہ سوروں سے پانی لایا جاتا تھا، اس زمانہ میں جب کہ شاہی خیمہ لاہور میں نصب ہے ہردوار

[1] ج ۳ ص ۱۸۴

و در خورش پختن آب جمنا و چناب و آب باراں بجز رود و لختے از گنگا نیز برآمیزند۔[1]

کے عمدہ پانی سے آبدار خانہ سیراب ہے باورچی خانہ میں جمنا اور چناب کا پانی یا آب باراں صرف ہوتا ہے لیکن ان میں تھوڑا پانی گنگا کا ملایا جاتا ہے۔

تصویر کشی

بر قدسی زبان رفت آنکہ برخے نکوہش این پیشہ نمایند دل برنتابد و بخاطر چناں رسد کہ در خداشناسی افزوں تر از بسیارے بود چہ ہرگاہ جانور نگارد و عضو عضو برکشد و از بنکہ روحانی پیوند نیارد داد بہ نیرنگی جاں آفریں گراید و شناسائی اندوزد۔[2]

ایک روز قبلۂ عالم نے خلوت کدے میں جہاں صرف مریدان سعادتمند کا مجمع تھا، فرمایا کہ ایک گروہ فن تصویر کشی کا دشمن ہے اور اس پیشے کے معائب بیان کرتا ہے لیکن اس کے اقوال و دلائل کو دل قبول نہیں کرتا بلکہ قرین قیاس و عقل یہ ہے کہ مصور اکثر طبقات انسانی سے زیادہ خداشناس ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ شخص جانور کی تصویر اتارنے میں اس کے ہر عضو کی شبیہ کھینچتا ہے اور تصویر کو تمام کر کے جب دیکھتا ہے کہ باوجود اس ظاہری سحر نگاری کے وہ اس میں

[1] آئین اکبری ج ۱ ص ۳۳
[2] ج ۱ ص ۷۸

روح پھونکنے سے عاجز ہے تو اس کو
خالق مطلق کی قدرت کاملہ کا اندازہ
ہوتا ہے اور صانع باکمال کے آگے
سر بسجدہ ہو جاتا ہے۔

اوقات عبادت

سحرگاہ کہ دیباچۂ بہروزی و عنفوان نورپاشی است و نیمۂ روز کہ فروغ آفتاب عالمتاب جہاں را در گیرد و سرمایۂ نشاط گوناگوں فروغ آید و شامگاہ با بہ دہ روشنیہا از چشم خاکیاں پنہاں شود[1]۔

صبح جو مبارک دن کا آغاز اور نورپاشی کی ابتدا ہے، دوپہر جبکہ آفتاب عالمتاب کی روشنی تمام عالم کو محیط ہوتی ہے اور لوگوں میں گوناگوں نشاط پیدا ہو جاتا ہے اور شام جبکہ سرچشمہ روشنی (آفتاب) لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

سجدۂ تعظیمی

بندگان ارادت گرائے سجود نیایش افزایند و آنرا سجدۂ ایزدی برشمارند[2]۔

بندگان عقیدتمند سجدۂ تعظیمی کرتے اور اسے سجدۂ ایزدی شمار کرتے ہیں۔

بیعت و ارشاد

جویائے آگہی دستار برکف سر نقدسی

جویائے آگہی ہاتھ میں دستار لے کر

[1] ج ۱ ص ۱۰۵ [2] ج ۱ ص ۱۰۷

پائے برنہد و بزبان حال چناں سراید کہ بیاوری بخت بیدار و رہنمونی ستارہ خودآرائی و خویشتن گزینی کہ بنگاہ گوناگوں گزند بود از سر افگندہ روئے دل بہ نیایش گرمی آوردم[1]۔ الخ

سر کو پائے اقدس پر رکھتا اور زبانِ حال سے اس طرح کہتا ہے کہ بخت بیدار کی یاوری اور ستارۂ خودآرائی و خویشتن گزینی کی رہنمائی میں (جو گوناگوں نقصانات کا سبب تھا) میں دل کی توجہ بادشاہ کی اطاعت کی طرف مبذول کرتا ہوں۔ الخ

آداب ملاقات

ہنگام دیدار ہم یکے اللہ اکبر آید و دیگرے جل جلالہ سراید[2]۔

ملاقات کے وقت ایک آدمی اللہ اکبر کہتا اور دوسرا جل جلالہ کہتا ہے۔

تاریخ ہجری سے تنفر

از دیر باز سرپرآرائے اقبال براں بود کہ در آبادبوم ہندوستان تازہ سال و مہ بروئے کار آید و دشواری باسانی گراید و نیز از تاریخ ہجری کہ از ناکامی آگہی بخشد سرگرانی داشتند لیکن

عرصۂ دراز سے قبلۂ عالم کا ارادہ تھا کہ ملک ہندوستان میں جدید سال و ماہ جاری فرما کر دقتیں رفع کریں اور سہولتیں بہم پہونچائیں جہاں پناہ سنہ ہجری کو بوجہ اس کے کہ وہ ناکامی کی خبر دیتا ہے پسند نہیں فرماتے

[1] ج ۱ ص ۱۱۰ [2] ج ۱ ص ۱۱۰

از انبوہ کوتاہ بینان کارنشناس کہ
روائی تاریخ را ناگزیر دین پندارند،
شاہنشاہ دارا پژوہ پیوند آنہا
گرامی شمردہ اندیشہ بیروں نمی
فرستاد۔[1]

لیکن ناعاقبت اندیش وکم فہم افراد
کی کثرت کی وجہ سے جو تاریخ وسنہ
کے اجراء کو بھی ایک دینی مسئلہ
سمجھتے ہیں، حضرت کی خاطر پرور
طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ اس گروہ
کی دل شکنی فرمائیں اور یہی وجہ تھی کہ
قبلۂ عالم ابتدا میں اپنے خیال کو
عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

غیر اسلامی تہوار اور عیدین

و در لوازم جشن نوروزی و عیدہا
اہتمام نمایند، عید بزرگ نوروز است
کہ ابتدائے آں در وقت تحویل نیّر
نوربخش عالم در برج حمل است
و آغاز ماہ فروردین است عید دیگر
نوزدہم ماہ مذکور کہ روز مشرف است
و عید دیگر سوم ماہ اردی بہشت،
و عید دیگر ششم ماہ خرداد، عید دیگر

جشن نوروز اور عید کے لوازم میں
اہتمام کرتے ہیں، سب سے بڑی
عید نوروز ہے، کیونکہ اس کی ابتدا
اُس وقت ہوتی ہے، جب نیّر
نوربخش عالم (آفتاب) برج حمل
میں داخل ہوتا ہے، اور ماہ فروردین
کا آغاز ہوتا ہے ایک عید اسی مہینے کی
۱۹ تاریخ کو ہوتی ہے جو "شرف" کا دن ہے،

[1] ج ۱ ص ۱۹۳

سیزدہم ماہ تیر است، عید دیگر ہفتم
ماہ مرداد است، عید دیگر چہاردہم
ماہ شہریور است، عید دیگر شانزدہم
ماہ مہر است عید دیگر دہم ماہ آبان است،
عید دیگر نہم ماہ آذر است، و در دی
ماہ سہ عید است ہشتم و پانزدہم و
بست و سوم، عید دیگر دوم ماہ بہمن
است، عید دیگر پنجم ماہ اسفندار است،
و عیدہائے متعارف را بدستور میکردہ
باشد، و شب نوروز و شب شرف
بطریق شب برأت چراغاں کنند و در
اول شبے کہ صباح آں عید باشد
نقارہ نوازند و روزہائے عید بر سر
ہر شہر نقارہ نوازند۔[1]

ایک عید ماہ اردی بہشت کی تیسری تاریخ
کو ایک عید ماہ خرداد کی چھٹی تاریخ کو
ایک عید ماہ تیر کی تیرہ تاریخ کو، ایک
ماہ مرداد کی سترہ تاریخ کو، ایک عید
ماہ شہریور کی چودہ تاریخ کو، ایک عید
ماہ مہر کی سولہ تاریخ کو، ایک عید ماہ
آبان کی دس تاریخ کو اور ایک عید
ماہ آذر کی نو تاریخ کو ہوتی ہے، ماہ دے
میں تین عیدیں ہیں آٹھویں تاریخ کو
پندرھویں تاریخ کو اور تئیس تاریخ کو
ایک عید ماہ بہمن کی دوسری تاریخ کو
اور ایک عید ماہ اسفندار کی پانچویں تاریخ کو
ہوتی ہے، دستور کے مطابق مشہور عیدیں مناتے
ہیں۔ نوروز اور شرف کی راتوں کو شب برأت
کی طرح چراغاں کرتے ہیں، اُس رات کو
جس کی صبح عید ہوتی ہے نقارہ بجواتے ہیں اور
عیدوں کے دنوں میں ہر شہر میں نقارے بجاتے ہیں

ان ایام میں جشن منعقد ہوتا ہے، اور ہر جشن میں انواع و اقسام کی زیب و زینت و

[1] ص ۶۴

آرائش کی جاتی ہے، حاضرین فرطِ مسرت سے بے اختیار ہو کر نعرہ ہائے نشاط بلند کرتے ہیں۔
ہر پہر کے آغاز پر نقارہ نوازی ہوتی ہے اور اربابِ نشاط اپنی نغمہ سرائی اور اپنے ساز
سے ہنگامۂ عیش برپا کرتے ہیں۔

فرمان در منع زکوٰۃ

متصدیان حال و استقبال، و کارفرمایان
کل و جزءِ ممالک محروسہ بدانند کہ دریں
ہنگام سعادت انتظام کہ از ابتدائے
جلوس براورنگ جہاں بانی کہ سنہ
سابع ست از قرن ثانی (دی سال
سی و ہفتم، چہ مراد از قرن دریں جا سی
سال است) و آغاز ابتسام بہار
دولت و اقبال و زمان انکشاف
صبح جلال و جمال است، فرمان
عدالت منشور افاضت بنیان
بازوئے بروز و اشعۂ ظہور یافت کہ
چوں ناموس اکبر و قانون اعظم سلطنت
کہ ابد پیوند الٰہی جل جلال قدسہ
بمقتضائے حکمت بالغۂ ازلی کہ

ملازمانِ حال و استقبال اور ممالک
محروسہ کے کارپردازوں کو معلوم ہونا
چاہئے کہ اس دورِ سعادت میں جس کی
ابتدا اس جلوس سے ہے، اور جو قرن
ثانی کا ساتواں سال ہے (یعنی ۳۷ سنہ
کیونکہ قرن سے یہاں تیس سال مراد
ہیں) اور جو بہارِ دولت و اقبال اور
صبح جلال و جمال کے ظہور کا عہد ہے
یہ فرمان صادر ہوا کہ سلطنت کی
حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ حکومت و
سیاست جو مقیم و مہاجر اور ملازم و
تاجر طبقہ کے مفاد کی حفاظت کا نام
ہے، اور جو خراج کا ایک ذریعہ ہے،
جس پر نظام عساکر کا مدار ہے،

سلسلہ جنبان دار و گیر عالم ایجاد
و تعبیہ پرواز کن فیکون دائرۂ کون و فساد
ست چناں اقتضا کردہ کہ ریاست
ممالک و سیاست مدن کہ عبارت
ست از ارتباط احوال مقیم و مہاجر
و انتساق مصالح کاسب و تاجر
بدستیاری پادشاہان عادل و دیدبانیٔ
شہریاران دریادل جلوہ نما و صورت
پذیر باشد و یکے از وجوہ خراج کہ مدار علیہ
نظام عساکر نصرت و جنود اقبال کہ حارسان
اعمار و اموال، و حافظان عقائد و احوال
خلائق اند باج اشیاست کہ در بازار
بیع و شراء و چار سوئے چوں و چرا در آمدہ
کہ اگر سنجیدہ میزان اعتدال ارباب
صیانت و دیانت کہ نقادان نقود و
اجناس کونی الٰہی و مقومان اعراض انفسی
و آفاقی اند گردد، ہر آئینہ جمیع مصالح
بمفاسد انجامد، تمامی محامد بمذام کشد
للہ الحمد کہ از مبادی احوال نصفت

جو جان و مال اور عقائد کی حفاظت
اور بازاروں کی نگرانی کرتے ہیں،
اگر ان اصحابِ امانت و دیانت
کی میزان غلط ہو جائے جو نقد و جنس
کے پرکھنے والے ہیں، تو تمام
مصالح مفاسد سے اور اچھائیاں
برائیوں سے بدل جائیں، الحمدللہ
کہ شروع ہی سے ما بدولت کی
توجہ رفاہِ عام اور رعایا کی پرورش
کی طرف رہی ہے، جو بادشاہ
کی اولادِ معنوی اور امانت
خداوندی ہیں، المنۃ للہ کہ
ہندوستان اور دیگر ممالک
محروسہ عدل و خوشحالی کا گہوارہ
اور مسافرانِ عالم کی فرودگاہ
ہیں۔

حال ہی میں مراحم خسروانہ
سے یہ حکم صادر ہوا کہ اصناف
غلہ و نباتات، غذائیں اور

اشتمال ہمگی توجہ خاطر عدالت مناظر و تدبیر باطن جلادت مواطن ما در رفاہیت عموم بریت و مراسم تربیت خصوصی رعت کہ فی الحقیقت فرزندان معنوی وودائع خداوندی اند معروف بودہ المنۃ للہ کہ باضاءت لوامع عدالت سواد اعظم ہندوستان ست، ودیگر ممالک محروسہ منہل اصناف ناز و نعیم و مامن مسافران ہفت اقلیم ست، در نیولا بموجب توسعہ مراحم ذاتی و تکملہ مکارم فکری حکم نافذ و امر جازم شرف اصدار و عزت ایراد یافت کہ از اصناف حبوبات و غلات و نباتات از اغذیہ و ادویہ و روغن و نمک و مشک و اقسام عطریات کرپاس و پنبہ و اسباب پشمینہ، وادوات چرمینہ و آلات مسیہ و ظروف چوب و ہمیہ و نے و کاہ و دیگر اشیا و اسباب و امتعہ و اجناس کہ مدار معاش جمہور انام و ملاک معشیت خواص و عوام است سوائے اسپ و فیل و شتر و گوسفند و بز و اسلحہ و

دوائیں، نمک و مشک، اقسام عطریات، کپڑے اور روئی، اسباب پشمینہ، چرمی سامان وتانبہ اور لکڑی کے ظروف، بانس اور گھانس، اور دیگر اشیائ واجناس سے کہ مدار زندگی ہیں، سوائے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، بکری، اسلحہ اور ضروری سامان کے (جو پہلے سے مستثنیٰ ہیں) تمام ممالک محروسہ میں زکوٰۃ اور چھوٹے بڑے تمام ٹیکس معاف کئے جاتے ہیں۔

قماش کہ در تمامی ممالک محروسہ تمغا و باج وزکوٰۃ و صدیک و آنچہ از قلیل و کثیر می گرفتہ اند معاف و مرفوع القلم بودہ باشد۔[1]

ہندو موحد ہیں

روشن شد کہ انچہ زبان زد روزگار است کہ ہندو ایزد بے ہمال را انباز گیر د فروغ راستی ندارد، اگرچہ در برخے مطالب و لختے دلائل جائے آویزش لیکن خدا پرستی و وحدت گزینیٔ ایں طائفہ دلنشین آمد۔[2]

ہم پر روشن ہوا کہ یہ جو بات زبان زد عام ہے کہ ہندو خدائے واحد کا شریک ٹھہراتے ہیں صحیح نہیں، اگرچہ بہت سی باتیں اور دلیلیں قابل اعتراض ہیں، لیکن اس قوم کی وحدت گزینی اور خدا پرستی کا یقین ہے۔

گوشت خوری

می فرمودند اگر دشوار زندگی بخاطر نیامدے مردم را از گوشت خوردن باز داشتمے، و آنکہ خود بیک بارگی نمی گزاریم از آں ست کہ بسیارے کام ناکام

فرماتے ہیں کہ اگر دشوار زندگی میرے ذہن نشین نہ ہو جاتی تو میں انسانوں کے گوشت خوری سے مانع ہوتا اور میں اس لحاظ سے اس پر یکبارگی عمل کرنا

[1] طبقات اکبری ص ۶۷-۶۸ [2] آئین اکبری ج ۳ ص ۲

خواہد گذاشت و بہ تنگنائے غم کالیوہ (دیوانہ) خواہند شد.....

نہیں چاہتا کہ بہت سے کام ناتمام رہ جائیں گے اور انسان اس سخت غم میں دیوانے ہو جائیں گے۔

می فرمودند قصاب و ماہی گیر و مانند آں جز جان شکاری پیشہ ندارند بنگاہ ایناں از دیگر مردم جدا باشد، و از آمیزندہ تاوان گیرند۔[1]

فرماتے ہیں کہ قصاب اور ماہی گیر اور مثل ان کے دیگر اشخاص جن کا پیشہ جان شکنی ہے، ان کی قیام گاہ کو عام آبادی سے علیحدہ کر دیا جائے اور ان سے ملنے والوں سے تاوان وصول کیا جائے۔

خنزیر

می فرمودند اگر سرمایۂ حرمت خوک بے غیرتی باشد بایستے شیر و مانند آن حلال بودے۔[2]

فرماتے ہیں کہ اگر سور کی حرمت کا باعث اس کی بے غیرتی ہے تو لازم ہے کہ شیر یا مثل اس کے دوسرے جانور حلال ہوں۔

شراب نوشی

در جشن ایں ماہ بادۂ ہوش فزامی پیمودند میر صدر جہاں مفتی، میر عدل، میر عبد الحی، نیز ساغرے در کشید گیتی خدیو را ایں بیت بر زبان رفتہ ؎

اس ماہ کے جشن میں بادۂ ہوش افزا نوش فرماتے تھے، میر صدر جہاں مفتی، میر عدل اور میر عبد الحی نے بھی بادہ پیمائی کی اور بادشاہ کی زبان پر یہ شعر آیا ؎

[1] آئین اکبری ج ۳ ص۱۸۹ [2] ایضاً ج ۳ ص۱۸۶

در دور پادشاہ خطا بخش و جرم پوش
قاضی قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش[1]

رسم ہندوانہ

مادر خان اعظم مرزا کوکہ بسخت رنجوری درگذشت و جہاں سالار را غم در گرفت در سوگواری موئے سر و بروت سترد ند ہر چند کوشش رفت کہ جز فرزندان آں مہین بانو، دیگر نسترد بندگان اخلاص سرشت پیروی کردند۔[2]

والدہ خان اعظم مرزا کوکہ سخت بیماری کے سبب چل بسیں اور جہاں پناہ کو ایسا غم ہوا کہ سوگواری میں سر اور مونچھیں منڈوا دیں، ہر چند کوشش ہوئی کہ سوا اس مرحومہ کے بڑے فرزندوں کے کوئی بال نہ منڈائے مگر بندگانِ مخلص نے بادشاہ کی پیروی کی۔

سنین الٰہی کا اجراء

۹۹۲ھ میں شاہنشاہی تنویر عقل و دانش نے علم و کمال کی وہ نورانی شمع جلائی جس نے اپنی بابرکت روشنی سے تمام عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا، خوش نصیب و حق پسند گروہ نے بالین ناکامی سے سر اٹھایا، اور بیہودہ گو، سست رائے افراد نے گوشۂ گمنامی میں منہ چھپایا، قبلۂ عالم کے نیک ارادہ نے عملی جامہ پہنا اور یادگار حکماء میر فتح اللہ شیرازی نے اس کام کو انجام دینے پر کمر ہمت باندھی، علامہ شیرازی نے جدید زیچ گورگانی کو پیش نظر رکھ کر جہاں پناہ کے سال جلوس

[1] آئین اکبری ج ۳ ص۶۰۶ (اردو) [2] اکبر نامہ، ج ۳ ص۸۳۰

کو سنہ الٰہی کی ابتدا قرار دی[1]!

ان بنیادی حقائق کے بعد جن سے اکبر کے دینی فکر کا پورا ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے، اب کوئی حرج نہیں کہ ہم ملا عبدالقادر بدایونی کی دی ہوئی بعض تفصیلات و جزئیات سے اس ڈھانچہ کو اور مکمل و مشکل کر دیں، اور دین اسلام سے انحراف نے اسلام اور صاحبِ شریعت اسلامیہ سے جو بُعد و وحشت بلکہ تنفر و عناد پیدا کر دیا تھا، اس کا صحیح نقشہ بھی لوگوں کے سامنے آسکے۔

دین اسلامی کی تحقیر

ملت اسلام ہمہ نامعقول و حادث و واضع آں فقراء عربان بودند کہ جملہ مفسداں و قطاع الطریق، و آں دو بیت شاہنامہ کہ فردوسی طوسی بطریق نقل آوردہ متمسک می ساختند۔

ملت اسلامی کا سارا سرمایہ حادث و بدعقلی کا مجموعہ ٹھہرایا گیا اور اس کے بنانے والے (العیاذ باللہ) عرب کے وہ چند مفلس بدو قرار پائے جن میں سب کے سب مفسد اور راہزن تھے اور شاہنامۂ فردوسی کے دو مشہور شعروں سے سند پکڑی گئی جو اس نے بطور نقل کہے تھے ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید ست کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو باد بر چرخ گرداں تفو[2]

لہ آئین اکبری ج ۱ ص ۵۲۴ (اردو ترجمہ فدا علی طالب حیدرآباد ۱۹۳۶ء) — ۲ہ منتخب التواریخ ص ۳۰۷

اسراء و معراج کا استہزاء

ایں معنی را عقل چہ گونہ قبول کند کہ شخصے در یک لحظہ با گرانی جسم از خواب بآسماں رود و نود ہزار سخن گو مگوئے با خدائے تعالےٰ کند و بسترش ہنوز گرم باشد، و مردم بآں دعوی بگرایند ہم چنیں شق و قمر و امثال آں۔

آخر اس بات کو عقل کس طرح مان سکتی ہے کہ ایک شخص بھاری جسم رکھنے کے باوجود یکایک نیند سے آسمان پر چلا جاتا ہے اور اللہ کے ساتھ طرح طرح کی نوے ہزار باتیں کرتا ہے، لیکن اس کا بستر اس وقت تک گرم ہی رہتا ہے اور لوگ اس دعویٰ کو مان لیتے ہیں، اور اسی طرح شق القمر وغیرہ جیسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں۔

پھر اپنی اٹھی ہوئی ٹانگ کی طرف حاضرین کو مخاطب کر کے سوال کرتا ہے۔

ممکن نیست کہ تا پائے دیگر بر جا ماند استادہ تو انیم ایں چہ حکایتہاست؟[1]

ناممکن ہے کہ جب تک دوسرا پاؤں زمین سے ٹکا نہ ہو میں کھڑا نہیں ہو سکتا آخر یہ ہیں کیا قصے؟

مقام نبوت کی اہانت

زدن قافلہ قریش در اوائل ہجرت و چہاردہ زن خواستن و تحریم شہد کردن

یعنی اوائل ہجرت میں قریش کے قافلہ کا لوٹنا چودہ[14] عورتوں سے نکاح کرنا

لہ منتخب التواریخ ص ۳۱۷ جلد سوم

برائے خوشنودی زناں[1]

اور بیویوں کی رضامندی کے لئے شہد کو حرام کرنا (ان سے نبوت پر اعتراض کرنا تھا)

اسمائے نبوی سے وحشت وگرانی

نام احمد و محمد و مصطفےٰ و امثال آں بہ جہت کافران بیرونی و زنان اندرونی گراں می آمد تا بہ مرور ایام اسامی چند را از مقرباں کہ بایں نام مسمیٰ بودند تغیر دادہ مثلاً یار محمد محمد خاں را رحمت می خواندند و می نوشتند[2]

احمد و محمد و مصطفےٰ وغیرہ نام بیرونی کافروں کی خاطر سے اور اندرونی عورتوں کی وجہ سے بادشاہ پر گراں گزرنے لگے آخر کچھ دن کے بعد اپنے خاص لوگوں کے نام ـــــ بدل بھی ڈالے مثلاً یار محمد اور محمد خاں کو وہ رحمت ہی کے نام سے پکارتا بھی تھا، اور لکھنے کے وقت بھی ان کو اسی نام سے موسوم کرتا تھا۔

نماز کی عدم اجازت

در دیوان خانہ ہیچ کسے یارائے آں نداشت کہ علانیہ ادائے صلاۃ کند[3]

دیوان خانہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز ادا کرسکے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

نماز و روزہ و حج پیش ازاں ساقط

نماز و روزہ اور حج تو اس سے پہلے

[1] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۰۸ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۱۴ [3] ایضاً ص ۳۱۵ ج ۲

شدہ بود[1]

ہی ساقط ہو چکے تھے۔

ارکان اسلام کی توہین واستہزاء

پسر ملا مبارک شاگرد ابو الفضل رسائل در باب قدح و تمسخر ایں عبادات بہ دلائل نوشتہ و مقبول افتادہ باعث تربیت گشت[2]

ملا مبارک کے ایک بیٹے نے جو ابو الفضل کا شاگرد تھا، اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور تمسخر کے پیرایہ میں چند رسالے تصنیف کئے (شاہی جناب) میں اس کے ان رسالوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس کی سرپرستی کا ذریعہ یہی رسالے بن گئے۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا سنگین اور خطرناک موڑ

غرض یہ کہ اس وقت ہندوستان جس میں دین فطرت کے شجرۂ طیبہ کے نصب اور بار آور کرنے کے لئے چار سو برس تک مسلسل بہترین انسانی توانائیاں، دماغی صلاحیتیں اور اہل قلوب اور اصحاب صفا کی روحانیتیں صرف ہوئی تھیں، ایک ہمہ جہتی، دینی، ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے راستہ پر پڑ رہا تھا جس کی پشت پر اس عہد کی ایک عظیم ترین سلطنت اور فوجی طاقت تھی، جس کو اپنے زمانہ کے متعدد ذہین و فاضل انسانوں کی علمی و ذہنی کمک بھی حاصل تھی، اس وقت اگر حالات کی رفتار یہی رہتی اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوجانے والی

[1] ایضاً ص ۲۵۱ [2] ایضاً

کوئی طاقتور شخصیت یا کوئی انقلاب انگیز واقعہ پیش نہ آتا تو اس ملک کا انجام گیارہویں صدی ہجری میں بظاہر وہی ہوتا جو نویں صدی ہجری میں اسلامی اندلس کا (جس کو دنیا اب صرف اسپین کے نام سے جانتی ہے) یا چودھویں صدی ہجری میں (انقلاب روس کے بعد) ترکستان کا ہوا لیکن۔ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

ہم اس باب کو سیرت نگار نبوی اور مؤرخ اسلام مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اس بلیغ عبارت پر ختم کرتے ہیں جو انھوں نے "ہندوستان کے غربت کدہ میں مسافر اسلام" کی داستان سفر سناتے ہوئے لکھی ہے:۔

"اس غفلت کی نیند پر چار سو برس گزر گئے، اور مسافر کے آغاز سفر پر ہزاروں برس گزر رہا تھا، یہ اکبر کا دور تھا جب عجم کے ایک جادوگر نے آکر بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہوگئی اب وقت ہے کہ ایک شاہنشاہ امی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلاۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دین الہٰی کا ظہور ہو، مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوس بجائے برہمنوں نے بت آراستہ کئے، اور جوگ اور تصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا، اس بے میل تحریک کا جو اثر ہوا اس کی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو "دبستان مذاہب" کا مطالعہ کرے، کتنے زنار داروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلوں میں زنار نظر آئیں گے، بادشاہی آستانہ پر کتنے امیروں کے سر سجدہ میں پڑے اور شہنشاہ کے دربار میں کتنے دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے، اور مسجدوں کے منبر سے یہ صدا سنائی دے گی:۔

تعالیٰ شانہٗ ۔ اللہ اکبر

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی: "راستہ صاف کرو کہ راستہ کا چلنے والا آتا ہے" ایک فاروقی مجدد، فاروقی شان سے ظاہر ہوا، یہ احمد سرہندی تھے"۔[1]

۱؎ مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۳۰۔۳۱

باب سوم

حضرت مجدد الف ثانیؒ

حالات زندگی، از ولادت تا خلافت

خاندان

حضرت مجدد صاحب نسباً فاروقی ہیں[1]، آپ کا سلسلۂ نسب[2] ۳۱ واسطوں سے

۱؎ حضرت مجدد کو حضرت فاروق اعظم سے اس نسبت پر فخر تھا، اور وہ دینی حمیت کو اس کا تقاضا اور قدرتی نتیجہ سمجھتے تھے، جمہور اہل سنت اور عقائد اسلامیہ کے خلاف ایک عارف شیخ عبد الکبیر یمنی کی ایک تحقیق کو سن کر ان کے قلم سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے ہیں "مخدوما! این فقیر را تاب استماع امثال این سخنان نیست بے اختیار رگ فاروقیم در حرکت می آید" مکتوب ۱۰۰ (دفتر اول بنام ملا حسن کشمیری) ایک دوسرے مکتوب میں یہ سن کر کہ قصبہ سامانہ میں خطیب نے خطبہ جمعہ میں خلفائے راشدین کا ذکر عمداً ترک کردیا تحریر فرمایا "چوں استماع این خبر وحشت انگیز در شورش آورد و رگ فاروقیم را حرکت داد، بچند کلمات اقدام نمود" (مکتوب نمبر ۱۵ حصۂ ششم دفتر دوم)

۲؎ سلسلۂ نسب کے بارے میں ہم نے اسی خاندان والا شان کے ذی علم و صاحب تحقیق فرزند مولانا شاہ ابو الحسن زید فاروقی کی اس محققانہ بحث پر اعتماد کیا ہے، جو انھوں نے مجدد صاحب کے سلسلۂ نسب کے بارے میں اپنی تصنیف "مقامات خیر" میں "حضرات آباء و اجداد کرام" کے عنوان سے (ص ۲۶-۳۳ میں) کی ہے، ان کی تحقیق یہ ہے کہ اٹھائیسویں (باقی ص ۱۳۵ پر)

امیر المؤمنین فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

حضرت شیخ احمد (مجدد الف ثانی) بن مخدوم عبدالاحد بن زین العابدین بن عبدالحی بن محمد بن حبیب اللہ بن امام رفیع الدین بن نصیر الدین بن سلیمان بن یوسف بن اسحاق بن عبداللہ بن شعیب بن احمد بن یوسف بن شہاب الدین علی فرخ شاہ بن نورالدین بن نصیر الدین بن محمود بن سلیمان بن مسعود بن عبداللہ الواعظ الاصغر بن عبداللہ الواعظ الاکبر بن ابوالفتح بن اسحاق بن ابراہیم بن ناصر بن عبداللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن حضرت عبداللہ بن حضرت عمر الفاروق رضؓ۔

آپ کے پندرہویں جد شہاب الدین علی فرخ شاہ کابلی، اس سلسلہ کے نامور جد امجد اور مورث اعلیٰ ہیں، ہندوستان کے اکثر باکمال اور شہرۂ آفاق فاروقی النسب فضلاء اور مصلحین مشائخ واصحاب سلسلہ مثلاً حضرت بابا فرید الدین گنج شکر وغیرہ آپ ہی کے سلسلۂ نسب میں ہیں، افسوس ہے کہ افغانستان کے علماء ومشائخ کے حالات میں کسی مبسوط تذکرہ اور کتب طبقات کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے، ان کے جو کچھ حالات ملتے ہیں، ان کا ماخذ وہی کتابیں ہیں جو مجدد صاحب اور ان کے خاندان کے حالات میں لکھی گئی ہیں[1]، موصوف

(باقی ص۱۲۷ کا) واسطہ عمر کے بعد جس کو امیر المؤمنین عمر بن الخطاب سمجھا گیا ہے چار واسطے عام طور سے کتب انساب میں ساقط ہو گئے، اور وہ حفص، عاصم، حضرت عبداللہ اور حضرت عمر الفاروق ہیں، غالباً ستائیسویں واسطہ عبداللہ کے بعد عمر کا نام دیکھ کر مصنفین کو مغالطہ ہوا کہ یہی مشہور عبداللہ بن عمر صحابی بن صحابی ہیں، لیکن چونکہ ان عبداللہ بن عمر کے کسی فرزند کا نام ناصر نہ تھا، اس لئے یہ اشکال پیدا ہوا، اور تحقیق کی ضرورت سمجھی گئی، اس خاندان کے ایک بڑے باخبر محقق بزرگ شاہ محمد حسن مجددی (سائیں داد سندھ) اور محمود احمد صاحب عباسی کی بھی یہی تحقیق ہے اور احمد حسین خاں نے "جواہر معصومی" میں بھی یہی لکھا ہے۔

[1] مثلاً زبدۃ المقامات حضرات القدس وغیرہ۔

شیخ نورالدین کے صاحبزادہ اور شیخ نصیر الدین کے پوتے تھے، اسی لئے ان کے خاندان کو بھی کابل کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے، وہ اوصاف محمودہ سے متصف تھے، اسلام کی اشاعت وترویج اور شعائر کفر وشرک کی اہانت وتذلیل میں خاص امتیاز اور خصوصی ذوق رکھتے تھے[1]۔

والد ماجد کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے اور افغانوں اور مغلوں کے تنازعات ختم کرنے میں انھوں نے سعی محمود فرمائی، دنیاوی وجاہت وسیادت کے ساتھ دولت باطنی سے بھی حصۂ وافر رکھتے تھے، ایک کثیر تعداد نے آپ سے اکتساب فیض کیا، وفات سے پیشتر زمام حکومت صاحبزادۂ والاقدر شیخ یوسف کے حوالہ کر کے ایک درہ میں جو آپ کی نسبت سے درۂ فرخ شاہ کہلاتا ہے، اور کابل سے ساٹھ میل مسافت پر جانب شمال واقع ہے، عزلت وانزوا کی زندگی اختیار کی، اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

شیخ یوسف نے تحصیل علوم ظاہری کے بعد اپنے والد بزرگوار سلطان فرخ شاہ سے تربیت باطنی حاصل کی، اور ان کے ترک سلطنت کے بعد ان کی جانشینی کی، عدل وصلاح اور دینداری میں نیک نام اور مقبول خاص وعام تھے، آپ کے ضمیر میں بھی عشق الٰہی کی وہی چنگاری تھی، جو آپ کے آباء کرام کو وقتاً فوقتاً مولانا روم کے اس شعر پر کاربند ہونے پر آمادہ کرتی رہی تھی ؎

ملکِ دنیا تن پرستاں را حلال
ما غلامِ ملکِ عشق لا یزال

آپ نے بھی آخری عمر میں سلطنت واقتدار سے دست کش ہو کر خلوت گاہ حق کو اختیار کیا، اور ان کے صاحبزادہ شیخ احمد نے سلطنت کا کاروبار سنبھالا، وہ بھی اپنے

---

[1] زبدۃ المقامات ص۸۸، ۸۹

والد ماجد کی طرح صاحب علم وتقویٰ اور لباس شاہی میں درویش صفت بزرگ تھے، آپ پر جذب الٰہی نے ایسا غلبہ کیا کہ سلطنت کو بالکل ہی خیرباد کہا اور اولاد کو بھی اس سے دور رہنے کی وصیت کی، تھوڑا سا اثاثہ اہل وعیال کے لئے رکھ کر باقی تمام مال فقراء میں تقسیم کردیا، آپ نے اپنے والد بزرگوار کے علاوہ شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ سے بھی باطنی استفادہ کیا تھا، اور خلافت سے سرفراز ہوئے تھے۔

ان کے بعد خاندان کے اکابر بھی صاحب فقر وارشاد تھے، اور اپنے اپنے زمانہ کے مقبول وعالی مرتبہ مشائخ سے تربیت سلوک اور فیض باطنی حاصل کرتے رہے، خواہ وہ کسی سلسلۂ عالیہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

امام رفیع الدین جو مجدد صاحب کے جد سادس اور شیخ شہاب الدین علی فرخ شاہ کی نویں پشت میں ہیں، صاحب "زبدۃ المقامات" کے بیان کے مطابق علوم ظاہری وباطنی دونوں کے جامع تھے، تربیت باطنی اور تعلیم سلوک حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت سید جلال الدین بخاری (م ۷۸۵ھ) سے حاصل کی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آٹھویں صدی کے آخر یا نویں صدی کی ابتدا کے بزرگ تھے، اس خاندان کے یہ پہلے بزرگ ہیں جو کابل سے ہندوستان تشریف لائے، اور سرہند کی اقامت اختیار کی جس کا قدیم نام سہرند تھا، یہ جگہ غیر آباد اور جنگلی جانوروں کا مسکن تھی، اور اس کے اور سامانہ کے درمیان جہاں شاہی خزانہ جایا کرتا تھا، کوئی اور بستی نہ تھی، اس بنا پر اس کے نواح واطراف کے رہنے والے باشندوں خصوصاً قریۂ سرالیس کے ساکنوں نے جو وہاں سے ۶، ۷ کوس پر واقع ہے، حضرت مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہوکر (جن سے سلطان فیروز شاہ ارادت وعقیدت رکھتا تھا) التماس کیا کہ دارالحکومت تشریف لے جاکر وہاں شہر آباد کرنے کی تحریک فرمائیں، سلطان نے آپ کی اس خواہش فرمائش

کی تعمیل کی، اور خواجہ فتح اللہ کو جو امام رفیع الدین کے بڑے بھائی اور مقربان سلطانی میں تھے اس پر تعینات فرمایا، اور خواجہ صاحب دو ہزار (۲۰۰۰) سواروں کے ساتھ تشریف لائے، اور قلعہ کی تعمیر فرمائی، حضرت مخدوم جہانیان نے امام رفیع الدین کو جو آپ کے خلیفہ اور امام نماز تھے اور قصبۂ سنام میں مقیم تھے ارشاد فرمایا کہ وہ اس قلعہ کا سنگ بنیاد رکھیں اور اس شہر میں سکونت اختیار کریں کہ وہ وہاں کے صاحب ولایت ہیں، اس وقت سے آپ کا خاندان وہاں سکونت پذیر ہے[1]، قلعہ کی بنیاد اور سرہند کی آبادی کا آغاز ۷۶۰ھ بتایا جاتا ہے[2]۔

اس طرح حضرت مجدد کی ولادت سے دو سو (۲۰۰) برس پہلے سے سرہند آباد چلا آرہا تھا[3]،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "زبدۃ المقامات" ص ۸۹-۹۰

[2] جہاں تک قدیم تاریخ کا تعلق ہے یہ شہر کبھی ضلع ستلج کا صدر مقام تھا، مشہور چینی سیاح ہیون سانگ (HIUN SONG) نے بھی (جس نے ساتویں صدی مسیحی میں ہندوستان کا سفر کیا تھا) اس کا ذکر کیا ہے اور اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ اس کے ارد گرد سونا دستیاب ہوتا ہے، ہندی میں "سہ" شیر کو کہتے ہیں اور "رند" کے معنی ہیں جنگل، ایک زمانہ میں ہندوؤں اور غزنویوں کے لئے یہ سرحد کا کام دیتا تھا، اور اس سے آگے ہند شروع ہوتا تھا، غالباً اس لئے اس کا نام "سرہند" مشہور ہوگیا، جو سہرند کا قریب المخرج ہے ۵۸۶ھ (۱۱۹۰ء) میں سلطان محمد غوری نے سرہند فتح کیا، فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی تک سلاطین دہلی نے سرہند کو چنداں اہمیت نہیں دی، اس کے بجائے سامانہ زیادہ مورد توجہ رہا، فیروز شاہ تغلق کے زمانہ سے سرہند کی طرف از سر نو توجہ شروع ہوئی اس کے بعد سے اہم امرائے سلطنت سرہند وفیروزپور کے ناظم بنتے رہے، فوجی نقطۂ نگاہ سے بھی اس کی اہمیت میں معتدبہ اضافہ ہوا، بابر کئی بار سرہند آیا گیا، ہمایوں بھی سرہند آیا اور یہیں سے وہ دہلی آکر دوبارہ تخت وتاج کا مالک بنا، عہد مغلیہ میں شہر کی خوشحالی اور رونق کا یہ عالم تھا کہ یہاں ۳۶۰ مساجد، سرائے، کنویں اور مقبرے پائے جاتے تھے۔ (ملخص از دائرۃ معارف اسلامیہ مضمون سرہند شریف)

[3] حضرت مجدد نے اپنے وطن سرہند کے متعلق مکتوبات میں بڑے بلند کلمات فرمائے ہیں، اور اس میں خاص نورانیت وسکینت کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو مکتوب ۲۲ مکتوبات دفتر دوم

تذکرہ و تراجم کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں شرفاء و علماء کے خاندان آباد ہو گئے تھے، اور اس خاک سے کئی باکمال پیدا ہوئے[1]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عروج اور اسلامی علوم و فنون سے رشتہ دسویں صدی ہجری کے ابتدا میں قائم ہوا، آٹھویں اور نویں صدی میں حضرت مجدد کے خاندان کے چند برگزیدہ افراد کے علاوہ کسی بڑے سرہندی عالم کا نام کتب تذکرہ و تراجم میں نہیں آتا، لیکن دسویں صدی کے شروع ہونے کے بعد سرہند میں علمی و دینی بیداری اور درس و تدریس کی گرم بازاری نظر آتی ہے، اور متعدد اہلِ کمال اور سربرآوردہ علماء کے نام نظر آتے ہیں، جو مسند درس و ارشاد پر متمکن اور مصروف افادہ و افاضہ تھے، ان میں سب سے پہلے مشہور صاحبِ درس و افادہ مولانا الٰہ داد بن صالح سرہندی (م ۹۲۷ھ) کا نام ملتا ہے، ان کے بعد مولانا شیر علی قادری (م ۹۸۵ھ) اور مولانا علی شیر (م ۹۸۵ھ)[2] مفتی احمد سرہندی، (م ۹۸۶ھ) الحاج ابراہیم سرہندی تلمیذ علامہ شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی (م ۹۹۴ھ) مولانا عبد اللہ نیازی مہدوی[3] (م ۱۰۰۰ھ) اور چند ان فضلاء کے نام نظر آتے ہیں، جن کا سن وفات معلوم نہیں مثلاً مشہور استاذ زمانہ مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوری کے استاد مولانا عبد القادر مولانا عبد الصمد حسینی مرید شیخ علی عاشقاں جونپوری، مولانا امان اللہ، مولانا قطب الدین اور مولانا مجد الدین، آخر الذکر کے متعلق مولانا یعقوب کشمیری استاد حضرت مجدد کی شہادت ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے متبحر عالم تھے، بابر سے سرہند میں ان کی ملاقات ہوئی اور بابر نے ان کا بڑا اعزاز کیا مولانا میر علی اور مولانا بدر الدین سرہندی بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں[4]۔

---

[1] تاریخ و تراجم کی کتابوں میں صرف تاریخ مبارک شاہی کے مصنف یحییٰ بن احمد کا نام ملتا ہے، جو نویں صدی کے مصنفین میں ہیں، انھوں نے تاریخ مبارک شاہی ۸۳۸ھ کے حدود میں لکھی، وہ اپنے آپ کو اسیہرندی لکھا کرتے تھے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

[2] ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی شخصیت ہوں، "گلزار ابرار" و "نزہۃ الخواطر" میں دونوں کا نام معکوس ترتیب سے آیا ہے۔

[3] کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آخر عمر میں مہدوی عقیدہ سے رجوع کر لیا تھا۔

[4] یہ نام "نزہۃ الخواطر" جلد چہارم سے التقاط کئے گئے ہیں، کتاب میں ان کے حالات دیکھے جا سکتے ہیں۔

حضرت مخدوم شیخ عبد الاحد

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے "زبدۃ المقامات" میں حضرت مخدوم شیخ عبد الاحد کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، چونکہ حضرت خواجہ حضرت مجدد کی خدمت میں مسلسل تین سال حاضر رہے، اور ان کی معلومات کا زیادہ تر ماخذ وہ اقوال اور ارشادات ہیں جو انھوں نے حضرت مجدد کی زبان سے وقتاً فوقتاً سنے، ان میں اگر کوئی اضافہ ہے تو صاحبزادگان والاشان سے حاصل کئے ہوئے معلومات کا ہے، اس لئے ان کے بیان کو ہر طرح مستند اور بالواسطہ حضرت مجدد کے ارشادات کا مجموعہ سمجھنا چاہئے، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ عبد الاحد پر عنفوان شباب اور اثنائے تحصیل علم میں طلب مولیٰ اور حصول علم الیقین کا ایسا غلبہ ہوا کہ تکمیل علوم کا انتظار کئے بغیر اس عہد کے شہرۂ آفاق چشتی (صابری) شیخ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو گئے، اور ان سے ذکر و اذکار کی تلقین اور سلوک کی تعلیم حاصل کی، جب حضرت شیخ...... کے آستانہ پر پڑ رہنے۔ ع

یا جاں رسد بجاناں، یا جاں زتن برآید

کے شوق و عزم کا اظہار کیا، تو پیر روشن ضمیر نے اس کو منظور نہ فرمایا اور علوم دین و شریعت کی تحصیل و تکمیل کی تاکید کی، اور فرمایا کہ "علم کے بغیر جو درویشی ہوتی ہے، اس میں کچھ آب و نمک نہیں ہوتا" مخدوم نے حضرت شیخ کی کبرسنی کا لحاظ کرتے ہوئے عرض کیا کہ مجھے شبہ ہے کہ علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد جب اس آستانہ پر حاضر ہوں گا تو یہ دولت جاوید پاؤں گا یا نہ پاؤں گا؟[1] شیخ نے فرمایا کہ اگر مجھے نہ پاؤ تو میرے فرزند رکن الدین سے وہ دولت حاصل کر لینا، مخدوم نے

---

[1] اشارہ تھا حضرت شیخ کے دنیا سے رحلت فرما جانے کی طرف۔

تعمیل ارشاد کی اور تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔

تقدیری بات کہ آپ کو جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا، اور فراغت سے پہلے شیخ نے رخت سفر باندھ لیا، مخدوم نے علوم مروجہ کی تکمیل کرنے کے بعد کچھ دن مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی اور وہاں کے بزرگوں سے استفادہ کیا، پھر حضرت شیخ رکن الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے منازل سلوک طے کئے اور چشتی و قادری سلسلہ میں خرقۂ خلافت اور تلقین و تربیت کی اجازت سے سرفراز ہوئے[1]۔

ان دو بزرگوں شیخ عبدالقدوس اور شیخ رکن الدین پر وحدۃ الوجود، غلبت و بیخودی، سکر و شورش اور استغراق کا غلبہ تھا، اور وہ صاحب وجد و سماع تھے، خاص طور پر شیخ عبدالقدوس وحدۃ الوجود کے اظہار و اعلان پر اپنے کو مامور سمجھتے تھے، اور اس کے پر جوش داعی و مبلغ تھے با ایں ہمہ اتباع سنت اور عمل بالعزیمت میں قدم راسخ رکھتے تھے، نیستی و بے نفسی کا غلبہ تھا، نہایت رقیق القلب کثیر العبادت بزرگ تھے، موت کو ہمیشہ یاد کرتے تھے، اور خاتمہ کی فکر غالب رہتی تھی[2]۔

اپنے پیر بیعت شیخ عبدالقدوس اور شیخ رکن الدین کے علاوہ مخدوم شیخ عبدالاحد کا قادری سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ کمال کیتھلی سے بھی ربط خاص تھا، حضرت شاہ کمال اپنے زمانہ کے بڑے باکمال اور صاحب حال بزرگ تھے[3]۔

شیخ عبدالاحد کا یہ قول گزر چکا ہے کہ "نظر کشفی سے کام لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] شیخ رکن الدین نے آپ کو جو خلافت نامہ دیا وہ "زبدۃ المقامات" میں من و عن درج ہے ص ۹۲-۹۶ اس کا بڑا حصہ عربی میں ہے۔ [2] کمالات اور اذواق و مواجید کے لئے ملاحظہ ہو لطائف قدوسی تالیف شیخ رکن الدین فرزند حضرت شیخ و "زبدۃ المقامات" از خواجہ محمد ہاشم کشمی، ص ۹۷-۱۰۱ و نزہۃ الخواطر ج ۴۔

[3] ان کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۴۔

سلسلۂ علیہ قادریہ میں بانی سلسلہ پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے بعد اس مرتبہ کا آدمی کم تر نظر آتا ہے" ان کے پوتے شاہ سکندر بھی بڑے عالی مرتبت شیخ تھے اور حضرت مخدوم نے ان سے بھی استفادہ کیا۔

حضرت مخدوم جب اکتساب علوم سے فارغ ہوئے تو مردان خدا کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر کیا، سفر کرتے وقت عزم کیا کہ جہاں بدعت کے آثار نظر آئیں گے، وہاں ارادت تو درکنار صحبت سے بھی پرہیز کریں گے، اس سفر میں شیخ الہ داد کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے، رہتاس میں شیخ الہ داد اور مولانا محمد بن فخر صاحب "توضیح الحواشی" سے بھی ملاقات کی اور ان کے درس میں شریک ہوئے، بنگالہ بھی تشریف لے گئے، اور جونپور بھی چند دن حضرت سید علی قوام (علی عاشقاں) کی خدمت میں رہے اس سفر سے واپس سرہند تشریف لائے پھر سفر آخرت تک یہیں مقیم رہے اور کہیں کا سفر نہیں کیا، معقولات اور منقولات کی کتب متداولہ بڑی پابندی سے اور بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ پڑھاتے تھے، حضرت مجدد صاحب فرماتے تھے کہ تمام علوم میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، لیکن فقہ و اصول فقہ میں ان کی نظیر نہیں تھی، جب "اصول بزدوی" کا درس دیتے تھے، تو امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں علو شان اور ان کی جلالت و امامت عیاں و نمایاں ہو جاتی تھی، کتب تصوف کا بھی درس دیتے تھے، خاص طور پر "تعرف"، "عوارف المعارف" اور "فصوص الحکم" کے مطالب اور دقیق مضامین کو حل کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، تحقیقاً و ذوقاً بھی شیخ اکبر کے مشرب پر تھے، لیکن خداداد عالی ظرفی اور ضبط و احترام شریعت کی وجہ سے کبھی زبان سے سکر و شطحیات کی کوئی بات نہ نکلتی، بے نفسی اور تفرید کا بڑا غلبہ تھا، تلامذہ کی کثرت کے باوجود کبھی کسی سے خدمت نہ لیتے گھر کی ضرورت کی چیزیں خود بازار سے لاتے، اتباع سنت کا بڑا اہتمام تھا حتی الامکان کوئی سنت فروگذاشت نہ ہوتی، امور عادیہ،

لباس و پوشاک میں بھی اتباعِ سنت کا اہتمام کرتے، عزیمت پر عمل کرتے اور رخصت سے اجتناب، اگرچہ بیعت و خلافت سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ میں تھی اور ان طرق میں نسبت عالی رکھتے تھے، لیکن آپ کے اخلاص اور عالی ہمتی کی دلیل یہ ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا بڑا اشتیاق ظاہر کرتے تھے، اور اس کے متعلق بڑے بلند کلمات فرماتے تھے مثلاً اس کی دعا کرتا ہوں کہ یہ سلسلۂ عالیہ ہمارے ملک میں پہونچے، یا خدا ہمیں اس کے مرکز میں پہونچا دے کہ اس سے استفادہ کیا جاسکے، صاحب تصنیف بھی تھے، "کنوز الحقائق" اور "اسرار التشہد" آپ کی تصنیفات میں سے ہیں[1]۔

حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا والد ماجد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اہل بیت کرام کی محبت کو ایمان کی حفاظت اور حسن خاتمہ میں بڑا دخل ہے، جب والد صاحب کو سکرات شروع ہوئے تو میں نے آپ کو یاد دلایا، فرمایا الحمد للہ والمنۃ کہ میں اس محبت میں سرشار اور اس دریائے احسان میں غرق ہوں ؎

الٰہی بحق بنی فاطمہ

کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ[2]

اثنائے سفر میں جب سکندرہ[3] کے مقام پر پہونچے اور وہاں کچھ دن قیام کیا تو وہاں آپ کی شرافت و نجابت اور صلاح و تقویٰ اور علم و عمل کی جامعیت دیکھ کر ایک شریف خاندان نے

[1] خواجہ محمد ہاشم کشمی نے "زبدۃ المقامات" میں "اسرار التشہد" کے کچھ مضامین نقل کئے ہیں، صہ ۱۱۰-۱۲۰ حضرت مجدد کی زبانی حضرت مخدوم کے بعض فوائد اور تحقیقات بھی نقل کئے ہیں صہ ۱۲۰-۱۲۲

[2] زبدۃ المقامات صہ ۱۲۳ [3] صاحب زبدۃ المقامات نے اس کو اٹاوہ کے قریب بتایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ صوبہ اتر پردیش میں واقع تھا۔

خود رشتہ کی پیش کش کی اور اس خاندان کی ایک نیک سیرت صالحہ خاتون سے آپ کا عقد کر دیا، حضرت مخدوم کی سب اولاد انہی سے ہوئی۔

حضرت مخدوم کو اللہ تعالےٰ نے ان کے مرشد ہی کی طرح سات فرزند عطا فرمائے تھے جن کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں، شاہ محمد، شیخ محمد مسعود، شیخ غلام محمد[1]، شیخ مودود[1] دو بھائیوں کے نام اور کچھ تفصیل معلوم نہ ہو سکی، ان میں واسطۃ العقد حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ تھے، بقیہ فرزند بھی صاحبِ علم اور صاحب استعداد تھے، اور انھوں نے بھی علوم رسمیہ اور سلوک کی تعلیم اپنے والد یا مشائخ عصر سے حاصل کی تھی۔

حضرت مخدوم نے اسّی سال کی عمر میں، ۱۷ رجب ۱۰۰۷ھ کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی[2]، قبر مبارک شہر سرہند سے مغربی جانب تقریباً ایک میل پر واقع ہے[3]۔

حضرت مخدوم کی سیرت کا جوہر خاص حق پسندی، انصاف، شریعت و سنت کی تعظیم و احترام اور ان پر عمل کرنے کی کوشش و اہتمام، حمیت دینی اور ترقیاتِ باطنی میں عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کہا جاسکتا ہے، اور یہی جوہر ان کے لخت جگر کے ضمیر میں (جس کے لئے دین کی تجدید اور ہندوستان میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کی سعادت مقدر ہو چکی تھی) ودیعت ہوا تھا، جس کو فضل ربانی نے چمکا کر اور دوسرے وہبی کمالات عطا فرما کر آفتابِ عالمتاب بنا دیا۔

[1] شیخ غلام محمد اور شیخ مودود کے نام حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات ہیں۔ (ملاحظہ ہو جلد اول)

[2] زبدۃ المقامات صہ ۱۲۲ بعض حضرات نے تاریخ وفات ۱۷ رجب اور بعض نے ۲ رجمادی الآخرہ لکھی ہے ۱۰۰۷ھ پر سب کا اتفاق ہے۔ [3] زبدۃ المقامات صہ ۱۲۲

ولادت وحالات

ولادت و تعلیم

شبِ جمعہ ۱۴؍شوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء کو شہر سرہند میں آپ کی ولادت ہوئی، شیخ احمد نام رکھا گیا، لفظ "خاشع" سے سن ولادت نکلتا ہے، صغر سنی ہی سے آپ میں رشد وسعادت کے آثار نمایاں تھے ؎

بالائے سرش زہوش مندی

می تافت ستارۂ بلندی

صلحائے وقت بالخصوص حضرت شاہ کمال کیتھلی کی (جن سے والد بزرگوار کو نسبت باطنی تھی) آپ کی طرف خاص توجہ اور شفقت تھی، اور وہ آپ کے ساتھ خصوصی معاملہ فرماتے تھے[1] آپ کی عمر سات سال کی تھی کہ شیخ کمال نے رحلت کی آپ کو ان کا حلیۂ مبارک یاد تھا، اور جس گھر میں والد صاحب کے ساتھ جا کر زیارت کی تھی، اس کا نقشہ بھی ذہن میں موجود تھا۔

تعلیم کی ابتدا حفظ قرآن سے ہوئی، اور تھوڑی ہی مدت میں آپ نے اس کی تکمیل کر لی، پھر والد ماجد کی خدمت میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے ذہن خداداد کے جوہر کھلنے لگے، دقیق مضامین کے جلد اخذ کر لینے اور ان کو اپنے الفاظ میں سلجھے طریقہ پر پیش کرنے میں آپ کا امتیاز ظاہر ہوا، بیشتر علوم کی والد بزرگوار سے اور چند کی

ل تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، زبدۃ المقامات ص۱۲۷-۱۲۸

اپنے عہد کے بعض علمائے کبار سے تحصیل کی، کچھ عرصہ کے بعد سیالکوٹ جو اس زمانہ کا بڑا علمی و تعلیمی مرکز تھا تشریف لے گئے اور مولانا کمال کشمیری سے جن کو منطق و فلسفہ، علم کلام و اصول فقہ میں کمال حاصل تھا، اور جن کی ذکاوت و حافظہ، کثرت مطالعہ اور قوت تدریس کا شہرہ تھا[1]، اور جن کے شاگردوں میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی جیسے سرآمد روزگار علماء اور مدرسین پیدا ہوئے اس وقت کے نصاب تعلیم کی بعض انتہائی اور اعلیٰ کتابیں (مثلاً عضدی) پڑھیں، حدیث کی بعض کتابیں شیخ یعقوب صرفی کشمیری سے پڑھیں، جو حدیث میں مسند وقت شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیتمی مکی کے شاگرد تھے، اور جن کی تصنیفات میں صحیح بخاری کی بھی ایک شرح ہے[2]۔

شیخ یعقوب کو بڑے بڑے محدثین اور مصنفین سے کتب حدیث و تفسیر اور ان کی تالیفات کی اجازت حاصل تھی، آپ نے اپنے زمانہ کے مشہور عالمِ ربانی قاضی بہلول بدخشانی سے جو علم حدیث و تفسیر میں پایہ بلند رکھتے تھے، اور حدیث میں شیخ وقت عبدالرحمٰن بن فہد کے تلمیذ رشید تھے، صحیح بخاری، مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی اور دوسری کتب حدیث ثلاثیات بخاری اور حدیث مسلسل کی سند حاصل کی، نیز متقدمین کے دستور کے مطابق کتب تفسیر وغیرہ

ل مولانا کمال الدین بن موسیٰ ۹۷۱ھ میں کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہوئے اور تقریباً نصف صدی درس و تدریس میں مصروف رہ کر ۱۰۱۷ھ میں لاہور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص۳۱۶)

ﮯ مولانا یعقوب بن الحسن الصرفی کشمیری کی ۹۰۸ھ میں کشمیر میں ولادت ہوئی، تحصیل علم اور حصول طریقہ کے لئے سمرقند کا سفر کیا، جہاں شیخ حسین خوارزمی سے طریقہ کبرویہ حاصل کیا، اور ایک عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے، حجاز جا کر علم حدیث حاصل کیا اور وہاں سے فقہ، حدیث و تفسیر کی نفیس کتابیں اپنے ساتھ لائے، ۱۲؍ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ میں ان کی وفات ہوئی (نزہۃ الخواطر ج ۵ ص۴۳۹) اس طرح اپنے استاذ مولانا یعقوب کے ذریعہ حضرت مجدد کو صحاح کے مطالعہ اور امہات کتب حدیث سے متعارف ہونے کا موقع ملا ہوگا۔

کی سند بھی ان کے مصنفین تک پہونچائی[1] سترہ سال کی عمر میں آپ فارغ التحصیل ہو گئے۔

آپ جب علوم عقلیہ و نقلیہ اور اصول و فروع سے فارغ ہوئے تو درس و تدریس کے کام کا آغاز کیا، اور عربی و فارسی میں کچھ رسائل بھی لکھے جن میں "رسالۂ تہلیلیہ" "رسالہ ردِ مذہب شیعہ" شامل ہے آپ دارالحکومت اکبرآباد (آگرہ) بھی گئے، وہاں ابوالفضل و فیضی سے صحبتیں رہیں، لیکن اختلاف ذوق و مسلک کی وجہ سے ان سے مناسبت نہ ہوئی بعض مرتبہ کچھ ردّ و کد کی بھی نوبت آئی اور ابوالفضل کے بعض بے باکانہ الفاظ پر ناگواری کا اظہار فرمایا، اور آمد و رفت موقوف کر دی، ابوالفضل نے آدمی بھیج کر بلوایا اور معذرت کی، ایک مرتبہ فیضی کو جو اُس زمانہ میں تفسیر غیر منقوط (سواطع الالہام) لکھنے میں مصروف تھے ایک جگہ مناسب (غیر منقوط) لفظ ملنے میں اور مطلب کے ادا کرنے میں دقت پیش آئی اور قلم رک گیا، حضرت مجدد سے انھوں نے تذکرہ کیا آپ نے مشکل کشائی فرمائی اور فیضی کو آپ کے طبع رسا اور وفورِ علم کا اعتراف کرنا پڑا۔

آگرہ میں آپ کا قیام کچھ طویل ہو گیا، والد ماجد کو شوق ملاقات ہوا، باوجود کبرسنی اور بُعد مسافت کے آگرہ تشریف لے گئے، حضرت مجدد نے والد ماجد کے ساتھ وطن مراجعت فرمائی، دہلی و سرہند کے درمیان جب شہر تھانیسر سے گزر ہوا تو شیخ سلطان جو وہاں کے رؤسائ وعمائد اور اسی کے ساتھ علماء و فضلائے وقت میں تھے اور ان کو تقرب سلطانی بھی حاصل تھا، اور اس وقت علاقۂ تھانیسر کے حاکم تھے، اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آئے، اور اپنے یہاں مہمان رکھا اور ایک اشارۂ غیبی کی بنا پر اور حضرت مجدد کے اخلاق و خصوصیات کو دیکھ کر ان سے نسبت مصاہرت قائم کرنے کی خواہش کی، والد صاحب نے اس رشتہ کو منظور فرمایا اور وہیں عقد مسنون انجام پایا، اور آپ بہو کو رخصت کر کے سرہند تشریف لائے۔

[1] حدیث مسلسل اور دوسری اسانید "زبدۃ المقامات" میں موجود ہیں۔

سلوک کی تربیت و تکمیل اور حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت و استفادہ

اس موقع پر تصوف و سلوک کی ضرورت اور اس کے شرعی و علمی ثبوت پر خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں کہ "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ کے (جس کا یہ چوتھا حصہ ہے) قارئین کو اس کی پہلی جلد کے مطالعہ ہی سے جس میں حضرت خواجہ حسن بصری، سیدنا عبدالقادر جیلانی اور مولانا جلال الدین رومی کے تذکرے موجود ہیں، اور تیسری جلد تو سراسر ہندوستان کے مشائخ کبار ہی کے تذکرہ پر مشتمل ہے اس مضمون سے واسطہ پڑ چکا ہے، اگر اس سلسلہ میں مزید تشفی اور اطمینان کی ضرورت ہو تو مصنف کی کتاب "تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک" کا مطالعہ کیا جائے۔

یہاں صرف اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس ماحول اور عہد میں حضرت مجدد کو اپنا نازک و دشوار تجدیدی اور اصلاحی کارنامہ انجام دینا تھا، اس میں تصوف اسلامی معاشرہ اور ماحول میں اس طرح گھُل مل گیا تھا کہ وہ اس کا مزاج و مذاق بن گیا تھا، خواص تو خواص عوام بھی کسی عالم، معلّم یا مصلح کے اُس وقت تک قائل، اس کے عقیدت کیش اور اس کے خطاب و تفہیم سے منتفع نہیں ہوتے تھے، جب تک کہ وہ تصوف و سلوک کے کوچہ سے آشنا اور کسی مقبول و مستند سلسلہ سے وابستہ اور مشائخ کا صحبت یافتہ نہ ہو، یوں بھی کسی نہ کسی درجہ میں تزکیۂ نفس، اخلاص و یقین اور درد و سوز کے بغیر (جو عموماً کثرت ذکر و صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا) محض وفورِ علم اور زورِ تقریر سے کوئی حقیقی انقلاب برپا نہیں ہوتا، غرض یہ کہ اس عہد و ماحول میں تصوف و سلوک اور قوت روحانی اور نورِ باطنی کے بغیر اصلاح و انقلاب کی کوشش کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہتھیاروں اور سپہ گری کے مشق و تربیت کے بغیر کوئی شخص میدان جنگ میں اتر آئے، اور کسی تربیت یافتہ اور مسلح فوج کا مقابلہ کرے، یا کوئی ایسا شخص جو قوتِ گویائی

سے فطرتاً محروم ہو، تعلیم و تفہیم کا کام انجام دینا چاہے، یہ عین حکمت و تدبیر الٰہی کا تقاضا تھا کہ اس میدان اصلاح و انقلاب میں اترنے سے پہلے اللہ تعالےٰ نے حضرت شیخ احمد السرہندی کو تصوف و سلوک کا نہ صرف رمز آشنا اور محرم راز بنایا بلکہ اہل کمال و تکمیل کی صحبت و تربیت سے پھر موہبت ربّانی اور اجتبائے خاص سے ان کو اس میں درجۂ امامت و اجتہاد تک پہونچایا تاکہ وہ اس کار عظیم کو پوری تیاری اور پورے اعتماد کے ساتھ انجام دیں اور اس کا اثر دنیا کے دور دراز گوشوں اور بعد کی صدیوں تک قائم رہے، "ذٰلك تقدیر العزیز العلیم"

سرہند پہونچ کر آپ والد ماجد کی حیات تک اُنہی کی خدمت میں رہے، ان سے بیش بہا فوائد باطنی حاصل کئے اور سلسلۂ چشتیہ و قادریہ کا سلوک طے کیا، اسی کے ساتھ علوم ظاہری کی تعلیم کا مشغلہ بھی جاری تھا۔

اس زمانہ میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کے شوق نے غلبہ کیا اور وہاں کی کشش نے مضطرب و بے آرام بنا دیا، لیکن چونکہ والد ماجد کبیر السن تھے، اور بظاہر ان کی رحلت کا زمانہ قریب تھا، اس لئے ایسی حالت میں ان کو چھوڑ کر جانا مناسب نہ معلوم ہوا جب ۱۰۰۷ھ میں ان کا واقعۂ ارتحال پیش آگیا تو اب آپ کو کوئی مانع نہ رہا اور ۱۰۰۸ھ میں آپ نے حرمین شریفین کی حاضری اور ادائے حج بیت اللہ کے لئے رخت سفر باندھ لیا، اور سرہند سے کوچ کر کے دہلی پہونچ گئے، وہاں کے علماء و فضلاء جن کے کانوں تک آپ کا آوازۂ فضل و کمال پہونچ چکا تھا، ملاقات کے لئے آئے، ان میں مولانا حسن کشمیری بھی تھے، جن سے حضرت کا پرانا تعارف تھا، انھوں نے دوران گفتگو حضرت خواجہ باقی اللہ کے علوم رتبہ، اور قوتِ باطنی کا تذکرہ کیا جن کا کچھ ہی عرصہ پہلے دہلی میں ورود ہوا تھا حضرت مجدد اپنے والد ماجد سے سلسلۂ نقشبندیہ کا ذکر اور اس کا اشتیاق سن چکے تھے، اس لئے آپ کو بھی ملاقات کا شوق ہوا، اور اس کو حرمین شریفین کی

حاضری کی تیاری اور اس کی ایک سوغات سمجھ کر حاضری کا قصد فرما لیا، اور مولانا حسن کشمیری[۱] کی معیت میں وہاں حاضر ہو گئے، اس وقت ہاتف غیب نے صدا دی ہو گی۔ ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم!

قبل اس کے کہ اس "قران السعدین" کا حال بیان کیا جائے اور اس کے بعد کے واقعات لکھے جائیں، حضرت خواجہ کا تعارف کرا دینا ضروری ہے[۲]، اس سلسلۂ میں ہم وہ مضمون نقل کرتے ہیں جو مصنفِ "نزہۃ الخواطر" نے (جلد پنجم) حضرت خواجہ قدس سرہ کے تذکرہ میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ "ما قلّ ودلّ" کا مصداق ہے، اور اس میں مستند کتابوں اور تذکروں کا لُبّ لباب آگیا ہے۔

حضرت شیخ عبدالباقی نقشبندی دہلوی (خواجہ باقی باللہ)

شیخ اجل، قطب الاقطاب، امام الأئمہ رضی الدین ابو المؤید عبدالباقی بن عبدالسلام بدخشی مشہور بہ باقی باللہ کابلی ثم دہلوی، آپ کا وجود دنیا کے لئے باعث برکت و زینت، آپ کی حیات طیبہ مقصدِ آفرینش و غایت خلق کا مظہر[۳]، آپ کی زبان حقیقت ترجمان، اور آپ کی ذات خلاصۂ عرفان تھی، علم و معرفت میں اللہ کی کھلی نشانی، اور ولایت و روحانیت کے منارۂ نورانی،

---

[۱] حضرت مجدد مدۃ العمر ان کے احسان مند اور شکر گزار رہے کہ ان کے ذریعہ آپ کو یہ دولتِ جاوید حاصل ہوئی ملاحظہ ہو مکتوب ۲۷۹ دفتر اول۔ [۲] سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کبار بالخصوص بانی سلسلہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کے حالات اور سلسلہ کی خصوصیات اور نسبت خاصہ کی اجمالی واقفیت کے لئے اسی سلسلہ کے گلِ سرسبد حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات بالخصوص "الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" اور "ہمعات" کا مطالعہ کیا جائے۔

[۳] یعنی آیت "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" (میں نے جن و انس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں) کی عملی تفسیر اور روشن تصویر۔

۹۷۱ھ کے حدود میں کابل میں پیدا ہوئے اور مولانا محمد صادق حلوائی سے تلمذ اختیار کیا اور ان کے ساتھ ماوراء النہر کا سفر کیا اور ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے، پھر ان کے دل میں طریقۂ صوفیہ میں داخل ہونے کا داعیہ پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں آپ نے رسمی علوم کی تحصیل چھوڑ دی اور بلاد ماوراء النہر کے بہت سے مشائخ کبار کی مجلسوں میں حاضر ہوتے رہے، آپ نے سب سے پہلے شیخ خواجہ عبید خلیفہ مولانا لطف اللہ خلیفۂ مخدوم اعظم دہبیدی کے دست حق پرست پر توبہ کی، مگر جب آثار استقامت ظاہر نہ ہوئے تو شیخ افتخار کی سمرقند آمد کے موقع پر ان کے ہاتھ پر دوبارہ توبہ کی جو شیخ احمد یسوی کے سلسلہ کے بزرگ تھے، جب دوبارہ اپنی عزیمت واستقامت میں کمی محسوس کی تو اضطراری حالت میں امیر عبد اللہ بلخی کے ہاتھ پر تیسری بار توبہ کی، اور کچھ عرصہ حفظِ حدود کے پابند رہے، مگر آخری بار یہ توبہ بھی ٹوٹ گئی، اِسی عرصہ میں ان کو خواب میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی زیارت ہوئی اور اہل اللہ کے طریقہ کی طرف رجحان پیدا ہوا، جہاں آپ کے لئے ممکن ہوتا وہاں جاتے رہتے تھے، یہاں تک کہ کشمیر میں شیخ بابا کبروی کی خدمت میں پہونچے اور ان سے مستفید ہوئے، ان کی صحبت میں ان ربانی فیوض کی بارش ہوئی اور اس سلسلہ کی معروف غیبت وفنائیت کے آثار ظاہر ہوئے، شیخ مذکور کی وفات کے بعد آپ شہروں میں پھرتے رہے، اور سیاحت واستفادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی روح نے ظاہر ہو کر آپ کو نقشبندی طریقہ کی تعلیم دی اور آپ کی تکمیل ہو گئی، اس کے بعد ماوراء النہر گئے، جہاں شیخ محمد امکنگی سے ملاقات ہوئی جنھوں نے تین دن کے بعد اجازت ورخصت عطا کی، جس کے بعد آپ ہندوستان واپس ہوئے، اور لاہور میں ایک سال ٹھہرے جہاں بہت سے علماء نے آپ سے استفادہ کیا، پھر وہاں سے ہندوستان کے دار السلطنت دہلی تشریف لائے اور قلعۂ فیروزی میں قیام فرمایا، جس میں ایک بڑی نہر اور ایک بڑی مسجد تھی، آپ وہاں اپنی وفات

تک مقیم رہے۔

آپ اعلیٰ درجہ کے صاحبِ وجد وذوق، نہایت متواضع ومنکسر مزاج تھے اغیار اور نامحرموں سے اپنے احوال رفیعہ کو چھپانے کی کوشش کرتے اور اپنے کو مقام ارشاد کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، اور اگر کوئی آپ کے پاس باطنی استفادہ کے لئے حاضر ہوتا تو آپ اس سے فرماتے کہ میرے پاس تو کچھ نہیں اس لئے آپ کسی اور بزرگ سے رجوع کریں اور اگر آپ کو کوئی شخصیت مل جائے تو مجھے بھی خبر کر دیں، غرض آپ ادعا سے دور رہ کر آنے والوں کی خدمت وتالیفِ قلب میں مشغول رہتے تھے، اور کسی ضرورت یا دقیق مسئلہ کی وضاحت ہی کے لئے لب کشائی کرتے اور مخاطب کی رہنمائی کے لئے مسئلہ کی پوری وضاحت فرماتے تھے، اپنے احباب کو قیام تعظیمی سے منع فرماتے اور اپنے کو انھیں جیسا سمجھتے تھے، اور تمام حالات میں ان سے مساوات کا معاملہ فرماتے تھے، تواضع ومسکنت کے خیال سے ننگی زمین پر بھی بیٹھ جاتے تھے۔

آپ کو عجیب وغریب کیفیت روحانی اور قوت تاثیر حاصل تھی، جس پر آپ کی نظر پڑ جاتی اس کے حالات بدل جاتے اور پہلی ہی صحبت میں اُسے ذوق وشوق اور اہل معرفت کی روحانی کیفیات حاصل ہو جاتیں اور پہلی ہی توجہ وتلقین میں طالبین کا قلب جاری ہو جاتا تھا، آپ کا فیض اور مخلوق پر شفقت سب کے لئے اس قدر عام تھی کہ سخت جاڑے کی ایک رات میں آپ کسی کام سے بستر سے اٹھ کر گئے اور جب واپس ہوئے تو اپنے لحاف میں ایک بلی کو سوتا دیکھ کر اسے جگانے اور ہٹانے کے بجائے صبح تک بیٹھے رہے، اِسی طرح آپ کے قیام لاہور کے زمانہ میں قحط پڑا تو اس عرصہ میں آپ نے کچھ نہیں کھایا، آپ کے پاس جو کھانا آتا اسے محتاجوں میں تقسیم کر دیتے تھے، لاہور سے دہلی جاتے ہوئے راستہ میں ایک معذور شخص کو دیکھ کر سواری سے اتر پڑے اور اُسے سوار کر کے اور پہچاننے والوں سے بچنے کے لئے

چہرہ چھپائے ہوئے اس کی منزل مقصود تک پیدل گئے اور پھر سوار ہوئے، غلطی کے اعتراف اور اپنے کو خطا کار سمجھنے میں کوئی تأمل نہ کرتے تھے اور اپنے اصحاب ہی سے نہیں بلکہ عوام سے بھی اپنے کو ممتاز نہیں سمجھتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے پڑوس میں رہنے والا ایک نوجوان ہر قسم کی برائیوں کا ارتکاب کرتا تھا، مگر باخبر ہونے کے باوجود آپ اسے برداشت کرتے رہے، کسی موقع پر ان کے مرید خواجہ حسام الدین دہلوی نے حکام سے اس کی شکایت کی اور انھوں نے اسے پکڑ کر بند کر دیا، جب شیخ کو معلوم ہوا تو وہ اپنے ان مرید پر ناراض ہوئے اور ان سے باز پرس کی، انھوں نے عرض کیا "حضرت وہ بڑا ہی فاسق ہے" اس پر آپ نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا کہ جی ہاں! آپ لوگ اہل صلاح و تقویٰ تھے، اس لئے آپ نے اس کا فسق و فجور محسوس کر لیا، مگر ہم تو اپنے کو اس سے بہتر نہیں سمجھتے اس لئے اپنی ذات کو چھوڑ کر حکام تک اس کی شکایت نہیں لے گئے، پھر آپ کی کوشش سے حکام نے اسے رہا کیا، اور وہ تائب ہو کر اہلِ صلاح میں سے ہو گیا۔

جب آپ کے کسی مرید سے کوئی غلطی ہوتی تو اس کے بارے میں فرماتے کہ یہ میری ہی غلطی تھی، جو بالواسطہ اس سے ظاہر ہوئی، عبادات و معاملات میں احتیاطی پہلو اختیار کرتے اس لئے ابتدا میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں اور قوی دلیلیں ہیں۔

یہ چند چیزیں ان کے فضائل و کمالات کا صرف ایک معمولی حصہ اور ان کے بحر شمائل کا صرف ایک قطرہ ہیں، اسی وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ قلیل مدت میں کتنے انسانوں کو آپ سے فیض باطنی پہونچا، جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اس سلسلۂ مبارکہ کو آپ ہی کے ذریعہ

فروغ حاصل ہوا، جسے آپ سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔[1]

شیخ محمد بن فضل اللہ برہانپوری کہتے ہیں کہ آپ وعظ و ارشاد میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے کیونکہ کل تین ۳ چار ۴ سال کی مدت میں اپنے افادات کے ذریعہ دنیا میں روشنی پھیلا دی، اس کی تفصیل ملا ہاشم کشمی کی "زبدۃ المقامات" میں ہے، آپ نے کل چالیس ۴۰ سال کی عمر پائی اور ہندوستان آنے کے بعد کل چار ۴ سال حیات رہے، اور اس تھوڑی مدت میں آپ کے اصحاب و رفقاء کمالات کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ گئے یہاں تک کہ انھوں نے گذشتہ سلسلوں کے آثار محو کر دیئے، اور طریقۂ نقشبندیہ تمام سلسلوں پر غالب آ گیا۔

محمد بن فضل اللہ مُحبّی نے "خلاصۃ الاثر" میں لکھا ہے کہ "حضرت شیخ اللہ کی ایک نشانی و روشنی اور سرّ الٰہی اور علم ظاہر و باطن اور تصرفات کے حامل تھے، خاموش طبع، متواضع اور ایسے خوش اخلاق تھے کہ لوگوں میں اپنے کو ذرا بھی ممتاز نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنے احباب کو بھی قیام تعظیمی سے روکتے اور معمولی سلوک کی تلقین کرتے تھے"۔

مُحبّی کا کہنا ہے کہ آپ سے بڑے تصرفات ظاہر ہوئے، جس پر آپ کی نظر پڑ جاتی یا داخل سلسلہ ہوتا تو اس پر محویت و فنائیت کا غلبہ ہو جاتا، اگرچہ اسے اس راہ سے پہلے کوئی مناسبت نہ ہوتی، لوگ آپ کے دروازہ پر مدہوشوں کی طرح پڑے رہتے، بعض لوگوں

---

[1] سلسلہ نقشبندیہ ہندوستان دو طریق سے پہونچا، ایک امیر ابو العلاء اکبرآبادی کے ذریعہ جن کو اپنے چچا عبد اللہ احراری سے طریقۂ نقشبندیہ میں اجازت و خلافت تھی، اس طریق میں چشتیت و نقشبندیت باہم مخلوط ہیں کالپی، مارہرہ، داناپور وغیرہ کا ابو العلائی سلسلہ انہی سے چلتا ہے، دوسرا طریق حضرت خواجہ باقی باللہ کا ہے، اصلاً اس سلسلہ کی ہندوستان میں اشاعت حضرت خواجہ کی آمد اور حضرت مجدد کے اس سلسلہ میں داخل ہونے سے ہوئی، پھر وہ سارے عالم میں پھیل گیا۔ ("الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" تالیف مولانا سید عبد الحیٔ "مصنف نزہۃ الخواطر")۔

پر پہلے ہی وہلہ میں عالم ملکوت منکشف ہوجاتا جو غیبی کشش کا نتیجہ تھا۔

آپ کے مریدوں میں طریقۂ مجددیہ کے امام و بانی حضرت مجدد الف ثانی رح حضرت شیخ تاج الدین بن سلطان عثمانی سنبھلی، شیخ حسام الدین بن شیخ نظام الدین بدخشی، شیخ الہ داد دہلوی جیسے جلیل القدر مشائخ اور مرجع خلائق بزرگ تھے۔

آپ کی تصنیفات میں نادر رسالے، قیمتی مکاتیب اور پاکیزہ اشعار ہیں، جن میں کتاب "سلسلۃ الأحرار" ہے جس میں آپ نے فارسی میں اپنی عرفانی رباعیات کی شرح کی ہے۔

چہارشنبہ ۱۴ر جمادی الآخرۃ ۱۰۱۲ھ کو دہلی میں چالیس سال چار ماہ کی عمر میں انتقال فرمایا، آپ کی قبر مغربی دہلی میں قدم رسول ؐ کے قریب ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے۔

بیعت و تکمیل

حضرت مجدد حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ گویا آپ کے انتظار ہی میں بیٹھے تھے، بڑی شفقت و مہربانی کے ساتھ پذیرائی فرمائی، حضرت خواجہ کی طبیعت بڑی غیور اور دیر آشنا واقع ہوئی تھی، کسی کو خود اپنی طرف متوجہ نہیں فرماتے تھے، لیکن یہاں طالب خود مطلوب تھا، اور خدا کو حضرت خواجہ کے ذریعہ حضرت مجدد کی روحانی تکمیل کر کے اور اُس نسبت خاص کو عطا کر کے جس کا طریقۂ نقشبندیہ اس عہد میں حامل تھا، اور جس کی سلوک باطنی کی دنیا اور ہندوستان کے اِس روحانی ماحول میں ضرورت تھی، ایک نئی نوعیت وطرز سے دین کی تجدید کا کام لینا، طریقت کو شریعت کے تابع بنانا، منازل سلوک کو طے کرانا اور وسائل سے مقاصد تک پہونچانا مقصود تھا، حضرت خواجہ نے خلاف معمول فرمایا کہ "آپ چند روز ہمارے مہمان رہیں، ایک ماہ ایک ہفتہ ہی سہی"۔

حضرت خواجہ نے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا تو استخارہ کیا تھا، استخارہ کے بعد معلوم ہوا کہ ایک خوبصورت طوطی جو بہت میٹھی باتیں کرتا ہے، ان کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ گیا، وہ اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالتے ہیں، اور وہ اپنے منقار سے ان کے منہ میں شکر دے رہا ہے، حضرت خواجہ نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ امکنگی سے یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ "طوطی ہندوستان کا جانور ہے، ہندوستان میں تمہاری تربیت سے کوئی ایسا شخص تیار ہوگا، جس سے ایک عالم منور ہو جائے گا، اور تم کو بھی اس سے حصہ ملے گا"۔[۱]

حضرت مجدد کے لئے اس ارشاد کے بعد انکار و معذرت کی کیا گنجائش تھی کہ ان کے اندر خود خضر طریق اور چشمۂ حیواں کی طلب موجود تھی، آپ نے یہ دعوت قبول فرمالی اور رفتہ رفتہ یہ قیام ایک ماہ دو ہفتہ کو منجر ہوا، اس صحبت میں طریقۂ نقشبندیہ کے اکتساب و تحصیل کا ایسا جذبہ طاری ہوا کہ بیعت کی درخواست کی، حضرت خواجہ نے بلا تامل قبول فرمالیا اور خلوت میں لے جا کر ذکر قلبی کی تلقین کی، اور آپ کی توجہ سے اسی وقت ذکر قلبی جاری ہوگیا اور ایسی حلاوت و لذت محسوس ہوئی جو یوماً فیوماً بلکہ آناً فاناً ترقی کرتی رہی، حضرت خواجہ نے ان حالات اور برق رفتار ترقی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہی وہ طوطی خوشنوا ہے جو خواب میں دکھایا گیا تھا، اور اسی کی خوش نوائی و خوش ادائی سے ہندوستان کے چمن بلکہ چمن اسلام میں نئی بہار آئے گی

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

اس دو ڈھائی مہینہ میں حضرت مجدد کو جو باطنی کیفیات و ترقیات حاصل ہوئیں اور جو مراحل سلوک طے ہوئے ان کا بیان کرنا اور الفاظ کے ذریعہ ان کا سمجھنا یا سمجھانا ممکن نہیں ہے[۲]

---

[۱] زبدۃ المقامات صفحہ ۱۴۰-۱۴۱ حضرات القدس صفحہ ۲۶-۲۷ [۲] اگر کسی کو اس کے دیکھنے کا شوق ہو تو وہ مکتوب ۲۹۰ دفتر اول حصہ چہارم بنام حضرت خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبد اللہ فرزندان حضرت خواجہ باقی باللہ، نیز مکتوب ۲۹۰ دفتر اول حصہ پنجم بنام مولانا محمد ہاشم کشمی کا مطالعہ کرے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

حضرت مجدد اس کے بعد سرہند تشریف لے گئے، اس پہلی مرتبہ ہی حضرت خواجہ نے خوشخبری سنائی کہ تم کو نسبت نقشبندیہ کامل طور پر حاصل ہوگئی اور یوماً فیوماً ترقی ہونے کی امید ہے، دوسری مرتبہ جب دہلی حاضری ہوئی تو خلعت خلافت عطا فرمایا اور طالبانِ خدا کو تعلیم طریقت اور ارشاد و ہدایت کی اجازت دی، اور اپنے مخصوص ترین اصحاب کو تعلیمِ طریقت کے لئے آپ کے سپرد کیا۔

حضرت مجدد اس کے بعد تیسری اور آخری مرتبہ حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت خواجہ نے بہت دور باہر نکل کر استقبال کیا اور بڑی بشارتیں دیں، اپنے حلقۂ توجہ میں آپ کو سرِ حلقہ بنایا اور مریدوں سے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی شخص میری طرف متوجہ نہ ہوا کرے، رخصت کرتے وقت فرمایا کہ "اب ضعف بہت معلوم ہوتا ہے، امید حیات بہت کم ہے" اور اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت خواجہ عبید اللہ اور حضرت خواجہ عبد اللہ کو جو اس وقت شیر خوار تھے، اپنے سامنے آپ سے توجہ دلائی اور فرمایا کہ ان کی ماؤں کو بھی غائبانہ توجہ دیجئے، چنانچہ آپ نے توجہ دی اور توجہ کا اثر بھی اسی وقت ظاہر ہوا۔[1]

حضرت مجدد کے علوِ مرتبہ کی شہادت حضرت خواجہ کی زبان سے

حضرت خواجہ نے اپنے ایک مخلص کو اس تعلق کے بعد ایک خط میں تحریر فرمایا کہ "شیخ احمد نے جو سرہند کے باشندے کثیر العلم قوی العمل بزرگ ہیں، فقیر کے ساتھ چند دن نشست و برخاست

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۵۵

کی فقیر کے مشاہدہ میں ان کے عجیب کمالات و اوصاف آئے، امید ہے کہ وہ ایک ایسا چراغ بنیں گے جس سے ایک عالم روشن ہو جائے گا، ان کے احوال کاملہ پر میرا یقین استوار ہے"۔

خود حضرت مجدد کو پہلی ہی توجہ و تلقین سے یقین ہوگیا کہ وہ اس راہ کے مدارج عالیہ تک پہونچیں گے اسی کے ساتھ دید قصور اور اپنی نفی بھی دل میں راسخ تھی، اسی کے ساتھ یہ شعر بھی وردِ زبان تھا ؎

ازیں نورے کہ از تو بر دلم تافت
یقین دانم کہ آخر خواہمت یافت[1]

حضرت مجدد ان ترقیات باطنی اور فضائل علمی و عملی کے ساتھ اپنے شیخ و مرشد کا نہایت درجہ ادب کرتے تھے، کسی وقت اگر شیخ نے ان کو طلب فرمایا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا اور جسم پر لرزہ طاری ہوجاتا،[2] ادھر شیخ کا معاملہ ان کے ساتھ یہ ہوگیا جو کم تر کسی شیخ کا اپنے مسترشد کے ساتھ ہوا ہوگا، ایک مرتبہ فرمایا کہ "شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ما ہزاراں سیارگان در ضمن ایشاں گم اند"[3] (شیخ احمد وہ آفتاب ہیں جن کی روشنی میں ہم جیسے ہزاروں ستارے گم ہیں)۔

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۴۵ [2] ایضاً ص ۱۴۹ [3] ایضاً ص ۲۳۰

باب چہارم

اہم واقعات وحالات، ارشاد وتربیت کی سرگرمی، وفات

سرہند کا قیام

اس اکتساب فیض اور تکمیل کے بعد حضرت مجدد نے سرہند میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی، ایک عرصہ تک آپ طالبین کی تربیت سے احتراز فرماتے رہے، اور آپ کو اپنی ذات میں کمی کا بہ شدت احساس ہوتا رہا، ترقیات باطنی تیزی کے ساتھ ہو رہی تھیں، اور طبیعت عروج کی طرف مائل تھی، ایسی صورت میں طالبین کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ مشکل تھی جس کے لئے نزول شرط ہے، جو ابھی تک نہیں ہوا تھا، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ (اس حالت میں) "اپنے نقص کا علم روشن ہوگیا جو طالب میرے پاس جمع تھے سب کو جمع کر کے اپنا نقص ان سے بیان کیا اور سب کو رخصت کر دیا لیکن طالب اس بات کو کسر نفسی سمجھتے ہوئے اپنے عقیدے سے نہ پھرے کچھ مدت کے بعد حق سبحانہ وتعالے نے اپنے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل احوال منتظرہ عطا فرما دیئے"[1]

آخر وہ وقت آگیا کہ آپ کا فیض عام ہو، اور طالبین کی تکمیل اور ارشاد کا کام

---

[1] مکتوبات، مکتوب ۲۹۰ دفتر اول۔

شروع ہو، مجدد صاحب اپنے احوال مسترشدین اور برادران طریقت کی ترقیات باطنی کی تفصیل شیخ کو لکھتے رہے، ایسی بشارتیں منامات اور کیفیات بھی ظاہر ہوئیں جن سے آپ کو یقین ہوگیا کہ اللہ تعالے کو آپ سے کوئی بڑا کام لینا ہے، اور آپ سے دین کی کوئی عظیم الشان خدمت وجود میں آئے گی،[1] تیسری حاضری کے بعد حضرت خواجہ کی صحبت میسر نہ ہو سکی۔

لاہور کا سفر

حضرت مجدد نے کچھ عرصہ سرہند مقیم رہ کر شیخ کے اشارہ وارشاد پر لاہور کا سفر اختیار فرمایا، لاہور اس وقت دہلی کے بعد ہندوستان کا دوسرا علمی ودینی مرکز تھا، اور وہاں بکثرت علماء ومشائخ تھے، ان میں سے ایک جم غفیر نے آپ کی آمد کی خبر سن کر آپ کا پرجوش استقبال کیا اور بڑی تعظیم وتکریم سے پیش آئے[2] مولانا طاہر لاہوری (جو بعد میں حضرت مجدد کے اجلۂ خلفاء میں ہوئے) مولانا حاجی محمد، مولانا جمال الدین تلوی آپ کے حلقۂ ارادت وبیعت میں داخل ہوئے، ذکر ومراقبہ کا حلقہ قائم ہوتا اور مجالس صحبت گرم رہتیں۔[3]

حضرت مجدد ابھی لاہور ہی میں مقیم تھے کہ حضرت خواجہ کی رحلت کی اطلاع ملی، حضرت پر بڑا اثر ہوا، ایک اضطرابی واضطراری حالت میں دہلی کی طرف عنان سفر موڑ دی، راستہ میں سرہند پڑتا تھا، لیکن گھر نہ گئے پہلے اپنے شیخ ومرشد کے مزار پر حاضر ہوئے، مرشد زادوں اور برادران طریقت سے تعزیت کی اور ان کی خواہش پر ان کی تسکین خاطر کے لئے چند روز دہلی میں قیام

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ۴۴ دفتر دوم

[2] زبدۃ المقامات ص ۱۵۷

[3] زبدۃ المقامات ص ۱۵۸، روضۃ القیومیہ میں ہے کہ اس سفر میں خان خاناں اور مرتضے خاں (سید فرید) بھی حلقۂ ارادت وبیعت میں داخل ہوئے ص ۱۱۷

فرمایا، اور تربیت وارشاد کی محفل جو حضرت خواجہ کے ارتحال سے سونی ہوگئی تھی، دوبارہ آباد
اور مغموم و مجروح دل شگفتہ اور تازہ ہوگئے۔[1]

کچھ روز قیام فرماکر آپ سرہند تشریف لے آئے، اس کے بعد صرف ایک مرتبہ دہلی اور دو تین مرتبہ آگرہ جانے کا اتفاق ہوا، آخر عمر میں تین سال تک شاہی لشکر کے ہمراہ (جس کا ذکر آگے آئے گا) بعض شہروں اور مقامات سے آپ کا گذرنا ہوا، تو وہاں کے اہل طلب اور اہل شوق آپ کی صحبت سے مستفید ہوئے۔[2]

تبلیغ و دعوت اور ارشاد و تربیت کے وسیع انتظامات اور رجوع عام

سنہ ۱۰۲۶ھ میں آپ نے اپنے بہت سے خلفاء تبلیغ و ہدایت کے لئے مختلف مقامات پر بھیجے، ان میں سے ستر مولانا محمد قاسم کی قیادت میں ترکستان کی طرف روانہ کئے گئے، چالیس حضرات مولانا فرخ حسین کی امارت میں عرب، یمن، شام اور روم کی طرف بھیجے گئے، دس ذمہ دار اور تربیت یافتہ حضرات مولانا محمد صادق کابلی کے ماتحت کاشغر کی طرف اور تیس خلفاء مولانا شیخ احمد برکی کی سرداری میں توران، بدخشاں، اور خراسان گئے، اور ان حضرات کو اپنے اپنے مقامات میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی، اور بندگان خدا نے ان سے فائدہ اٹھایا۔[3]

بہت سے نامی گرامی علماء و مشائخ جو اپنے اپنے مقامات پر بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، سفر کی دشوار گزار منزلیں طے کر کے سرہند حاضر ہوئے، اور بیعت و استفادہ سے مشرف ہوئے، ان میں شاہ بدخشاں کے معتمد علیہ شیخ طاہر بدخشی، طالقان کے

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۵۸ [2] ایضاً ص ۱۵۹ [3] روضۃ القیومیۃ ص ۱۶۶-۱۶۷

جید عالم شیخ عبد الحق شادمانی، مولانا صالح کولابی، شیخ احمد برسی، مولانا یار محمد، اور مولانا یوسف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آپ نے ان میں سے اکثر حضرات کو خلافت واجازت عطا فرماکر دعوت وارشاد کے لئے اپنے اپنے مقامات کو واپس کیا۔[1]

ہندوستان میں بھی آپ نے جا بجا اپنے خلفاء کو دعوت وارشاد پر مامور فرمایا، خواجہ میر محمد نعمان کو خلافت عطا فرماکر دکن بھیجا، ان کی خانقاہ میں کئی کئی سو سوار اور بے شمار پیادہ ذکر و مراقبہ کے لئے حاضر ہوتے تھے، شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو خلافت عطا فرماکر پہلے سہارنپور پھر شاہی لشکر گاہ (معسکر) آگرہ میں متعین کیا، ان کو وہاں قبول عام حاصل ہوا، بہت سے ارکان سلطنت ان کے حلقہ بگوش ہوئے، لشکر کے ہزارہا آدمی مرید ہوئے، ہر روز اس قدر ہجوم ہوتا کہ بڑے بڑے امراء کو مشکل سے شیخ کی زیارت کی نوبت آتی، میر محمد نعمان کشمی کو جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں تھے، تجدید بیعت واجازت نامہ مرحمت فرماکر برہان پور روانہ فرمایا اور آپ وہاں مرجع طالبین بن گئے، اور لوگوں کی بڑی اصلاح ہوئی، شیخ طاہر لاہوری کو شہر لاہور کے (جو ہندوستان کا دوسرا علمی وسیاسی مرکز تھا) طالبان معرفت کی رہنمائی کے لئے روانہ فرمایا، اور ان سے اس دیار میں بڑا فیض پہونچا، شیخ نور محمد پٹنی کو اجازت مرحمت فرماکر شہر پٹنہ روانہ فرمایا اور ان سے ان دیار میں ارشاد و ہدایت اور افادۂ علوم دینیہ کا سلسلہ جاری ہوا، شیخ حمید بنگالی کو منازل سلوک طے کرا کے اور تعلیم و طریقت کی اجازت دے کر بنگالہ روانہ کیا، شیخ طاہر بدخشی کو تکمیل حال کے بعد تعلیم و طریقت کی اجازت دے کر جونپور روانہ کیا، مولانا احمد برکی تعلیم و تربیت میں مجاز ہونے کے بعد برک

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو روضۃ القیومیۃ ص ۱۲۸، ۱۲۹ "حضرات القدس" میں بھی خلفاء کے ضمن میں متفرق طور پر ان کے مختلف مقامات کی طرف روانہ کرنے اور ارشاد و تربیت پر مامور کرنے کا ذکر آیا ہے۔ ملاحظہ ہو حضرات القدس ص ۲۹۹ تا ۳۶۸

پہونچ کر ارشاد و تربیت میں مشغول ہو گئے، اور اپنے مریدوں کے احوال بذریعۂ مکاتیب حضرت کی خدمت میں لکھتے رہے، شیخ عبدالحی حصار شادماں (علاقہ اصفہان) کے باشندہ تھے، مکتوبات کا دفتر ثانی آپ ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے، حضرت نے آپ کو تعلیم و طریقت کی اجازت دے کر شہر پٹنہ روانہ فرمایا، شیخ عبدالحی شہر کے درمیان تشنگان طریقت کی پیاس بجھاتے تھے، اور شیخ نور محمد دریائے گنگا کے کنارے ارشاد و تربیت کا چشمہ جاری کئے ہوئے تھے، شیخ حسن برکی بھی اپنے وطن میں اشاعت طریق و سنت پر مامور تھے، سید محب اللہ مانکپوری کو خلافت عطا کر کے مانکپور روانہ کیا، پھر حضرت کی اجازت سے وہ الٰہ آباد منتقل ہو گئے، شیخ کریم الدین بابا حسن ابدالی توجہات خصوصی سے سرفراز ہو کر وطن واپس ہو گئے[1] ۱۰۲۷ھ مکمل نہیں ہوا تھا کہ حضرت مجدد کی جلالت شان اور قوت ارشاد و حسن تربیت کا آوازہ بیرون ہند تک پہونچ چکا تھا، لوگ جوق در جوق زیارت و استفادہ کے لئے آنے لگے، ماوراء النہر، بدخشاں، کابل اور بعض دوسرے عجمی ممالک کے بہت سے شہروں میں آپ کے خلفاء موجود تھے، اور عرب ممالک تک بھی آپ کی شہرت پہونچ گئی تھی، ہندوستان میں تو مشکل سے کوئی شہر ہوگا جہاں آپ کے نائبین اور دعوت الی اللہ دینے والے موجود نہ ہوں۔

سلطانِ وقت جہانگیر کا رویہ

۱۰۱۴ھ میں جلال الدین اکبر بادشاہ کا انتقال ہوا، اور نور الدین جہانگیر تخت سلطنت پر بیٹھا، اکبر کے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ ہوا، اور اس عظیم ملک میں (جس کو مسلمان فاتحین کے خون، مصلحین اور خادمین اسلام کے پسینہ، اور اہل باطن و

---

[1] حضرات القدس الحضرۃ الثانیۃ عشرۃ فی بیان احوال خلفائہ، و دیگر کتب۔

اہلِ قلوب کے اشک سحرگاہی سے سیراب و بارآور کیا گیا تھا) اسلام کی بیخ کنی کا کام جس قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا تھا، وہ آپ کے دردمند دل اور غیور اسلامی طبیعت کو مضطرب کرنے کے لئے کافی تھا، لیکن کچھ تو اپنی تکمیل حال اور باطنی تیاریوں میں مشغولیت کی بنا پر اور کچھ اس لئے کہ وہ فتنہ اپنے شباب پر تھا، اور ابھی وہ سرا ہاتھ میں نہیں آیا تھا جس کے ذریعہ آپ سلطنت اور اس کے رجحان اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس کی سیاست پر اثر انداز ہو سکیں، آپ نے اپنا تجدیدی و اصلاحی کام پوری قوت کے ساتھ شروع نہیں فرمایا، اور اگر فرمایا تو تاریخوں میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ نے خانِ خاناں سید صدر جہاں اور مرتضیٰ خاں وغیرہ کے ذریعہ بادشاہ کو نصیحت آمیز پیغامات بھیجے ان حضرات کو بادشاہ کا تقرب و اعتماد حاصل تھا، اور حضرت مجدد کی عظمت و عقیدت بھی ان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

جہانگیر کو نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی عناد نہ تھا، بلکہ ایک طرح کی سلامت روی اور حسن اعتقاد تھا، اور اس کو کسی نئے دین و آئین کے جاری کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس کا عمل اپنے جدامجد کی اس ہدایت پر تھا کہ ؎

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

آپ نے بادشاہ کی اس سادہ طبیعت سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان سے ان اثرات کو ختم کرنے کا ارادہ کیا جو سابقہ سلطنت میں پیدا ہوئے تھے، اور جس کی تفصیل آئندہ ایک مستقل باب میں آئے گی۔

لیکن قبل اس کے کہ آپ یہ انقلاب انگیز کام شروع کریں، گوالیار کی اسیری کا واقعہ پیش آ گیا جو کئی حیثیتوں سے حضرت مجدد کی حیات اور اس عہد کی اصلاحی و تجدیدی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے،

بعض سیر و سوانح کی عام کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جہانگیر کے سامنے مکتوبات کے وہ نازک مضامین پیش کئے گئے، جن کا سمجھنا تصوف کی اصطلاحات و دقائق اور لکھنے والے کے غرض و منشاء کے سمجھنے پر موقوف ہے، اور جو درحقیقت وہ عبوری مکشوفات و محسوسات تھے، جو سالک کو اپنے سیر و سلوک میں عارضی طور پر پیش آتے ہیں، اور جن کی اپنے شیخ و مربی کو اطلاع دینی ضروری ہے۔[1]

جہانگیر کے لئے ان مضامین میں جو اس کے فہم سے بالاتر تھے، اور جن میں ایک سادہ لوح سنی العقیدہ مسلمان کے لئے جو کشف، واقعہ اور عبور و استقرار کے فرق کو نہیں جانتا، وحشت و تشویش کے پورے اسباب موجود تھے، اس نے ان میں بڑے حیرت و استعجاب کا اظہار کیا، اور ان کو جمہور مسلمین و اہل سنت کے مسلمہ عقائد کے خلاف سمجھا اور ادعاء و خود پرستی پر محمول کیا، اپنی توزک میں اس نے جہاں واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس میں اس کی حیرت و استعجاب صاف جھلکتا ہے، مجدد صاحب کا ذکر اس نے بہت نامناسب انداز اور کسی قدر تحقیر آمیز طریقہ پر کیا ہے،[2]

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۱۱ دفتر اول بنام حضرت مرشد خواجہ باقی باللہ۔

جہانگیر کے علاوہ جو اس کوچہ سے نابلد تھا، بعض اچھے راسخ العلم حضرات کو بھی ان مضامین کو پڑھ کر بڑا اشکال پیش آیا، ان میں اس عہد کے نامور عالم ناشر علم حدیث اور جامع شریعت و طریقت حضرت شیخ عبد الحق بخاری دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عرصہ تک ان کو اس بارہ میں بڑا تردد رہا، اور ان کی اور حضرت مجدد کی مراسلت بھی ہوئی، آخر میں ان کو اس بارے میں اطمینان و شرح صدر ہو گیا جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا، ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق کی روایت ہے کہ:-

"یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچی ہے کہ ایک شخص حسن خاں نامی پٹھان جو حضرت شیخ (مجدد) کے مریدوں میں تھا، کسی بات پر آزردہ و ناراض ہو کر چلا گیا، اور شیخ کے مکتوبات میں جن کا ایک قلمی مجموعہ اس کے پاس تھا، تحریف و اضافہ کر کے مسخ شدہ حالت میں جا بجا پھیلا دیا۔" (مناقب العارفین از شاہ فتح محمد فتحپوری چشتی ص۱۲۶)

غلط فہمی اور اس ہنگامہ کی بنیاد یہ تحریف شدہ مکاتیب بھی ہو سکتے ہیں۔

[2] ملاحظہ ہو توزک جہانگیری ص۲۷۲-۲۷۳ وقائع سنہ جلوس ۱۴ / سنہ ۱۰۲۸ھ۔

اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجدد صاحب کے مرتبہ و مقام سے بالکل بے خبر ہے، اور وہ ایک تورانی مغل امیر کے قلم سے جو مسلمانوں کے عام عقائد کے سوا کچھ نہیں جانتا، اور اپنے کو ان کا حامی و محافظ سمجھتا ہے، بے تکلف اظہار خیال کر رہا ہے۔

شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو لشکر شاہی میں جو قبولیت حاصل ہوئی تھی، اور اعیان سلطنت کی ان کے یہاں بکثرت آمد و رفت شروع ہو گئی تھی، اس کو بھی لوگوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا، اور اس سے خطرہ ظاہر کیا، یہ بھی کہا گیا کہ حضرت مجدد شیخ کے ذریعہ فوج سے ساز باز کر رہے ہیں، اور بغاوت کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں شیخ بدیع الدین سے اپنے جوش عقیدت میں بھی بعض بے احتیاطیاں ہوئیں، اور انھوں نے اپنے بعض وقائع و کشوف "کلموا الناس علی قدر عقولہم" کی نصیحت پر عمل نہ کرتے ہوئے ایسے بیان کئے جو خواص کالعوام اور عوام کالانعام کے فہم و ادراک سے بالاتر اور محل قیل و قال تھے،[1] اس کا اثر حضرت مجدد تک بھی پہونچا، جہانگیر اس کوچہ سے بالکل ناآشنا تھا، اور دربار میں اس کے کان بھرنے والے بھی موجود تھے، اور چونکہ مجدد صاحب تشیع کے ان اعتقادی اور علمی اثرات کا مقابلہ کرتے تھے، جو ایرانی عنصر کے ہندوستان میں آنے اور دربار پر حاوی ہو جانے کے بعد سے مسلم معاشرہ پر چھائے چلے جا رہے تھے، اور عقائد اہل سنت کی صاف صاف تبلیغ فرماتے تھے، اس سے اگر دربار کے بارسوخ ایرانی عنصر نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا ہو تو تعجب نہیں، مسئلہ کو سیاسی رنگ دینے کے بعد اس کی اہمیت اور بڑھ گئی، اور جہانگیر نے اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت مجدد کا آفتاب ارشاد نصف النہار پر تھا، اور آپ کی سرگرمی و مصروفیت اور اسی کے ساتھ شہرت و مقبولیت نقطۂ عروج پر، شاید اس میں بھی

[1] زبدۃ المقامات ص۳۴۸

حکمت الٰہی تھی کہ اس عظمت و عروج کے عین شباب کے زمانہ میں آپ کو اس ابتلاء و امتحان میں ڈال کر وہ مقامات عبدیت طے کرائے جائیں، اور روحانی ترقی کے اس مقام پر پہونچایا جائے جو عادۃً اس مجاہدہ و امتحان کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

گوالیار کی اسیری کے اسباب

تاریخ و سوانح کی عام کتابوں میں اسیری اور قلعۂ گوالیار میں نظر بند کئے جانے کا سبب اسی خاص مکتوب کے (جو حضرت نے اپنے شیخ و مرشد کو لکھا تھا) وہ نازک مضامین، مکاشفات اور سیر و سلوک کے سلسلہ کی ان دقیق باتوں ہی کو ٹھہرایا گیا ہے جن سے آپ کا بہت اکابر امت سے عالی مقام ہونا ثابت ہوتا ہے۔

لیکن راقم سطور کو اس میں بہت شبہ ہے کہ حضرت مجدد کو یہ ابتلاء محض اس غلط فہمی میں پیش آیا، اور اس کا سبب جہانگیر کی دینی حمیت اور جمہور اہل سنت کے عقائد و مسلمات کی حمایت تھی، یا یہ محض علمائے دربار یا اس عہد کے قابل احترام علماء و مشائخ کے اصرار و تقاضہ سے کیا گیا، جہانگیر کسی زمانہ میں بھی اس دینی مزاج کا آدمی نہیں تھا، اور اس کی دینی حس کبھی اتنی تیز اور نازک نہیں تھی کہ وہ ایک ایسے مسئلہ میں جو اس کے فہم سے بالاتر تھا، اور جس کا امور سلطنت اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، ایک ایسی بلند پایہ دینی شخصیت کے خلاف اتنا بڑا اقدام کرے جو ہزاروں آدمیوں کی محبت و عقیدت کا مرکز تھی۔

اس سے پہلے اس کے والد اور دادا کے زمانہ میں شیخ محمد غوث گوالیاری معراج کا دعویٰ کر چکے تھے، اور اس کی وجہ سے علماء کے حلقہ میں شورش و بےچینی تھی[1]، اور ان پر فتوے

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر محمد مسعود صاحب کی کتاب "شاہ محمد غوث گوالیری" مطبوعہ کراچی۔

لگائے جا رہے تھے، لیکن نہ ہمایوں نے ان کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ اکبر نے، خود جہانگیر کے زمانہ میں بہت سے مشائخ وحدۃ الوجود کے آخری حدود "عینیت" اور "مساوات" تک پہونچ گئے تھے، اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے، اسی کے زمانہ میں شیخ محب اللہ الٰہ آبادی[1] نے عربی میں کتاب "التسویۃ" لکھی اور فارسی میں اس کی شرح کی، لیکن جہانگیر نے ان تحقیقات و غریب اقوال کا کوئی نوٹس نہیں لیا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ متنازعہ فیہ مکتوب ۱۱ (جس کو اس پورے قصہ کی بنیاد بنایا گیا ہے) حضرت خواجہ کے نام ۱۰۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے، اور گرفتاری سولہ سال بعد ۱۰۲۸ھ میں عمل میں آئی۔

راقم سطور کے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت مجددؒ کے ارکان سلطنت اور امرائے دربار سے خصوصی تعلقات ہو گئے تھے، اور ان کو حضرت سے گہری عقیدت تھی، جو ایک ایسے ذکی الحس حکمراں کے لئے جو اپنے والد کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر چکا تھا، اور بیٹوں سے زور آزمائی کر کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا، وسوسہ اندازی کے لئے کافی تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ جہانگیر کو ان مؤثر اور ولولہ انگیز خطوط کا بھی علم ہو گیا ہو، جو حضرت مجددؒ نے ان ارکانِ سلطنت کو اصلاحِ حال اور حکومت کو اسلام کی حمایت اور دین کی حمیت کے سلسلہ میں تحریر فرمائے تھے۔

ان امرائے دربار اور ارکین سلطنت میں خان اعظم مرزا عزیز الدین، خان جہان خاں لودھی، خانِ خاناں مرزا عبدالرحیم، مرزا داراب، قلیج خاں وغیرہ تھے[2]۔

مغل سلاطین مشائخ سے عوام کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت، رجوع عام اور ان کے گرد لوگوں کے پروانہ وار جمع ہو جانے سے ہمیشہ خائف رہے، مجددؒ صاحب کے خلیفۂ کبیر حضرت سید آدم بنوری کے ساتھ یہی پیش آیا، وہ جب ۱۰۵۲ھ میں لاہور تشریف لے گئے تو ان کی

[1] متوفی ۱۰۵۸ھ [2] اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جہانگیر "تزک" میں خود لکھتا ہے کہ شیخ کے خلفاء ہر دیار اور ہر قریہ میں متعین ہیں" (ص ۲۷۲) نیز یہ کہ اس گرفتاری کی مصلحت یہ ہے کہ "شورش عوام نیز فرو نشود" (ص ۲۷۳)

ہمر کابی میں دس ہزار سادات و مشائخ اور مختلف طبقوں کے عقیدت مند تھے، اس وقت شاہجہاں لاہور ہی میں تھا، اس کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اور اس نے ایسے اسباب پیدا کئے کہ آپ نے ہندوستان کو خیر باد کہا اور حرمین شریفین کی طرف ہجرت کی، غالباً یہی وجہ تھی کہ جہانگیر نے گوالیار کی نظر بندی ختم کرنے کے بعد ایک طویل عرصہ تک حضرت کو اپنے لشکر میں سفر و حضر میں ساتھ رکھا تاکہ وہ امراء و ارکان سلطنت کے تعلقات کی نوعیت کا مطالعہ کر سکے، اور اس کا اطمینان کر لے کہ آپ سے سلطنت و اقتدار کے لئے کوئی خطرہ نہیں، اور نہ آپ سے کوئی مخالف عنصر یا حوصلہ مند یا طالع آزما فائدہ اٹھا سکے گا، اس کو جب حضرت کے طرز عمل سے اس کا اطمینان ہو گیا، اور اس نے آپ کے اخلاص، للّٰہیت، بے لوثی، اور بے غرضی اور علو مقام کا مشاہدہ کیا، اور اس کو بچشم خود دیکھ لیا کہ آپ دنیا کی شوکت و حشمت کو خس و خاشاک کے برابر نہیں سمجھتے، تو اس نے آپ کو سرہند میں آزادانہ طریقہ پر قیام کی اجازت دی۔

قلعۂ گوالیار کی نظر بندی

بہر حال جہانگیر نے حضرت مجدد کو اپنے مستقر پر طلب کیا اور حاکم سرہند کو تاکید کی کہ جس طرح ہو سکے آپ کو وہاں بھجوا دے، آپ حاضر الوقت پانچ مریدوں کو ہمراہ لے کر روانہ ہو گئے، بادشاہ نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو امراء کو آپ کے استقبال کے لئے بھیجا، اپنے محل کے قریب خیمہ نصب کرایا، اور ملاقات کے لئے آپ کو دربار میں طلب کیا، آپ دربار میں تشریف لے گئے تو آداب شاہی جو خلاف شرع تھے، آپ نے ادا نہ کئے، ایک ناخدا ترس درباری نے بادشاہ کو متوجہ کیا اور کہا کہ جہاں پناہ شیخ نے آداب سلطنت کی کوئی رعایت نہیں کی، بادشاہ نے وجہ دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ میں نے آج تک خدا اور

رسول کے بتائے ہوئے آداب و احکام کی پابندی کی ہے، اس کے علاوہ مجھے کوئی آداب نہیں آتے، بادشاہ نے ناراض ہو کر کہا مجھے سجدہ کرو[1] آپ نے فرمایا میں نے سوائے خدا کے نہ کسی کو سجدہ کیا اور نہ کروں گا، بادشاہ اس پر ناراض ہوا اور گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کرنے کا حکم دے دیا۔[2]

اس واقعہ سے پہلے شاہ جہاں نے (جس کو حضرت سے عقیدت و خلوص تھا) علامہ افضل خاں اور خواجہ عبد الرحمٰن مفتی کو کتب فقہ اور اس پیغام کے ساتھ حضرت مجدد کے پاس بھیجا تھا کہ سجدۂ تحیۃ سلاطین کے لئے آیا ہے، اگر آپ سجدہ کر لیں تو میں اس بات کا ضامن و ذمہ دار ہوں کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہونچے گا، آپ نے فرمایا کہ یہ محض رخصت ہے، عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔[3]

گرفتاری کا یہ افسوسناک واقعہ ربیع الثانی ۱۰۲۸ھ کی کسی تاریخ کو پیش آیا، اس لئے کہ جہانگیر نے اسی مہینہ کے واقعات میں اس کا ذکر کیا ہے، قید کرنے کے بعد آپ کی حویلی، سرائے، کنواں، باغ اور کتابیں ضبط کر لی گئیں، اور متعلقین کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔[4]

زندان گوالیار میں سنت یوسفی

گوالیار کی یہ نظر بندی اللہ تعالےٰ کی بہت سی حکمتوں اور دینی مصالح پر مبنی تھی، اور ترقیات باطنی و ازدیاد مقبولیت و محبوبیت کا موجب، یہاں اس یوسف زندانی نے یوسف کنعانی کی طرح اپنے رفقائے زنداں میں تبلیغ و ارشاد کا کام پوری سرگرمی سے

[1] یہ درباری سجدہ اکبر کے زمانہ سے رائج تھا، اور شاہی آداب میں شامل تھا، اورنگ زیب نے اس کو ختم کیا۔

[2] حضرات القدس ص ۱۱۷ [3] ایضاً ص ۱۱۶ [4] توزک جہانگیری ص ۲۷۲-۲۷۳ و مکتوب ۲ دفتر سوم۔

شروع کر دیا، اور پسِ زندان "یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" کی آواز اس بلند آہنگی سے بلند کی کہ قلعہ کے در و دیوار گونج اٹھے، اور ان کی آواز باہر بھی سنی گئی، کہا جاتا ہے کہ کئی ہزار غیر مسلم قیدی آپ کی دعوت تبلیغ اور صحبت و تربیت کے فیض سے مشرف بہ اسلام ہوئے، اور سیکڑوں قیدی ارادت و صحبت سے سرفراز ہو کر درجاتِ عالیہ تک پہونچے، ڈاکٹر آرنلڈ کی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں ہے:۔

"شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ - ۱۶۲۸ء) کے عہد میں ایک سنی عالم شیخ احمد مجدد نامی تھے، جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے، شیعوں کو اس وقت دربار میں رسوخ حاصل تھا، ان لوگوں نے کسی بہانہ سے انھیں قید کرا دیا، دو برس وہ قید میں رہے، اور اس مدت میں انھوں نے اپنے رفقائے زنداں میں سے سیکڑوں بت پرستوں کو حلقہ بگوش بنا لیا۔"

(ص ۴۱۲ طبع ثالث)

اس طرح انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (ENCYCLOPEDIA OF RELIGION-AND ETHICS) (مذہب و اخلاقیات کا دائرۃ المعارف) میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں ہے:۔

"ہندوستان میں سترہویں صدی میں ایک عالم جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا، جو ناحق قید کر دیئے گئے تھے، ان کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے قید خانہ کے ساتھیوں میں سے کئی سو بت پرستوں کو مسلمان بنا لیا۔"[1]

ج ۸ ص ۷۴۸

[1] ماخوذ از مضمون "حضرت مجدد الف ثانی یورپ کی نظر میں" بقلم مولانا عبد الماجد دریابادی، "الفرقان" مجدد نمبر ۱۳۵۷ھ۔

دورانِ اسیری کی نعمتیں اور لذتیں

زندان گوالیار کے اس چند روزہ مہمانی سے حضرت مجدد پر انعامات الٰہیہ کی جو بارش ہوئی اور آپ کو جو باطنی ترقیات، حقیقی شکستگی اور وارستگی کی لذت اور خلوت میں جلوت کی جو نعمت حاصل ہوئی، اس کا حضرت نے اپنے خاص خدام کے نام خطوط میں تحدیث بالنعمت کے طور پر بڑے مزے لے لے کر ذکر کیا ہے، میر محمد نعمان کے نام ایک طویل مکتوب میں جو قلعۂ گوالیار سے بھیجا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر محض فضل خداوندی سے فیوض و واردات الٰہی کا تسلسل اور اس کے غیر متناہی انعامات و عطیات کا پے در پے ظہور اس محنت کدہ میں مجھ جیسے شکستہ پر کے شامل حال نہ ہوتا تو قریب تھا کہ معاملہ یاس و ناامیدی کی حد کو پہونچ جاتا، اور رشتۂ امید شکستہ ہو جاتا، حمد ہے اس خداوند کی جس نے مجھ کو عین بلا میں عافیت عطا فرمائی، اور ظلم و جفا میں عزت بخشی، مشقت و تکلیف میں مجھ پر احسان کیا، اور راحت و مصیبت میں شکر کی توفیق دی، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرنے والوں اور اولیائے کرام کے نقش قدم پر چلنے والوں اور علماء و صلحاء سے محبت رکھنے والوں میں داخل فرمایا، اس سبحانہ و تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں انبیاء کرام پر اولاً اور ان کے متبعین پر ثانیاً۔"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے حکم سلطانی سے محبوس ہونے کی شہرت جب عام ہوئی تو اس پر طرح طرح کے تبصرے شروع ہوئے، لوگوں نے اس پر حاشیے چڑھائے، اور

[1] مکتوب ۵ دفتر سوم حصہ ہشتم، اردو ترجمہ حضرت مولانا عبد الشکور صاحب کے مضمون "امام ربانی" سے ماخوذ ہے۔

قیاس آرائیاں کیں، خدام ومحبین کو اس سے قدرتاً اذیت پہونچی، اس تنقید وملامت خلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک دوسرے مخلص شیخ بدیع الدین کو اسی قید خانہ سے لکھتے ہیں:-

"جب یہ فقیر اس قلعہ میں پہونچا تو اوائل حال ہی میں محسوس ہوتا تھا کہ ملامتِ خلق کے انوار شہروں اور دیہاتوں سے نورانی بادلوں کی طرح پے درپے پہونچ رہے ہیں، اور میرے معاملہ کو پستی سے بلندی کی طرف لئے جارہے ہیں، برسوں تربیت جمال سے میری منزلیں طے کرائی گئیں، اب تربیت جلال سے قطع مسافت کرائی جارہی ہے، لہٰذا آپ مقام صبر بلکہ مقام رضا میں رہیں، اور جمال وجلال کو مساوی جانیں"[۱]

حضرات صاحبزادگان والاشان کو بھی قید خانہ سے صبر وتسکین اور شکر ورضا کی ہدایت فرماتے رہے، اور توجہ الی اللہ، دعاومناجات اور ذکر وتلاوت اور ماسوا اللہ کی نفی اور اپنی تعلیم وتکمیل میں مشغول رہنے کی تاکید فرماتے رہے[۲]۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے اس حبس بے جا کا اثر ہندوستان کے صحیح الاعتقاد امراء اور اراکین سلطنت پر بُرا پڑا، بعض جگہ شورش اور انتشار کے آثار بھی ظاہر ہوئے[۳]، عبدالرحیم خانِ خاناں، خان اعظم، سید صدر جہاں، خان جہاں لودھی وغیرہ بھی جہانگیر کے اس اقدام سے آزردہ تھے، اس شورش وانتشار کی معاصر تاریخ سے زیادہ شہادتیں نہیں ملتیں، اور وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا حضرت مجدد کی

---

۱ مکتوب ۶ دفتر سوم حصہ ہشتم ۲ مکتوب ۷ دفتر سوم حصہ ہشتم بنام حضرت خواجہ محمد سعید وخواجہ محمد معصوم۔

۳ اس سلسلہ میں مہابت خاں کی بغاوت کا بھی حوالہ دیا گیا ہے لیکن یاد رہے کہ مہابت خاں کی بغاوت کا واقعہ ۱۰۳۵ھ کا ہے، جب کہ حضرت مجدد کی رہائی کو ۴-۵ برس ہوچکے تھے، اور آپ اس دار فانی سے رحلت فرما چکے تھے۔

اسیری سے کتنا تعلق تھا:-

بہر حال بادشاہ کو (کسی وجہ سے بھی[۱]) اپنے اس اقدام سے ندامت ہوئی یا اس نے اتنی مدت کی اسیری کو کافی سمجھا اور آپ کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کرکے تشریف لانے کی دعوت دی حضرت مجدد کامل ایک سال قلعۂ گوالیار میں رہے، اس طرح آپ کی رہائی جمادی الآخرہ ۱۰۲۹ھ (مئی ۱۶۲۰ء) میں ہوئی ہوگی۔

لشکر شاہی اور بادشاہ کی رفاقت اور اس کے دینی اثرات وبرکات

حضرت مجدد بڑی عزت واحترام کے ساتھ قلعہ سے باہر تشریف لائے، تین یوم سرہند قیام فرماکر معسکر شاہی آگرہ میں تشریف لے گئے، ولی عہد شہزادہ خرم اور وزیر اعظم نے آپ کا استقبال کیا، مگر بادشاہ نے حکم دیا کہ چند روز آپ ہمارے لشکر میں رہیں، آپ نے منظور فرمایا، اس رفاقت سے بادشاہ اور اہل لشکر کو بہت نفع پہونچا، جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ میں نے خلعت اور ہزار روپیہ خرچ عنایت کیا، اور جانے اور ساتھ رہنے کا اختیار دیا، انھوں نے ہمرکابی کو ترجیح دی[۲]۔

حضرت مجدد نے لشکر کی اس رفاقت اور اس کے فوائد وبرکات کے متعلق صاحبزادوں کو لکھا ہے کہ لشکر میں اس طرح بے اختیار و بے رغبت رہنا بہت ہی غنیمت جانتا ہوں، اور اس عرصہ کی ایک ساعت کو دوسری جگہوں کی بہت سی ساعتوں سے بہتر تصور کرتا ہوں[۳]۔

---

۱ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کو خواب میں زیارت نبوی ہوئی اور اس نے دیکھا کہ سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم بطور تأسف اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے فرما رہے ہیں کہ "جہانگیر تو نے کتنے بڑے شخص کو قید کر دیا"۔

۲ توزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۶۱ (انگریزی ترجمہ) ۳ مکتوب ۴۳ دفتر سوم۔

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"الحمد للہ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفےٰ، اس طرف کے احوال واوضاع حمد کے لائق ہیں، عجیب وغریب صحبتیں گزر رہی ہیں، اور اللہ تعالےٰ کی عنایت سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ کی ان گفتگوؤں میں سرِمو سستی اور مداہنت دخل نہیں پاتی۔

اللہ تعالےٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں بیان ہوتی ہیں، جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں، اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر چاہئے"[1]

ایک شاہی مجلس کے بارے میں جو اسی زمانہ میں پیش آئی تھی، ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"فرزندان گرامی کا صحیفۂ شریفہ پہونچا، اللہ تعالےٰ کی حمد ہے کہ صحبت وعافیت سے ہے، ایک تازہ معاملہ جو آج ظاہر ہوا ہے لکھتا ہوں، اچھی طرح سماعت کریں، آج شنبہ کی رات کو بادشاہی مجلس میں گیا تھا، ایک پہر رات گزرے وہاں سے واپس آیا، اور تین سی پارہ قرآن مجید حافظ سے سنا، دوپہر سے زیادہ رات گزر چکی تھی کہ نیند میسر ہوئی"[2]

ایک دوسرے مکتوب میں جو خواجہ حسام الدین کو لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں :-

"برخورداران ورفقاء میں سے جو بھی ساتھ ہے، ان سب کو وابستگی حاصل ہے اور ان کے احوال میں ترقی ہے، ان کے واسطے یہ چھاؤنی گویا کہ خانقاہ بن گئی ہے"[3]

لشکر شاہی کے ساتھ لاہور پہونچے، وہاں سے سرہند کوچ ہوا، سرہند میں حضرت نے بادشاہ کی ضیافت فرمائی، حضرت کی خواہش سرہند رہ جانے کی تھی، لیکن بادشاہ نے

---

[1] مکتوب ۱۰۶ دفتر سوم [2] مکتوب ۸۷ دفتر سوم، عبارتوں کے تراجم "حضرت مجدد الف ثانیؒ" تالیف مولانا سید زوار حسین سے ماخوذ ہیں۔ [3] مکتوب ۷۲ دفتر سوم۔

آپ کی جُدائی گوارا نہ کی وہاں سے دہلی روانگی ہوئی، مختلف مقامات پر مختصر قیام بھی رہا۔

جہانگیر پر اثر

بعض کتابوں میں جو زمانۂ حال میں حضرت مجدد کی سوانح حیات میں لکھی گئی ہیں جہانگیر کی حضرت کے ساتھ گہری عقیدت اور باقاعدہ بیعت وارادت کو دکھایا گیا ہے، لیکن اس کا کوئی مستند تاریخی ثبوت نہیں ملتا، توزک میں جہانگیر نے کئی مقامات پر جس انداز میں حضرت کا ذکر کیا ہے، اس سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی، وہ نشۂ سلطانی میں کتنا ہی مست ہو اور اس کا انداز تحریر کیسا ہی شاہانہ ہو وہ اپنے شیخ کا اس انداز میں ذکر نہیں کر سکتا، پروفیسر فریان نے اپنی کتاب (ص ۳۵، ۳۶) میں بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جہانگیر کی ارادت ثابت نہیں، اور اس میں کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا، دوسرے قدیم سوانح نگاروں نے نہ جہانگیر کی بیعت کا ذکر کیا ہے، نہ شاہ جہاں کی، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہانگیر نے اس رفاقت سے فائدہ اٹھایا، اس کے اندر نئے دینی رجحان پیدا ہونے، منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر، اور مفتوحہ علاقوں میں دینی مدارس کے قیام سے دلچسپی میں اس کو بہت دخل تھا، ۱۰۳۱ھ میں قلعہ کانگڑہ کی فتح کے موقعہ پر اس نے جس طرح اپنی اسلامیت کا اظہار کیا، اور وہاں شعائر اسلام کا اجراء کرایا[1] اس سے بھی اس تبدیلی اور دینی ترقی کا پتہ چلتا ہے، جس کو مجدد صاحب کی شرف ہمرکابی کا فیض کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو توزک جہانگیری ص ۳۴۴ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو باب ہفتم

قُربِ سفر اور اس کے انتظامات

خواجہ محمد کشمی لکھتے ہیں کہ ۱۰۳۲ھ تھا، اور آپ اجمیر میں تشریف رکھتے تھے، آپ نے فرمایا کہ سفر آخرت کے دن قریب ہیں، مخدوم زادگان کو جو اس وقت سرہند میں تھے، ایک خط میں تحریر فرمایا کہ "ایام انقراضِ عمر نزدیک و فرزندان دور" (زندگی کے اختتام کے دن قریب ہیں اور فرزند دور) صاحبزادگان اس خط کو پاتے ہی اجمیر حاضر ہوئے، ایک دن خلوت میں دونوں فرزندوں (خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم) سے فرمایا کہ "مجھے اب اس دنیا سے کسی طرح کی دلچسپی اور اس کی طرف التفات نہیں، اب اس عالم کا خیال غالب ہے، اور سفر کے دن قریب معلوم ہوتے ہیں"[1]۔

حضرت مجدد کا قیام لشکر سے واپسی پر سرہند میں دس ماہ ۸ یا ۹ دن رہا[2]، جب اجمیر سے سرہند معاودت فرمائی تو وہاں پہونچ کر تمام تعلقات سے انقطاع فرما لیا اور خلوت اختیار کر لی، سوائے مخدوم زادوں اور دو تین مخصوص خادموں[3] کے کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی، سوائے نماز پنجگانہ اور جمعہ کے باہر تشریف نہیں لاتے تھے، سارا وقت ذکر و استغفار اور ظاہری و باطنی مشغولی میں گزرتا جو "وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" (اور سب سے منقطع ہو کر

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۲۸۳ [2] "حضرت مجدد اور ان کے ناقدین" ص ۱۶۴-۱۶۵

[3] انہی خوش نصیبوں میں خواجہ محمد ہاشم کشمی بھی تھے لیکن وہ وفات سے سات ماہ پہلے رجب ۱۰۳۳ھ میں اپنے اہل و عیال کو دکن سے لانے کے لئے (جہاں اس زمانہ میں بدامنی و انتشار تھا) چلے گئے، اس عرصہ میں شیخ بدرالدین سرہندی حاضر خدمت رہے، اور زندگی کے آخری ایام کے حالات "زبدۃ المقامات" میں انہی کے حوالہ سے نقل کئے گئے ہیں، اس میں صاحبزادگان والاشان کی دی ہوئی معلومات بھی ہیں۔

اسی کے ہو رہو) کی تفسیر تھی۔

وسط ذی الحجہ سے ضیق النفس کے عارضہ میں شدت ہوئی، گریہ کا غلبہ ہوتا، اور جب ضعف کی شدت ہوتی تو "اللھم الرفیق الأعلیٰ" زبان پر جاری ہوتا، اسی عرصہ میں چند دن صحت کے ساتھ گزرے، اور مغموم و مجروح دلوں کو کچھ تسکین ہوئی، اسی حالت میں فرماتے تھے کہ "ضعف کی شدت میں وہ حلاوت و لذت محسوس ہوتی تھی جس کا اس چند روزہ صحت میں پتہ نہیں" اس حالت میں بکثرت صدقہ اور خیرات فرمائی، ۱۲ محرم کو فرمایا کہ "مجھے بتایا گیا ہے کہ پینتالیس[1] دن کے اندر تمہیں اس عالم سے دوسرے عالم کا سفر کرایا جائے گا، اور مجھے قبر کی جگہ بھی دکھائی گئی ہے" ایک دن صاحبزادگان نے دیکھا کہ آپ پر گریہ غالب ہے، انھوں نے سبب دریافت کیا، فرمایا کہ شوق وصال! صاحبزادوں نے کہا کہ ہمارے حق میں اس قدر (خلاف معمول) بے مہری و بے التفاتی کیوں ہے؟ فرمایا کہ "اللہ کی ذات تم سے زیادہ محبوب ہے"۔

۲۲ صفر کو خدام و اعزہ سے فرمایا کہ آج چالیس دن پورے ہو گئے، دیکھنا چاہئے کہ اس سات، آٹھ دن میں کیا پیش آتا ہے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایات بے غایات اور انعامات بے حساب کا تذکرہ فرماتے رہے، ۲۳ صفر کو اپنی تمام پوشاکیں اور کپڑے خدام کو تقسیم کر دیئے، جسم مبارک پر چونکہ کوئی روئی دار کپڑا نہ تھا، ٹھنڈی ہوا کا اثر ہوا، اور دوبارہ بخار ہو گیا، اور جیسا کہ حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کا مزاج مبارک بیماری سے قلیل افاقے کے بعد دوبارہ ناساز ہوا، یہ سنت بھی ادا ہوئی۔

اس ضعف کی حالت میں علوم عالیہ کا افاضہ شدت کے ساتھ تھا، صاحبزادہ عالی قدر

---

[1] یہ مہینہ غالباً نومبر کا تھا، اس لئے کہ انتقال دسمبر کے مہینہ میں ہوا ہے، اس علاقہ میں یہ مہینہ سردی کا ہے۔

خواجہ محمد سعید نے عرض کیا کہ حضرت کا ضعف اس گفتگو کا متحمل نہیں، ان حقائق و معارف
کے بیان کو کسی اور وقت کے لئے ملتوی رکھیں! فرمایا کہ فرزند عزیز! اب وقت و فرصت
کس کو ہے کہ دوسرے وقت پر ان مضامین کو اٹھا رکھا جائے؟ غلبۂ ضعف کے ان دنوں
میں بھی نماز بغیر جماعت کے ادا نہیں فرمائی، صرف زندگی کے آخری چار پانچ دنوں میں
لوگوں کے کہنے سننے سے تنہا پڑھی، ادعیہ اور اوراد ماثورہ اور ذکر و مراقبہ میں کوئی فتور واقع
نہیں ہوا، شریعت و طریقت کے آداب و احکام میں سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا'
ایک رات ثلث اخیر میں اٹھ کر وضو فرمایا، تہجد کھڑے ہو کر پڑھی، فرمایا کہ یہ ہماری آخری
تہجد کی نماز ہے، اور یہی ہوا کہ اس کے بعد تہجد کی نوبت نہیں آئی۔

وصال سے کچھ پیشتر غیبت اور استغراق کا غلبہ ہوا، مخدوم زادوں نے عرض کیا کہ
یہ استغراق و غیبت آپ کو ضعف کی وجہ سے ہے یا استغراق کی وجہ سے؟ فرمایا استغراق
کی وجہ سے، بعض معاملات و حقائق درپیش ہیں، اس حالتِ ضعف و شدت و علالت
میں سنت کی پابندی، بدعت سے اجتناب اور دوام ذکر و مراقبہ کی وصیت فرماتے
تھے، ارشاد فرماتے تھے کہ سنت کو دانتوں سے پکڑنا چاہئے، فرمایا کہ صاحب شریعت
علیہ الصلاۃ والسلام نے "الدین النصیحۃ" کے مطابق امت کی خیر خواہی اور نیک صلاح
کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، دین کی معتبر کتابوں سے متابعت کامل کا راستہ حاصل کرنا
اور اس پر کاربند ہونا چاہئے، فرمایا کہ میری تجہیز و تکفین میں سنت پر پورا عمل کیا جائے
کوئی سنت ترک نہ کی جائے، اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ چونکہ میری رحلت تمہاری رحلت
سے پہلے ہوتی معلوم ہوتی ہے' اس لئے میرے کفن کا سامان اپنے مہر سے کرنا، یہ بھی فرمایا کہ
میری قبر کسی گمنام جگہ پر بنائی جائے، مخدوم زادوں نے عرض کیا کہ پہلے تو حضرت کی

وصیت تھی کہ ہمارے برادر اکبر خواجہ محمد صادق[1] جہاں دفن ہیں وہیں دفن کیا جائے، اب حضرت
یوں فرماتے ہیں، فرمایا کہ ہاں، اس وقت مجھ پر یہی شوق غالب ہے، جب آپ نے دیکھا کہ
صاحبزادے یہ سن کر خاموش ہو گئے اور ان کو اس میں تردد ہے تو فرمایا، اگر ایسا نہ کر سکو تو بیرونِ شہر
والد بزرگوار کے پاس یا باغ میں کہیں دفن کر دینا، میری قبر کو خام رکھنا تاکہ تھوڑے دنوں میں
اس کا نشان باقی نہ رہے' اس پر بھی جب دیکھا کہ صاحبزادے سوچ میں پڑ گئے تو مسکرا کر فرمایا کہ
تمہیں اختیار ہے' جہاں مناسب سمجھو سپرد خاک کر دینا۔

سہ شنبہ کی شب اور ۲۷ صفر کی تاریخ تھی جس کے اگلے روز سفر آخرت تھا، ان خدام
سے جنھوں نے راتوں کو جاگ کر خدمت اور تیمارداری کی تھی' فرمایا کہ تم نے بڑی محنت کی بس
اس رات کی محنت اور رہ گئی ہے' پھر فرصت! آخر شب میں فرمایا "اصبح لیلا" (رات کسی طرح
صبح کر) دن ہوا تو چاشت کے وقت پیشاب کے لئے طشت منگوایا جس میں ریت نہیں تھی،
چھینٹیں آنے کے خیال سے اس کو واپس کر دیا کسی نے کہا کہ حکیم کو قارورہ دکھانا چاہئے،
فرمایا میں وضو شکست نہیں کرتا، مجھے بستر پر لٹا دو آپ کو گویا اس کا انکشاف ہو گیا کہ اب کچھ
ہی دیر کے بعد اس عالم سے کوچ ہے' وضو کی فرصت نہ ہو گی، جب بستر پر لٹا دیا گیا تو طریقۂ
مسنون کے مطابق دائیں رخسارے کے نیچے دایاں ہاتھ رکھ کر ذکر میں مشغول ہو گئے مخدوم زادوں نے
سانس کی تیزی دیکھ کر عرض کیا کہ مزاج مبارک کیسا ہے؟ فرمایا کہ ہم اچھے ہیں! فرمایا کہ میں نے جو دو
رکعت نماز پڑھی ہے کافی ہے اس کے بعد سوائے اسم ذات کے ذکر کے کوئی بات نہیں فرمائی ایک لمحہ
کے بعد جان جاناں کو سپرد کر دی' یہ واقعہ روز سہ شنبہ چاشت کے وقت ۲۸ ماہِ صفر ۱۰۳۴ھ کا ہے[2]۔

---

[1] حضرت مجدد کے فرزند اکبر جن کا انتقال ۹ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ میں ہوا۔

[2] مطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء (حضرت مجدد اور ان کے ناقدین)۔

کہ روح نے قفصِ عنصری سے اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کی "یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً" اس وقت عمر مبارک ترسٹھ [۶۳] سال تھی[۱] صفر کا وہ مہینہ ۲۹ کا تھا، دوسرے دن ربیع الاول کا مہینہ شروع ہو رہا تھا۔

جب غسل کے لئے لایا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ آپ نماز کے طریقہ پر ہاتھ باندھے ہوئے بائیں ہاتھ کی کلائی پر داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور چھنگلیا سے حلقہ کئے ہوئے ہیں مخدوم زادوں نے انتقال کے بعد ہاتھ پھیلا دیئے لیکن غسل کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے دونوں دست مبارک پہلی ہیئت کے مطابق حالت نماز کی طرح بندھ گئے اور یہ حالت آخر تک قائم رہی، دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ تبسم فرما رہے ہیں گویا ؎

ہم چناں زی کہ وقت رفتن تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں

ہاتھوں کو کتنا ہی الگ کیا جاتا وہ نماز کی کیفیت میں ایک دوسرے پر خود بخود آجاتے تجہیز و تکفین کا سامان سب سنت کے مطابق کیا گیا، فرزند کلاں خواجہ محمد سعید نے نماز جنازہ کی امامت کی اور جسد مبارک کو آخری آرامگاہ میں پہونچا دیا گیا۔[۲]

عادات و معمولات

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے جو حضرت مجدد کی خدمت میں ان کی آخری حیات میں تین [۳] سال سفر و حضر میں ساتھ رہے ہیں، حضرت کے عادات و معمولات کو تفصیل سے قلمبند کیا ہے[۳]

۱؎ مولانا زید ابوالحسن صاحب کی تحقیق ہے کہ عمر شریف قمری حساب سے باسٹھ [۶۲] سال چار [۴] ماہ چودہ [۱۴] دن اور شمسی حساب سے ساٹھ [۶۰] سال چھ ماہ پانچ دن کی ہوئی (حضرت مجدد اور ان کے ناقدین) ص۲۲ ۲؎ ملخصاً از زبدۃ المقامات ص۲۵۶-۳۰۰ ۳؎ ملاحظہ ہو زبدۃ المقامات ص۱۹۲-۲۱۵

یہاں اس کا خلاصہ لکھا جاتا ہے، قدرے اضافہ مولانا بدر الدین سرہندی کی کتاب "حضرات القدس" سے کیا گیا ہے[۱]

"حضرت کو بارہا یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہمارا عمل اور کوشش بھی کیا چیز ہے جو کچھ ہے وہ سب فضل خداوندی ہے، لیکن اگر اس کا کوئی ذریعہ کہا جا سکتا ہے تو وہ سید الاولین والآخرین صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت ہے جس پر مدار کار سمجھتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی عطا فرمایا ہے، اسی پیروی اور اتباع کی راہ سے عطا فرمایا ہے، جزئیاً و کلیاً، اور جو کچھ نصیب نہیں ہوا، وہ محض اس وجہ سے کہ بحکم بشریت اتباع کامل میں نقص و فتور ہونے کی وجہ سے ایک روز فرمایا کہ ایک دن سہواً جائے ضرور میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھ دیا، اس دن بہت سے احوال سے محرومی رہی، ایک مرتبہ صالح ختلانی سے فرمایا کہ ہماری تھیلی سے تھوڑی سی لونگیں لے آؤ! وہ گئے اور چھ لونگیں لے آئے، آپ نے دیکھ کر ناگواری سے فرمایا کہ ہمارے صوفی کو ابھی تک یہ خبر نہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ وتر ویحب الوتر" رعایت وتر مستحب ہے، مستحب کو لوگوں نے کیا سمجھا ہے، اگر دنیا و آخرت کو کسی ایسے نیک عمل کے بدلے میں دے دیا جائے جو اللہ کو پسند ہے تو اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں، ایک خادم کہتے ہیں کہ میں نے شیخ محمد بن فضل اللہ قدس سرہ سے پوچھا کہ آپ نے سرہند میں کیا دیکھا، کچھ ہمیں بھی سنایئے، انھوں نے کہا کہ مجھ بے بصیر کو کیا نظر آسکتا ہے، لیکن میں نے اتنا دیکھا کہ سنت کے آداب اور اس کی باریک باتوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی فروگذاشت نہیں فرماتے، کسی اور سے اتنا اہتمام نہایت مشکل ہے۔

۱؎ حضرات القدس کی عبارت واوین " " کے درمیان کر دی گئی ہے اور اس کے صفحات کا حوالہ دے دیا گیا ہے، اس کے علاوہ جو کچھ مضمون ہے وہ زبدۃ المقامات سے ماخوذ ہے۔

ایک دوسرے حاضر باش نے کہا کہ ان حضرات کے احوال باطنی ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ حضرت کے حالات دیکھ کر اولیائے متقدمین کے حالات پر (جو کتابوں میں لکھے گئے ہیں) یقین آگیا، اور معلوم ہوا کہ ان میں مبالغہ نہیں تھا، بلکہ احساس ہوا کہ لکھنے والوں نے کم لکھا ہے، سارا دن اسی مشغولی میں گزرتا، ایک خادم خاص نے (جس سے وضو جانماز اور عبادات کے سلسلہ کی خدمات متعلق تھیں) کہا کہ صرف قیلولہ کے وقت اور رات کے ثلث دوم میں مجھے کچھ فرصت ملتی ہے، اپنے خدام و رفقاء کو بھی بکثرت دوام ذکر حضور اور مراقبہ کی تاکید فرماتے رہتے تھے، اور ارشاد ہوتا تھا کہ یہ دنیا دار العمل ہے، اور مزرعۂ آخرت حضور باطن کو آداب و اعمال ظاہری کے ساتھ جمع رکھنا چاہئے، حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے (باوجود محبوبیت اور علو مرتبہ کے) پائے مبارک کثرت عبادت سے متورم ہوجاتے تھے۔

اگرچہ حضرت کو مسائل فقہیہ کا استحضار تھا، اور اصول فقہ میں ملکۂ تامہ رکھتے تھے، لیکن بربنائے احتیاط مسائل میں معتبر کتابوں کی طرف رجوع فرماتے، اور سفر و حضر میں ان کو ساتھ رکھتے، عمل مُفتیٰ بہ قول اور فقہائے کبار کے ترجیح دیئے ہوئے مسئلہ پر ہوتا، اکثر خود امامت فرماتے، اور اس کی حکمت ایک مرتبہ ارشاد فرمائی کہ "حضرات شافعیہؒ و مالکیہؒ کے یہاں قرأت فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اس لئے وہ امام کے پیچھے بھی فاتحہ پڑھتے ہیں، اور بہت سی احادیثؒ صریحہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں، لیکن ہمارے امام ابو حنیفہؒ کے یہاں مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں، اور جمہور فقہائے حنفیہؒ کا بھی یہی مذہب ہے، چونکہ میں مذاہب کے جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اس لئے اس کی آسان صورت یہی معلوم ہوئی کہ خود امامت کروں[1]"۔

[1] خواجہ محمد ہاشم کشمی نے اسی فصل میں دوسری جگہ لکھا ہے "و فاتحہ خلف الامام ہمی خواندند و آں را مستحسن ہمی شمردند" ص ۲۰۹۔

گرمی ہو، سردی ہو، حضرت کا سفر و حضر میں معمول یہ تھا کہ اکثر رات کو نصف اخیر میں اور کبھی ثلث اخیر میں بستر سے اٹھ جاتے، اس وقت کے لئے احادیث میں جو دعائیں آئی ہیں، وہ پڑھتے، وضو بڑے اہتمام و احتیاط (اسباغ وضو) کے ساتھ فرماتے کہ پانی اعضاء کو پورے طور پر پہونچ جائے، دوسرے کو اس کی اجازت نہ دیتے کہ وہ پانی ڈالے، وضو کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ ہوتا، البتہ پائے مبارک دھوتے وقت اس کو شمال یا جنوب کی طرف موڑ لیتے، مسواک کی بڑی پابندی فرماتے، اور جو دعائیں حدیث میں آئی ہیں، وہ پڑھتے، پھر بڑے حضور و جمعیت اور طول قرأت کے ساتھ نوافل پڑھتے، نوافل سے فارغ ہونے کے بعد خشوع و استغراق کے ساتھ مراقبہ میں مشغول ہوجاتے، فجر سے کچھ پہلے سنت کے مطابق جھپکی لے لیتے اور صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے اٹھ جاتے، تازہ وضو فرماتے، فجر کی سنت دولت خانہ ہی پر ادا فرماتے، سنت و فرض کے درمیان سرّی طریقہ پر "سبحان اللہ وبحمدہ۔ سبحان اللہ العظیم" پڑھتے رہتے، فجر کی نماز آخر غلس (اندھیرے) اور اول اسفار (روشنی) میں ادا کرتے، تاکہ غلس و اسفار کے بارے میں دونوں مذہبوں پر عمل ہوجائے، خود امامت کرتے اور نماز فجر میں طوال مفصل[1] (جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے) پڑھتے تھے[2]۔ فجر کی نماز کے بعد سے اشراق کے وقت تک حلقہ فرماتے، پھر طویل نماز اشراق پڑھ کر اور تسبیحات و ادعیۂ ماثورہ سے فارغ ہو کر دولت خانہ میں تشریف لاتے، اور اہل خانہ و متعلقین کی خیر خبر لیتے، اور جو امور روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے متعلق ہدایات دیتے، پھر خلوت میں تشریف لے جاتے، اور پوری توجہ کے ساتھ تلاوت قرآن میں مشغول ہوجاتے، تلاوت کے بعد طالبین کو طلب فرما کر ان کے حالات کی تحقیق و ہدایات فرماتے، اسی وقت اخص اصحاب کو بلا کر مضامین و علوم خاصہ سے

[1] سورۂ حجرات سے سورۃ البروج تک کی سورتیں طوال مفصل کہلاتی ہیں [2] حضرات القدس ص ۸۲

ان کو مستفید فرماتے اور ان کو توجہ دیتے، اور وہ اپنے حالات و کیفیات سے مطلع کرتے، اور آپ ان کو علو ہمت، اتباع سنت، اور دوام ذکر حضور اور اخفائے حال کی تاکید فرماتے، کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ساری کائنات اس کے مقابلے میں وہ حیثیت بھی نہیں رکھتی جو ایک قطرہ کی دریائے محیط کے سامنے ہے، خدام و حاضرین کو کتب فقہ کے مطالعہ کی تاکید اور علماء سے احکام شریعت کی تحقیق کی ترغیب فرماتے۔

فرماتے تھے کہ کشف میں ایسا نظر آتا ہے کہ سارا عالم بدعات کے گرداب ظلمانی میں ڈوب گیا ہے، اور اس میں سنت کا نور کرمک شب تاب (جگنو) کی طرح چمک رہا ہے، غیبت اور مسلمانوں کی عیب چینی سے سخت احتراز تھا، خدام بھی آپ کے احترام و ہیبت سے آپ کے سامنے کسی کی غیبت نہیں کر سکتے تھے، اپنے حالات و کیفیات کا بے انتہا اخفاء فرماتے تھے، میں نے دو سال کی مدت میں صرف تین چار بار ایسا دیکھا کہ اشک کے چند قطرے چہرۂ مبارک پر ٹپک پڑے، ایسے تین چار بار مضامین عالیہ بیان کرتے وقت رخسار مبارک اور آنکھوں میں سرخی دیکھی۔

"ضحوۂ کبریٰ"[1] اور نماز چاشت کے بعد حرم سرا تشریف لے جاتے اور گھر والوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، صاحبزادوں یا اہل تعلق میں سے اگر کوئی چیز تیار کرتا تو پیش کرتا، فرزندوں اور خدام میں سے اگر کوئی اس وقت موجود نہ ہوتا تو اس کا حصہ الگ رکھوا دیتے "کھانے میں اکثر کھلانے میں مشغول رہتے اور زیادہ وقت دوسروں کی خبر گیری اور خاطر میں گزرتا، بعض اوقات برائے نام تناول فرماتے، معلوم ہوتا تھا جیسے کھانے کی احتیاج نہیں، محض سنت کی پیروی

[1] ضحوۂ کبریٰ صبح صادق اور غروب آفتاب کے ٹھیک بیچ کا وقت (انتصاف النہار الشرعی وھو الضحوۃ الکبریٰ) شامی ج ۱ ص ۲۴۸

مقصود ہے"[1] آخری زندگی میں جب گوشہ نشینی اختیار کی اور روزہ رکھتے تو کھانا بھی خلوت خانہ میں تناول فرماتے، کھانے کے بعد فاتحہ پڑھنے کا (جیسا کہ عام طور پر رواج ہے) معمول نہیں تھا، اس لئے کہ صحیح احادیث میں نہیں آیا ہے" فرائض کے بعد بھی فاتحہ پڑھنے کا جیسا کہ بعض مشائخ کے یہاں دستور ہے معمول نہیں تھا"

دوپہر کا کھانا تناول کرنے کے بعد سنت کے مطابق قیلولہ فرماتے، موذن ظہر کے اول وقت اذان دیتا، آپ وضو کر کے سنت زوال پڑھتے، ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر کسی حافظ سے ایک پارہ یا کم و بیش سنتے، اور اگر درس ہوتا تو درس دیتے، نماز عصر بھی مثلین ہو جانے کے بعد اول وقت میں ادا فرماتے، عصر کے بعد غروب تک اصحاب و خدام کے ساتھ سکوت و مراقبہ میں مشغول اور خدام کی باطنی کیفیات کی طرف متوجہ رہتے، نماز مغرب کی سنت کے بعد اوابین ادا کرتے، کبھی چار رکعت کبھی چھ رکعت، نماز عشاء شفق ابیض کے زوال کے بعد فوراً پڑھ لیتے، وتر کی دعائے قنوت میں احناف و شوافع کی دعائے قنوت کو جمع کر کے پڑھ لیتے، نماز وتر کے بعد کبھی دو رکعت بیٹھ کر کبھی کھڑے ہو کر ادا فرماتے، آخر زمانہ میں شاذ و نادر یہ دو رکعتیں پڑھیں، وتر کے بعد دو سجدے جو متعارف ہیں نہیں فرماتے تھے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے، نماز عشاء اور وتر کے بعد جلد آرام فرمانے کے لئے لیٹ جاتے اور ادعیۂ ماثورہ پڑھنے میں مشغول ہو جاتے، درود کثرت سے پڑھتے، خاص طور پر شب جمعہ اور روز جمعہ، شب دوشنبہ اور روز دوشنبہ، تلاوت کے وقت چہرۂ مبارک اور پڑھنے کے انداز سے سامعین کو ایسا محسوس ہوتا کہ اسرار قرآنی و برکات آیات کا فیضان ہو رہا ہے، نماز اور بیرون نماز میں خوف کی آیات پڑھتے، یا جن آیات میں تعجب و استفہام آیا ہے

[1] حضرات القدس ص ۸۷

اس کا انداز و لہجہ پیدا ہو جاتا، نماز میں تمام سنن و مندوبات اور آداب کی رعایت فرماتے، تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد کا بھی اہتمام کرتے، تراویح کے علاوہ کوئی نفل نماز جماعت سے ادا نہ کرتے، لوگوں کو شب عاشورا یا شب قدر میں جماعت کے ساتھ نوافل ادا کرنے سے منع فرماتے۔

مریضوں کی عیادت کے لئے جاتے اور اس موقع پر جو دعائیں آئی ہیں وہ پڑھتے، زیارت قبور کے لئے بھی تشریف لے جاتے بعض اعلیٰ دینی کتابوں (مثلاً تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری مشکوٰۃ المصابیح، فقہ، واصول وکلام میں ہدایہ، بزدوی، مواقف اور تصوف میں عوارف المعارف کا درس دیتے لیکن اس میں بحث ومباحثہ اور قیل وقال نہ ہوتا، اخیر عمر میں درس سے اشتغال کم رہ گیا تھا طلباء کو تحصیل علوم دینی کی تاکید فرماتے اور تحصیل علم کو سلوک و طریقہ پر مقدم رکھتے، کثرت سے حمد واستغفار کرتے اور تھوڑی سی نعمت پر بہت زیادہ شکر ادا کرتے۔

رمضان کا بڑا اہتمام فرماتے، تین سے کم ختم قرآن نہ کرتے، خود حافظ قرآن تھے اس لئے غیر رمضان میں بھی زبانی تلاوت فرماتے اور مختلف حلقوں میں بھی سنتے رہتے[1]۔ افطار میں جیساکہ احادیث میں آیا ہے تعجیل اور سحور میں تاخیر سے کام لیتے اور اس کا اہتمام فرماتے[2]۔"

"ادائے زکوٰۃ میں طریقہ یہ تھا کہ جب کہیں سے کوئی ہدیہ یا نذر آتی تو حولان حول یا سال گزرنے کا انتظار نہ کرتے، ان فتوحات کے وقت فوراً حساب کر کے زکوٰۃ ادا کر دیتے، اور ان میں اہل صلاح، بیوگان اور اہل قرابت کو ترجیح دیتے، حج کا کئی بار عزم مصمم فرمایا، لیکن نوبت نہ آئی ہمیشہ اس شوق میں رہے اور اسی شوق میں اس دنیا سے سفر کیا۔

اخلاق وتواضع اور خلق اللہ پر شفقت، رضا وتسلیم کی خو انتہا درجہ پر پہونچی ہوئی تھی،

[1] زبدۃ المقامات ملخصاً از ص ۱۹۳-۲۱۵ [2] حضرات القدس ص ۹۱

آپ کے اعزہ اور اہل تعلق کو ظالم حاکموں سے بڑی ایذاء پہونچی لیکن تسلیم ورضا سے کام لیا، اور کبھی اس کی شکایت زبان پر نہیں آئی، اگر کوئی آپ سے ملاقات کے لئے آتا تو تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور صدر مجلس میں اس کو جگہ دیتے، اور اسی کے ذوق ومناسبت کی باتیں کرتے غیر مسلموں کی تعظیم خواہ وہ حاکم ہوں اور جاہ واقتدار رکھتے ہوں نہیں کرتے تھے، سلام میں ہمیشہ سبقت فرماتے تھے، یاد نہیں آتا کہ کسی نے سلام میں آپ سے سبقت کی ہو، اہل حقوق کی حد درجہ رعایت فرماتے، کسی کے انتقال کی خبر آتی تو متاثر ہوتے اور کلمۂ ترجیع (انا للہ وانا الیہ راجعون) پڑھتے، اور نماز جنازہ میں شرکت کرتے اور دعا وایصال ثواب فرماتے[1]۔"

"آپ کا لباس ایک کرتہ جس کے دونوں کاندھوں پر چاک ہوتا تھا، اس کے اوپر ایک عبا، لیکن گرمیوں میں اکثر کرتہ ہوتا، دستار سر پر لپیٹ لیتے، جیساکہ سنت ہے اور شملہ دونوں کاندھوں کے درمیان پیٹھ پر پڑا ہوتا (سوائے استنجا اور قضائے حاجت کے وقت) پائجامہ ٹخنوں سے اوپر ہوتا، جمعہ اور عیدین میں لباس فاخر پہنتے تھے، جب نیا جوڑا زیب تن کرتے تو پہلا کسی خادم یا عزیز یا مہمان کو دے دیتے، آپ کی خدمت میں پچاس ساٹھ بلکہ سو آدمیوں کے قریب ہمیشہ علماء، عارفین، مشائخ، حفاظ وشرفاء وسادات میں سے رہتے تھے، اور سب کو آپ ہی کے مطبخ سے کھانا پہونچتا تھا[2]۔"

حلیۂ مبارک

شیخ بدرالدین سرہندی نے جو حضرت کے خلفاء میں ہیں اور سترہ سال آپ کی صحبت میں رہے حضرات القدس میں آپ کا حلیہ اس طرح لکھا ہے:-

[1] حضرات القدس از شیخ بدرالدین سرہندی مطبوعہ محکمۂ اوقاف پنجاب ۱۹۷۱ء ص ۹۱-۹۲ [2] ایضاً ص ۹۲

حضرت کا رنگ گندم گوں مائل بہ بیاض تھا پیشانی اور رخسار پر ایسا نور معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں، کشادہ ابرو تھے، ابرو کمان کی طرح جھکی ہوئی، دراز، سیاہ اور باریک، آنکھیں فراخ اور کشادہ جن میں سیاہی کی جگہ بہت سیاہی اور سفیدی کی جگہ بہت سفیدی، بینی مبارک بہت باریک، لب سرخ نازک، دہانہ نہ دراز نہ کوتاہ، دانت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، اور لعل بدخشاں کی طرح چمکتے ہوئے، ڈاڑھی گھنی، باوقار، دراز و مربع تھی، رخساروں پر ریش مبارک کے بال حد سے بڑھے ہوئے نہیں، میانہ قد، نازک اندام تھے۔[1]

اولادِ امجاد

حضرت مجدد کو اللہ تعالےٰ نے سات فرزند عطا فرمائے تھے، ان میں تین صغر سنی میں حضرت کی حیات ہی میں فوت ہو گئے، شیخ محمد فرخ، شیخ محمد عیسیٰ، اور شیخ محمد اشرف جو زمانۂ شیر خوارگی میں داغ مفارقت دے گئے، فرزند کلاں خواجہ محمد صادق تکمیل علوم وسلوک کے بعد ۱۰۲۵ھ میں پچیس سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے، تین صاحبزادگان عالی قدر خواجہ محمد سعید، خواجہ محمد معصوم، اور خواجہ محمد یحییٰ، رونق بخش حیات رہے، ان چاروں کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا ؎

ایں سلسلہ از طلائے ناب ست

ایں خانہ تمام آفتاب ست

حضرت خواجہ باقی باللہ نے ان کو دیکھ کر بلند الفاظ فرمائے تھے، اور "جواہر علویہ" اور "شجرۂ طیبہ" سے تعبیر کیا، اور فرمایا تھا "فقرائے باب اللہ اند دلہائے عجیب دارند"۔

فرزند اول حضرت خواجہ محمد صادق، حضرت مجدد کے سامنے ہی درجۂ کمال کو پہونچ گئے تھے،

۱؎ ایضاً ص۱۵۵

حضرت نے ان کے متعلق بڑے بلند کلمات ارشاد فرمائے ہیں، اور ان کی اعلیٰ علمی و باطنی استعداد کی شہادت دی ہے، ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ "فرزند عزیز فقیر کے معارف کا مجموعہ اور جذب وسلوک کے مقامات کا صحیفہ ہے"۔[1]

فرزند دوم حضرت خواجہ محمد سعید ۱۰۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۰۷۰ھ میں راہی ملک بقا ہوئے، انھوں نے بھی حضرت مجدد کے سلسلہ کی اشاعت اور اہل ارادت و اہل طلب کی تعلیم و تربیت میں خاصہ حصہ لیا۔[2]

فرزند سوم حضرت خواجہ محمد معصوم تھے، جو اپنے والد نامدار کے علوم کے حامل و شارح، رازدار و امین اور خلیفہ و جانشین تھے، آپ سے طریقۂ مجددیہ اور اس کی تعلیم و اثرات کی ایسی عالمگیر اشاعت ہوئی کہ کہنے والے نے صحیح کہا ہے ؎

چراغِ ہفت کشور خواجہ معصوم

منوّر از فروغش ہند تا روم

دہلی کی مشہور عالم خانقاہ جو مرجع عرب و عجم تھی (اور جس کی مسند ارشاد پر اپنے اپنے وقت میں خواجہ سیف الدین، مرزا مظہر جان جاناں، حضرت شاہ غلام علی، اور حضرت شاہ احمد سعید متمکن رہے) آپ ہی کے سلسلہ کی تھی، اسی خانقاہ سے مولانا خالد رومی کردی حضرت شاہ غلام علی صاحب سے سلسلہ کو لے کر شام و ترکی پہونچے، جن کا سلسلہ عراق، شام، کردستان اور ترکی میں شہر شہر اور گھر گھر پھیل گیا۔[3]

۱؎ مکتوب ۲۷۷ دفتر اول، فضائل و کمالات کے لئے ملاحظہ ہو زبدۃ المقامات ص۳۰۳-۳۰۶

۲؎ آپ کے حالات و کمالات کے لئے ملاحظہ ہو "زبدۃ المقامات" ص۳۰۸-۳۱۵

۳؎ ملاحظہ ہو ان کے مناقب میں علامہ شامی صاحب "شرح در مختار" کی کتاب "سل الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی" (باقی ص۱۸۴ پر)

آپ کے مکاتیب ہر سہ اجزاء "مکتوبات امام ربانی" کی ایک طرح سے شرح اور تفصیل اور علوم ونکات کا ایک خزانہ ہے، آپ کے حالات وکمالات کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

سلطان محی الدین اورنگ زیب کو آپ سے شرف بیعت حاصل تھا، اور آپ ہی کے صاحبزادہ خواجہ سیف الدین نے اس کی سلوک میں تربیت کی، آپ نے اس کو ہندوستان کا مسلمان حکمراں بننے اور اکبری اثرات سے پورے طور پر پاک کرانے کے لئے تیار فرمایا تھا، اور آپ اس کو اپنے مکتوبات میں "شہزادۂ دین پناہ" کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۱ر شوال ۱۰۰۷ھ میں ہوئی اور وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ کو۔[1]

چوتھے صاحبزادہ خواجہ محمد یحییٰ تھے امام ربانی کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۹ سال کی تھی؛ تحصیل علوم اور تکمیل طریقت اپنے بھائیوں سے کی، وفات ۱۰۹۶ھ میں ہوئی۔[2]

(باقی ص۱۸۳ کا) اس وقت بھی اس سلسلہ کے مشائخ شام وعراق، ترکی اور کردستان میں موجود ہیں، راقم سطور نے ان میں سے متعدد کی زیارت کی ہے ان میں شیخ ابراہیم غلاثینی، شیخ ابوالخیر میدانی، شیخ محمد نبہان، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

[1] کتاب کے آخر میں آپ کا مستقل تذکرہ (نزہتہ الخواطر) سے ماخوذ ومقتبس ملاحظہ ہو۔

[2] بھوپال کے حضرت شاہ رؤوف احمد اور ان کے پوتے حضرت شاہ پیر ابو احمد اور ان کے پڑپوتے حضرت شاہ محمد یعقوب انہی کی اولاد میں ہیں۔

بابِ پنجم

حضرت مجدد کے دائرۂ "تجدید" کا مرکزی نقطہ

نبوت محمدی پر ایمان واعتماد کی تجدید

حضرت مجدد کا اصل تجدیدی کارنامہ کیا تھا؟

ان تمام اہل نظر اور انصاف پسند حضرات کا جنکی گیارھویں صدی (جس سے الف ثانی ہزارۂ دوم کا آغاز ہوتا ہے) کی اسلامی تاریخ پر عمومی اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر خصوصی نظر ہے[1] اس پر اتفاق ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی سے اسلام کی حفاظت و تقویت کا وہ تاریخ ساز اور عہد آفریں کام انجام پایا جس کو حدیث کی سادہ ومعروف اصطلاح میں "تجدید" کہا گیا ہے[2]، اور جس نے ان کے سلسلہ میں ایسی شہرت حاصل کی ہے

---

[1] جس پر کتاب کے پہلے دو ابواب میں اجمالی نظر ڈالی جاچکی ہے۔

[2] سنن ابی داؤد کی مشہور روایت ہے "ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا" (اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے کو اٹھائے گا جو اس امت کے لئے اس کے دین کو تازہ کردے گا (ابو داؤد وغیرہ) اس حدیث کی شرح اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "جامع المجددین" (از مولانا عبدالباری ندوی) پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کا فاضلانہ مقدمہ ص۱۶-۲۴

کہ وہ ان کے نام کا قائم مقام بن گیا ہے، اور جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔

یہ کام کیا تھا؟ روح و فکر اسلامی کی جلا و تازگی، وقت کے اہم ترین اور سنگین فتنوں کا سدِّباب اور استئصال، نبوت محمدی اور شریعت اسلامی کی صداقت و ابدیت پر از سرِ نو اعتقاد و اعتماد بحال کرنا، ریاضت و اشراقیت پر مبنی اس روحانی تجربہ اور تلاش حقیقت اور خدا رسی کی کوشش کی طلسم شکنی جو محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع سے بے نیاز ہو، "ہمہ اوست" اور وحدۃ الوجود کے عقیدہ اور نظریہ کی پردہ کشائی جو اپنے غلو و مبالغہ اور اشاعت و مقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہونچ چکا تھا، اور جس سے عقائد میں تزلزل اور مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا ہو رہا تھا، اور اس کے متوازی "وحدۃ الشہود" کے مسلک و نظریہ کو مدلل و مرتب شکل میں پیش کرنا، بدعات (جنھوں نے ایک مستقل تشریع کی شکل اختیار کر لی تھی) کی کھلی ہوئی تردید و مخالفت حتی کہ "بدعت حسنہ" کے وجود سے بھی انکار، اور پھر آخر میں ہندوستان میں اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدموں کے جمانے، اکبری عہد کے مخالف اسلام اثرات کے ختم کرنے اور ہندوستان میں ایک ایسا تجدیدی دینی انقلاب لانے کی حکیمانہ اور کامیاب کوشش جس کے نتیجہ میں ایک طرف اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر متمکن ہوتا ہے، دوسری طرف حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خلفاء و تلامذہ کا وہ سلسلہ وجود میں آتا ہے جو روحانی اور باطنی طور پر اسی سلسلہ سے وابستہ اور منسوب ہے، اور جس نے اشاعت و ترویج کتاب و سنت ان کی تفہیم و ترجمانی، اور ان کے سلسلۂ درس و تدریس، مدارس کے قیام، تزکیہ و تربیت باطنی، اصلاح عقائد و رسوم کے عظیم الشان کام، اور پھر آخر میں جہاد و سعی اعلاء کلمۃ اللہ کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں اسلام کو قائم اور شجر اسلام کو پھلتا پھولتا رکھا، بلکہ اس کو عالم اسلام میں دینی علوم (بالخصوص علم حدیث) اور فکر و دعوت اسلامی کا مرکز بنا دیا۔

لیکن اس عظیم و وسیع تجدیدی دائرۂ عمل کا نقطۂ مرکزی اور حضرت مجدد کا وہ اصل تجدیدی کارنامہ کیا تھا جس کو ان کے سارے تجدیدی کارناموں پر اولیت و فوقیت حاصل ہے؟

لوگوں نے اپنے اپنے ذوق و رجحان کے مطابق اس کا جواب دیا ہے۔ ع

وللناس فیما یعشقون مذاہب

ان میں تین گروہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ایک گروہ جو کہتا ہے کہ وہ اس لئے مجدد الف ثانی کہلانے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کو اسلام کے لئے دوبارہ بازیاب کیا، اور اس کو برہمنیت یا وحدت ادیان کی گود میں جانے کے بجائے دوبارہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم اور دین حجازی کی تولیت و نگرانی میں دیا اور اس کو گیارہویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) کی اہم صدی میں اس انجام اور حشر سے بچا لیا جو اس کا تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ہونے والا تھا، بلکہ درحقیقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو اس ہمہ گیر اعتقادی، ذہنی، اور تہذیبی ارتداد کے فوری خطرہ سے محفوظ کر دیا جو اکبر کی جیسی باعزم اور قوی الارادہ شخصیت اور اس کے یگانۂ روزگار مشیروں (ملا مبارک، فیضی اور ابو الفضل) کی ذہانت سے ایک امر واقعہ بن کر سامنے آ گیا تھا، یہ معنوی و روحانی انقلاب اور یہ ذہنی و تہذیبی ارتداد اس سیاسی زوال اور اقتدار کے خاتمہ سے کہیں زیادہ سنگین، دیرپا اور دوررس تھا، جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کی نوخیز غیر مسلم طاقتوں کے ابھرنے سے اور انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں کے تسلط اور اقتدار سے پیش آیا، شاید اقبالؒ نے اپنے اس مشہور شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

۲۔ دوسرے گروہ کے نزدیک ان کا اصل تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طریقت پر شریعت کی فوقیت و بالادستی کو ایسے پُراز اعتماد، مبصرانہ و تجربہ کارانہ انداز، اور اس قوت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا، اور اس سے طریقت کا شریعت کے تابع بلکہ خادم ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہوگیا، اور سلوک و طریقت کے حلقہ میں شریعت سے استغناء بلکہ کہیں کہیں انحراف، اور ریاضت و مجاہدہ اور باطنی حواس اور طاقتوں پر کلّی اعتماد کا جو فتنہ شروع ہوگیا تھا، اور جس کا (جوگ اور سنیاس کا ایک اہم مرکز ہونے کی بنا پر) ہندوستان سب سے بڑا نشانہ تھا رک گیا، اور ان کے بعد پھر کسی کو کھل کر یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ "شریعت و طریقت کے کوچے الگ الگ ہیں، اور طریقت پر شریعت کے پہرے نہیں بٹھائے جاسکتے"۔

۳۔ تیسرا گروہ وہ ہے، جو ان کا اصل تجدیدی کارنامہ یہ سمجھتا ہے کہ انھوں نے "وحدۃ الوجود" کے عقیدہ و نظریہ پر وہ کاری ضرب لگائی جو اس سے پہلے کسی نے نہیں لگائی تھی، اور پھر اس کے بڑھتے ہوئے اس سیلاب کو روک دیا، بلکہ اس کا منہ پھیر دیا جس نے آخری صدیوں میں پوری علمی و روحانی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور جس کے خلاف کسی پڑھے لکھے آدمی کا لب کشائی کرنا بھی اپنی جہالت کا ثبوت دینا اور نصف النہار میں دن ہونے کا انکار کرنا تھا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنے معرکۃ الآراء مضمون "ہزارۂ دوم یا الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" میں صحیح لکھا ہے کہ:-

"وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی فنی نکتہ نوازیوں یا شریعت و طریقت کی مُلّایانہ و صوفیانہ معرکہ آرائیوں کے ہنگاموں میں حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعی اور حقیقی تجدیدی کارنامے کچھ اس طرح رل مل گئے ہیں کہ آج حضرت قدس سرہ العزیز کو

مجدد الف ثانی کہنا بجز ایک روایتی خوش اعتقادی کے بظاہر اور کسی امر مہم پر مبنی نہیں معلوم ہوتا۔[1]

نبوت محمدی اور اس کی ابدیت اور ضرورت پر اعتماد کی بحالی

لیکن حقیقت میں ان کا اصل کارنامہ جس کے جلو میں ان کے سارے تجدیدی کارنامے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، اور ان کی تجدید کا اصل سرچشمہ جس سے ان کی تمام انقلابی و اصلاحی کاموں کے چشمے پھوٹتے ہیں، اور دریا بن کر سارے عالم اسلام میں رواں دواں ہوجاتے ہیں، وہ نبوتِ محمدی اور اس کی ابدیت و ضرورت پر امت میں اعتقاد و اعتماد بحال کرنے اور مستحکم کرنے کا وہ تجدیدی و انقلابی کارنامہ ہے، جو ان سے پہلے اس تفصیل و وضاحت و قوت کے ساتھ ہمارے علم میں کسی مجدد نے انجام نہیں دیا، شاید یہ اس لئے بھی کہ اس کے زمانہ میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور اس کے خلاف کوئی منظم تحریک یا فلسفہ سامنے نہیں آیا تھا۔[2]

اس تجدیدی اقدام سے ان تمام فتنوں کا سدباب ہوتا ہے جو اس وقت عالم اسلام میں منہ پھیلائے ہوئے اسلام کے شجرۂ طیبہ اور اس کے پورے اعتقادی، فکری اور روحانی نظام کو نگل لینے کے لئے تیار تھے، ان میں ایران کی وہ نقطوی تحریک اور اس کے پیرو بھی شامل ہیں، جنھوں نے نبوتِ محمدی اور اس کے بقا و دوام کے خلاف کھلے طریقہ پر علم بغاوت بلند کیا تھا، اور اعلان کیا تھا کہ "نبوتِ محمدی کا ایک ہزار سالہ دور ختم ہوا، اور اب نئی رہنمائی

[1] "تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ" مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی ص ۲۷

[2] اس سلسلہ میں سب سے زیادہ وضاحت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے یہاں ملتی ہے، خاص طور پر ان کی جلیل القدر کتاب "النبوّات" اور "نقض المنطق" اور "الرد علی المنطقیین" ہیں، لیکن وہ چیز بھی اشارات و اجمال سے آگے نہیں بڑھ سکی کہ لکل مقام مقال۔

اور زندگی کی تشکیل جدید اور آئین سازی کا وہ دور شروع ہونے جا رہا ہے جس کی اساس عقلیت و فلسفہ پر ہوگی جس کی قیادت محمود بسیخوانی اور اس کی جماعت کے ہاتھ میں اور جس کا مرکز ایران و ہندوستان ہوگا۔[1] ان فتنوں میں اکبر کا "دین اکبری" اور "آئین جدید" بھی شامل ہے، جو ہندوستان میں نبوت و شریعت محمدی کی جگہ لینے اور اس کا بدل بننے کا مدعی تھا، دینی زندگی، اعمال و عبادات، اور معاشرہ و تمدن کی وہ دینی بدعات بھی داخل ہیں، جو ایک متوازی شریعت بنتی جا رہی تھیں، اور جن کی ایک مستقل "فقہ" مدون ہو رہی تھی، اور وہ بھی درحقیقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کے لئے ایک چیلنج اور منصب تشریع کی مدعی تھی۔

اس سلسلہ میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ بھی آتا ہے، جو اپنے داعیوں اور علمبرداروں کے بقول کشفی حقائق پر مبنی تھا، اور جس کے متعلق اس کے غالی معتقدین بھی اس بات کے مدعی نہیں ہیں کہ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالاعلان تبلیغ کی، اور آپ نے صحابۂ کرام کو اور صحابۂ کرام نے اپنے بعد کے لوگوں کو اس کی دعوت دی، یہ فلسفہ اور دعوت بھی نبوت کی پیش کی ہوئی دعوت، اس کی واضح تعلیمات اور اس کے مقاصد کا (دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر) حریف بنتی جا رہی تھی اور اس کو جس قدر کامیابی حاصل ہوتی تھی، اور اس کی جڑیں دل و دماغ اور اسلامی معاشرہ میں پیوست ہوتی جاتی تھیں، احکام شریعت پر عمل کرنے، اسلام کے واحد دینِ حق اور ذریعۂ نجات ہونے کے عقیدہ میں ضعف پیدا ہوتا اور الحاد و زندقہ، حریت و اباحیت تعطل و بے عملی کے لئے راہیں کھلتی تھیں، خواہ اس کے محتاط و متقی قائل صوفیہ و مشائخ خود شریعت کے کتنے ہی پابند اور اس کا کتنا ہی احترام

[1] ملاحظہ ہو کتاب کا باب اول. مضمون "دسویں صدی کا فتنۂ کبریٰ"۔

کرتے ہوں، اور اس طرز عمل کے کتنے ہی مخالف ہوں۔

اس ضمن میں فرقۂ امامیہ کا گروہ بھی آتا ہے جس کے اساسی عقائد میں امامت کا عقیدہ بھی ہے، اور جو امام کی ایسی تعریف کرتا ہے، اور اس کے ایسے صفات و خصوصیات بیان کرتا ہے، جو اس کو قریب قریب نبی کا ہمسر و مساوی بنا دیتی ہیں[1]، اسی طرح صحابۂ کرام کی ایک بڑی جماعت کے متعلق ایسی رائے رکھتا ہے، جس سے ذات نبوی کی تاثیر صحبت اس کی انقلاب انگیزی اور کیمیا اثری پر دھبہ آتا ہے، اور جو "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" کے منافی ہے[2]، اس فرقہ کے اثرات مختلف سیاسی و علمی وجوہ سے ہندوستان میں تیزی سے پھیل رہے تھے، اور مسلم معاشرہ (جس کی

[1] فرقۂ امامیہ کی معتبر کتابوں سے "امام" کے بارے میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "امام ظاہراً و باطناً معصوم عن الخطا و طاہر و مطہر ہوتا ہے، اس کی اطاعت فرض ہوتی ہے اس کے ہاتھوں معجزات کا ظہور ہوتا ہے اس کو متعلقات شریعت کا علم محیط (جس سے کوئی چیز خارج نہیں) علم لدنی کے طور پر حاصل ہوتا ہے اور وہ قیامت تک اللہ کی حجت کے طور پر ہر زمانہ میں ظاہر ہوگا۔ (مقتبس از کتاب الشافی للشریف المرتضیٰ، تلخیص الشافی للطوسی، و اصل الشیعۃ و اصولہا للعلامۃ الشیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء)۔

علامہ محمد ابو زہرہ اپنی فاضلانہ کتاب تاریخ المذاہب الاسلامیۃ (ج ۱) میں ان اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فرقۂ امامیہ کے تمام علماء اس پر متفق ہیں ان کے نزدیک "امام" کے مرتبہ کے نبی کے مرتبہ کے قریب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں انھوں نے اس کی صراحت کی ہے کہ "وصی" اور "نبی" میں صرف اتنا فرق ہے کہ "وصی" پر وحی نہیں آتی"۔ (ص ۵۹)

[2] سورۂ جمعہ آیت ۲ (ترجمہ) وہ پاک ذات جس نے ناخواندوں میں انھیں میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے (ان کے اخلاق و نفوس کو) سنوارتا اور بناتا ہے، اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اکثریت سنی العقیدہ تھی) اس کے عقائد، تصورات، افکار و خیالات اور رسوم و عادات سے
گہرے طریقہ پر متأثر ہو رہا تھا۔

اس طرح انھوں نے "نبوت محمدی پر ایمان و اعتماد کی تجدید" کی شاہ کلید سے وہ سارے
بھاری اور پیچیدہ قفل کھول دیئے جو یونانی و ایرانی فلسفہ اور مصری[1] و ہندوستانی اشراقیت نے ایجاد
کئے تھے، ایک تیر سے ان سب فتنوں کو شکار کیا، جن کا مسلمانوں کا ذہین طبقہ نشانہ بنا ہوا تھا۔

عقل و کشف کا غیبی اور مابعد الطبیعی حقائق کے ادراک میں عاجز و ناکام رہنا

مجدد صاحب کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عقل و کشف دونوں کو "غیبیات"
ماوراءِ عقل علوم، ذات و صفات الٰہی کی صحیح معرفت، لاریبی علم اور قطعی الثبوت حقائق کے
یقینی ادراک سے عاجز اور قاصر ثابت کیا، اور یہ کہ ان کے حاصل کئے ہوئے نتائج شک و
ریب اور خطاء، لغزش اور غلط فہمی سے مبرا نہیں، اللہ کی معرفتِ صحیح انبیاء ہی کے ذریعہ
حاصل ہوتی ہے، جس طرح "عقل" کا مرتبہ "حواس" سے ماوراء ہے اسی طرح "نبوت" کا
مرتبہ "عقل" سے ماوراء ہے، خدا کی تعظیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء کی
اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے، معرفت الٰہی میں عقلائے یونان نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں،
اور مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں، جس طرح عقل خالص اور عقل مجرد کا وجود نہیں، کشف خالص
اور کشف مجرد بھی (جو اندرونی خواہشات اور خارجی اثرات سے محفوظ ہو) نہایت دشوار
بلکہ عنقا صفت ہے اور اہل اشراق و صفائی نفس نے اسی طرح ٹھوکریں کھائی ہیں، اور
وہم و جہالت کا شکار ہوئے ہیں، جیسے مدعیان عقل و فلسفہ، عقل و اشراق دونوں حصول الیقین

[1] مصر افلاطونیت جدیدہ (NEO PLATIONISM) کا بڑا مرکز تھا، جس میں فلاطینس (POLOTINUS) پارفری (PARPHYRY) پراکلس (PROCLUS) وغیرہ پیدا ہوئے اور ایک نئے مذہب "افلاطونیت جدیدہ" کی بنیاد پڑی۔

اور وصول الی اللہ کے لئے ناکافی ہیں، بعثت ہی اللہ کی ذات و صفات اور احکام کی معرفت
کا واحد ذریعہ ہے۔

انھوں نے اعلان کیا کہ عقل کا خالص و بے آمیز ہونا ممکن نہیں، اور وہ بھی داخلی
عقائد و مُسلّمات اور خارجی عوامل و اثرات سے متأثر ہوتی ہے، اور اس کے بہت سے فیصلے
اور نتائج ان خارجی رنگوں سے رنگین و ممزوج ہو کر سامنے آتے ہیں، جو اس کے اندرون و
بیرون میں پائے جاتے ہیں، انھوں نے ثابت کیا کہ عقل حجت ہونے میں ناقص ہے،
حجت کامل انبیاء کی بعثت ہے، بعثت کے بغیر حقیقی تزکیہ ممکن ہی نہیں۔

انھوں نے صفائی نفس اور صفائی قلب میں حدّ فاصل قائم کی اور دونوں کا فرق
بتایا، انھوں نے ثابت کیا کہ انبیاء کی رسالت کا تصدیق کرنے والا اصحاب استدلال میں سے
ہے، انبیاء کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا نبوت کا انکار ہے، انھوں نے اس نکتہ
کی وضاحت کی کہ مخالف عقل ہونا اور چیز ہے، اور ماورائے عقل ہونا اور چیز۔

مجدد صاحب کی یہ تحقیقات جو عقل و کشف دونوں پر مبنی ہیں، اور جن میں تائید الٰہی
اور مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کیا ہوا نور شامل ہے، علمی و روحانی دنیا میں ہلچل ڈال دینے والے،
فکر و تعقل کا ایک نیا دروازہ کھولنے والے، عقلی و علمی دنیا کے بہت سے رائج الوقت سکوں
کو کھوٹا ثابت کرنے والے، نبوات و شرائع سماویہ کی صداقت و عظمت کا اعلان کرنے
والے، اور ان پر از سر نو اعتماد بحال کرنے والے علوم و معارف اور ایک ایسا تجدیدی و
انقلابی اور علمی و تحقیقی کارنامہ ہے، جو تنہا اس وقت کے نظام تعلیم، علمی ماحول اور دماغی
کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ ان میں وہ باتیں کہی گئی ہیں، جن میں سے بعض تک
فلسفہ اور فکر کی دنیا صدیوں کے بعد پہونچی ہے، اور جن کی صداقت پر بالآخر علم اور روحانی

تجربہ نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، یہ محض اس تائید الٰہی اور ہدایت ربانی کا کرشمہ تھا، جس نے ان کو ہزارۂ دوم کے آغاز پر تجدید دین اور نبوت و شریعت محمدی کے دفاع کے لئے انتخاب کیا، اور اس اخلاص، حمیّت دینی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کامل کا فیض جس پر وہ شروع سے گامزن تھے۔

اس اجمال کی تفصیل اور ان اشارات کی توضیح کے لئے اس پس منظر اور صورت حال کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس میں ان تحقیقات کی قدر و قیمت پورے طور پر واضح ہوگی۔

بنیادی سوالات اور ان کے جواب کی مختلف کوششیں اور ان کا جائزہ

دین و دنیا کے اہم ترین اور اولین سوالات جن کے صحیح جواب پر اس زندگی کی درستی اور صحیح انتظام اور آخرت کی نجات کا دارومدار ہے، یہ ہیں کہ دنیا کا بنانے والا کون ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کا ہم سے کیا تعلق ہے، اور ہمارا اس سے کیا اور کیسا تعلق ہونا چاہئے؟ اس کی پسندیدگی اور خوشی کی چیزیں کیا ہیں اور ناپسندیدگی اور ناراضگی کی کیا؟ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے، اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے، اور اس کے لئے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں؟

ان سوالات کے جواب کی تفصیل میں اللہ تعالٰی کی ذات و صفات و افعال، عالم کے حدوث و قدم، آخرت، جنت، دوزخ، وحی اور فرشتوں کے وجود کی بحث اور بعض وہ دوسرے مابعد الطبیعاتی مباحث پیش آجاتے ہیں، جو عقائد اور مذہب کے اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان سوالات کے جواب اور ان مسائل کے حل کے عموماً دنیا میں دو تجربے کئے گئے ہیں، ایک عقلی دوسرا اشراقی، پہلے کا نتیجہ فلسفہ ہے، اور دوسرے کا نتیجہ اشراقی تصوف۔

لیکن اصولی اور تنقیدی حیثیت سے یہ دونوں تجربے اور کوششیں بنیادی طور پر غلط اور چند ابتدائی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں، مکتوبات کے اقتباسات سے پہلے تمہید کے طور پر اس کی مختصر تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔

عقل محض اور کشف خالص کی تنقید کا انقلابی کارنامہ

عقل کے متعلق سب سے پہلے یہ حقیقت یاد رکھنی چاہئے کہ وہ اپنا طبعی فریضہ (اکتشاف و تحقیق اور استدلال) انجام دینے میں آزاد نہیں ہے، اس کو اپنے سے کمتر چیزوں کی احتیاج ہے، اس کا کام یہ ہے کہ محسوسات اور معلومات اور تجربات کے ذریعہ غیر محسوس اور غیر معلوم چیزوں کا علم حاصل کرے، اور اپنے ذخیرۂ معلومات اور مبادی و مقدمات کی مدد سے اور ان کو علمی طور پر مرتب کر کے وہ اس نتیجہ تک پہونچے جو اس کو ابھی تک حاصل نہیں تھا، اور محض حواس و تجربہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا، تمام معقولات کی تحلیل اور ان کا تجزیہ کرنے سے یہی حقیقت ظاہر ہوگی کہ عقل ان حقائق اور بلند معلومات تک انھیں حقیر محسوسات اور ابتدائی معلومات کی مدد سے پہونچی ہے، جو بلا کسی عقلی اور علمی ترتیب کے ان عظیم الشان نتائج تک نہیں پہونچا سکتے تھے۔

پس صاف ظاہر ہے کہ جہاں انسان کے حواس قطعاً کام نہ کر سکتے ہوں، جہاں اس کے پاس معلومات کا سرے سے کوئی ذخیرہ نہ ہو اور جس کے مبادی سے بھی وہ بالکل محروم ہو، جہاں کی حقیقت حال کا اس کو کوئی اندازہ و تجربہ نہ ہو اور جہاں قیاس کی بنیاد بھی موجود نہ ہو، وہاں اس کی عقل و ذہانت اور اس کا قیاس کیا کام کر سکتا ہے؟ وہاں اس کی عقل اسی طرح بے بس ہوتی ہے جس طرح انسان کشتی کے بغیر سمندر کو عبور نہیں کر سکتا، اور طیارہ کے بغیر پرواز سے عاجز ہے، ذہین آدمی اعداد سے واقفیت کے بغیر ریاضی کا کوئی سوال حل نہیں کر سکتا، جس شخص نے کسی زبان کا رسم الخط نہیں سیکھا اور وہ اس کے حروف تہجی

(ALPHABET) سے بھی نا آشنا ہے کتنا ہی ذہین اور جینیس (عبقری) ہو اور ہزار عقل وقیاس اور عرق ریزی سے کام لے اس زبان کی ایک سطر نہیں پڑھ سکتا، بعینہ اسی طرح مندرجہ بالا سوالات محض عقل سے حل نہیں کئے جا سکتے کیونکہ اس کے مبادی بھی انسان کو حاصل نہیں، نہ وہاں قیاس کی کوئی گنجائش ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ عقل کی قوت اور اس کا عمل محدود ہے، اس کا ایک دائرہ ہے، جس سے وہ باہر نہیں جا سکتی، جس طرح انسان کے حواس کے علاحدہ علاحدہ دائرے ہیں اور ان کا عمل ان کے اندر محدود ہے، حاسۂ بصارت سے ہزاروں مبصرات کا ادراک ہو سکتا ہے، لیکن ایک آواز بھی وہ اخذ نہیں کر سکتا، اسی طرح دوسرے حواس، پھر اپنے ان مخصوص محسوسات اور دائرہ عمل میں بھی ان حواس کی قوت اور ان کا عمل غیر محدود نہیں۔

اسی طرح عقل اگرچہ اس کا میدان ان حواس ظاہری سے زیادہ وسیع ہے لیکن بہر حال محدود ہے، ابن خلدون کے عالمانہ الفاظ میں:۔

"عقل ایک صحیح ترازو ہے اس کے فیصلے یقینی ہیں جن میں کوئی دروغ نہیں، لیکن تم اس ترازو میں امور توحید امور آخرت، حقیقت نبوت، حقائق صفات الٰہی، اور وہ تمام امور وحقائق جو ماوراء عقل ہیں تول نہیں سکتے، یہ لاحاصل کوشش ہوگی، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لئے ہے اس کو اس ترازو میں پہاڑوں کے تولنے کا شوق پیدا ہوا جو ناممکن ہے اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے اسی طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی وہ اللہ اور اس کے صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے[1]۔"

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۳

تیسری بات یہ ہے کہ عقل میں پوری بے آمیزی اور اس کے فیصلوں اور نتائج میں مکمل غیر جانبداری بہت مشکل ہے، اہل حقیقت جانتے ہیں کہ "عقل خالص" اور "عقل مجرد" سے زیادہ عنقا صفت چیز دنیا میں مشکل سے کوئی ہوگی، جذبات وخواہشات، ماحول، خاص تعلیم وتربیت مخصوص اعتقادات ونظریات، وہم وخیال، سہو ونسیان کے اثر سے وہ مشکل سے آزاد ہوتی ہے، اس لئے اس کے فیصلوں میں ہمیشہ صداقت اور اس کے نتائج میں قطعیت پیدا ہونا اتنا آسان اور عمومی نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔

لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ فلاسفہ نے ان تمام حقیقتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے موضوع کے تعین میں غلطی کی اور خدا کی ذات وصفات اور اس کے متعلقات پر بلا کسی سامان واسباب اور بلا کسی علم وروشنی کے ایسی تفصیل وتدقیق اور ایسے وثوق وعلم سے بحث کی جو ماہر کیمیا اپنے کیمیاوی تجربوں اور تحلیل وتجزیہ کے بعد کرتا ہے، ان کے یہ مباحث وتحقیقات تمام تر فرضیات تخمینات، اور خیالی طلسمات کا مجموعہ ہیں، اور محض قیاس بر قیاس پر مبنی ہیں، یہ "الٰہیات" کا ایک اچھا خاصا "طلسم ہوشربا" اور "فسانۂ عجائب[1]" ہے جس کا کچھ نمونہ آئندہ آئے گا۔

اس عقلیت وفلسفہ کے مقابلہ میں ایک دوسری کوشش ہے جس کا نام "اشراق" ہے، اس کا اصول یہ ہے کہ حق اور یقین کی دریافت کے لئے عقل، علم اور برہان واستدلال مفید نہیں، بلکہ مضر ہیں، صداقت وحقیقت کے یقینی حصول کے لئے مشاہدہ شرط ہے، اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن، صفائی نفس اور ایک اندرونی حاسہ کو بیدار کرنے سے ممکن ہے، جو روحانیات اور ماوراء طبیعات کا اسی طرح ادراک کرتا ہے، جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں، اور یہ حاسہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے، جب مادیت کو بالکل فنا اور حواس ظاہری کو مردہ کر دیا جائے، حقائق کی تحصیل اسی خالص وبے آمیز

[1] اردو کی دو مشہور افسانوی کتابیں جو انیسویں صدی عیسوی میں لکھی گئیں۔

عقل (حکمت اشراق) اور اسی اندرونی روشنی (نور باطن) سے ممکن ہے، جو ریاضتوں نفس کشی، مراقبہ اور تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ انسان میں یہ حاسۂ باطنی موجود ہے، ممکن ہے ایسے اور دوسرے حواس بھی ہوں لیکن بہر حال یہ ایک انسانی حاسہ ہی ہے اسی طرح کمزور اور محدود، خطا پذیر اور متأثر ہونے والا جس طرح انسان کی ساری طاقتیں اور انکشاف علم کے سارے ذرائع، اس کے محسوسات اور مشاہدات میں بھی غلطی اور خود فریبی ہوتی ہے، جیسے دوسرے حواس کے نتائج میں ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل اشراق و مشاہدہ کے مکاشفات و تحقیقات میں وہ عظیم الشان تعارض و تناقض اور بڑے بڑے اہم مسائل میں لغزش اور غلط روی ممکن نہ ہوتی، جو غیر مسلم اور مسلمان اشراقیوں کے یہاں ملتی ہے۔[1]

بہر حال عقل کی طرح اس "عقل خاص" کا خالص ہونا بھی بہت مشکل ہے اس پر بھی اسی طرح خارجی اثرات اور ظاہری اور باطنی چیزوں کا عکس اور پرتو پڑتا ہے، اور یہ آئینہ بھی حقیقت کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا، اشراقیوں کے ماحول، ان کے عقائد و مسلمات کا ان کے مشاہدات پر بھی اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے حکمائے اشراق کو اپنے کشف و مشاہدہ میں بہت سے ان یونانی اور مصری اوہام و خیالات کی تائید نظر آتی تھی جن کا کوئی سر پیر نہ تھا اور بہت سے ایسے مفروضات حقیقت بن کر نظر آتے تھے جن کا عالم خارجی میں کہیں وجود نہیں۔[2]

پھر جس طرح مندرجہ بالا سوالات فلسفہ کے موضوع و حدود سے خارج ہیں، اسی طرح

[1] تفصیل اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "مذہب و تمدن" باب اول عنوان "اشراقیت"۔

[2] ملاحظہ ہو "مذہب و تمدن"۔

اشراق کے حدود سے بھی، اس سے صرف عالم ارواح کے اسرار و عجائبات کی سیر ہوتی ہے، کچھ صورتیں نظر آتی ہیں، کچھ رنگ نظر آتے ہیں، کچھ آوازیں سننے میں آتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے منشا کا تفصیلی علم، اس کے قوانین شریعت، عالم آخرت کی منزلیں، اور اس کے احوال سے وہ اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح عام انسان۔

درحقیقت فلسفہ اور اشراق میں ایک ہی روح اور ایک ہی ذہنیت کام کرتی ہے، دونوں حقیقت کو اپنی کوشش سے پیغمبروں کے واسطہ کے بغیر معلوم کرنا چاہتے ہیں، منزل دونوں کی ایک ہے، طریقۂ سفر مختلف ہے ایک ہوا میں اڑ کر (خیالی پرواز سے) وہاں پہونچنا چاہتا ہے، اور ایک کسی مخفی زمین دوز راستہ سے (روحانی طریقہ سے)۔

لیکن حقیقت اور علم کا لبِّ لباب یہ ہے کہ یہ حقائق پیغمبروں کے واسطہ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے، جن کو اللہ منصب رسالت سے سرفراز فرماتا ہے، ان کو اپنی ذات و صفات اور "ملکوت السموٰت والارض" زمین و آسمان کی بادشاہی کا سب سے بڑا علم بخشتا ہے، اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی اور احکام کا براہ راست علم عطا کرتا ہے، اور ان کو اپنے اور انسانوں کے درمیانی واسطہ بناتا ہے، ان کی رسالت و نبوت دنیا کے لئے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے، ذات و صفات الٰہی کا جو عظیم الشان علم وہ بلا زحمت اور بلا قیمت عطا کرتے ہیں، اس کے ایک ذرہ کو بھی ہزاروں برس کی فلسفیانہ غور و فکر اور بحث و استدلال اور سالہا سال کے مجاہدہ و مراقبہ و تزکیۂ نفس سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ "ذالک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون"۔

یہ بالکل صحیح فرمایا کہ "ولکن اکثر الناس لا یشکرون" فلاسفہ اور حکمائے اشراق اس نعمت نبوت کی ناقدری و ناشکری کرتے ہیں، اور ان حقائق تک اپنی محنتوں سے پہونچنا

چاہتے ہیں، جن سے اللہ نے ان کو مستغنی کیا تھا، ہزاروں برس کی ان کاوشوں اور مجاہدوں کا
نتیجہ وہ متعارض و متناقض اور مضحکہ خیز اقوال و تحقیقات ہیں، جو "الٰہیات" کا سرمایہ ہیں، اور
جنھوں نے اپنے مشتغلین اور متبعین کو خدا سے بجائے قریب و متعلق کرنے کے خدا سے اور
زیادہ دور اور اس کی ذات و صفات سے ناآشنا اور اس سے بیگانہ اور مستغنی کیا......

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ و روحانیت دونوں کوچوں سے اچھی طرح واقف
ہیں، دوسری طرف علوم نبوت کے وارث اور وحی و رسالت کے مرتبہ شناس ہیں، آپ نے
حکماء اور اشراقیوں کے اس طرز عمل کی بڑی مبصرانہ تنقید کی ہے، جو آپ کی جامعیت
اور رسوخ فی العلم کی دلیل ہے، یہ مبحث آپ کی تجدید کا مرکزی و بنیادی شعبہ ہے، اس لئے
کہ پوری شریعت الٰہی اور پورے نظام دینی کی بنیاد اسی بحث کے فیصلہ پر ہے کہ علم قطعی اور
حصول یقین کا ذریعہ اور سرچشمہ اور انسان کے لئے اللہ تعالٰی کی ذات و صفات اپنے آغاز و
انجام اور اپنی فلاح و نجات کے ضروری علم کا صحیح مأخذ کیا ہے؟ آیا وہ غور و فکر اور عقلی
بحث و استدلال (جس کا نمائندہ فلسفہ ہے) یا اندرونی روشنی، نفس کشی... صفائی اور
مشاہدہ اور علم جو باطنی حواس اور روحانی طاقتوں سے حاصل ہوتا ہے جس کو "حکمت اشراق"
کہتے ہیں، یا ان دونوں کے برخلاف انبیاء علیہم السلام کی تقلید اور ان پر ایمان، یہی وہ نقطۂ آغاز
ہے، جہاں سے راستے ایک دوسرے سے کٹ کر تین مختلف سمتوں کی طرف جاتے ہیں، اور
جو آگے جاکر پھر کہیں نہیں ملتے "وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ
فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝"

اس سلسلہ میں مجدد صاحب کے قلم سے جو نادر تحقیقات اور اعلیٰ علوم و معارف نکلے ہیں،

اور ان کے مکتوبات کے ضخیم دفتر میں منتشر ہیں، ان کا ترجمہ مختلف عنوانوں کے ماتحت پیش
کیا جاتا ہے۔

عقل کا عجز صانع عالم کے اثبات اور اس کے کمالات کی معرفت میں

"اس اللہ کا شکر ہے، جس نے ہم پر انعام کیا اور ہمیں اسلام کی طرف رہنمائی کی، اور محمد
علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت میں بنایا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات دنیا والوں کے لئے
رحمت ہیں، کیونکہ حضرت حق سبحانہ و تعالٰی نے ان حضرات کی بعثت کے ذریعہ ہم ناقص عقل
والوں اور عاجز فہم رکھنے والوں کو اپنی ذات و صفات کی خبر دی ہے، اور ہماری کوتاہ فہم
کے اندازہ سے اپنے ذاتی و صفاتی کمالات کی اطلاع بخشی ہے، اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی
کی چیزوں کو علیحدہ علیحدہ اور ہمارے دنیوی اور اخروی منافع اور مضرات کو ممتاز فرما دیا ہے،
اگر ان حضرات کے وجود گرامی کا واسطہ درمیان میں نہ ہوتا تو انسانی عقلیں کارخانۂ عالم کے
بنانے والے کے ثابت کرنے میں درماندہ ہوتیں، اور اس ذات اقدس کے کمالات کے پہچاننے
میں عاجز و ناکام ثابت ہوتیں، قدیم فلاسفہ جو اپنے کو سب سے بڑا عقلمند اور حکیم سمجھتے تھے، عالم
کے بنانے والے کے منکر تھے، اور اپنی عقل کی کوتاہی سے اشیاء کو زمانہ کی طرف منسوب کرتے
تھے، زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کے بارے میں نمرود کا مباحثہ حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا
و علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے مشہور ہے، اور قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، فرعون بدبخت کہتا تھا،
"مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي" (اے اہل مصر مجھے اپنے سوا تمہارے کسی حاکم و معبود کا علم نہیں)
نیز اس نے حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے خطاب کر کے کہا "لَئِنِ اتَّخَذْتَ
إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ" (اے موسیٰ اگر تم نے میرے سوا کوئی اپنا معبود و حاکم

ٹھہرایا تو میں تم کو بھی قیدی بنادوں گا) ہامان سے اسی بدبخت نے کہا "یٰھَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا"[1] (اے ہامان میرے لئے ایک اونچا محل تیار کرتا کہ میں پہونچوں رستوں میں آسمانوں کے پھر جھانک دیکھوں موسیٰ کے معبود کو اور میں تو اس کو خیال کرتا ہوں جھوٹا) خلاصہ یہ ہے کہ عقل اس دولت عظمیٰ کے ثابت کرنے سے قاصر اور ان حضرات انبیاء کی ہدایت کے بغیر اس دولت سرا کا راستہ پانے سے عاجز ہے"[2]

معرفت الٰہی میں عقلائے یونان کی بے عقلیاں

خالق و مدبر کائنات کے وجود جس کو فلاسفۂ یونان مبدأ اول کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور اس کے عمل خلق اور کائنات کے وجود میں آنے کے متعلق ان فلاسفہ نے جو عقلی موشگافیاں کی ہیں، اور تخیلات و مفروضات کا جو نقشہ تیار کیا ہے، اور پھر اس ہوائی بنیاد پر جو فلک بوس عمارتیں تعمیر کی ہیں، ان کی تشریح و تفصیل تو فلسفہ کی کتابوں میں اور ان پر تبصرہ و تنقید عقائد و علم کلام کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے، یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

لیکن حضرت مجدد کے افکار و علوم عالیہ کے سمجھنے کے لئے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ان تخیلات و مفروضات کی تردید میں جو محض یونانی ذہن کی تخلیق اور قوت متخیلہ کی ایجاد ہے، ان کے قلم میں اتنا زور اور ان کے بیان میں اتنا جوش کیوں پیدا ہو جاتا ہے، عقل فعال کا جو فلاسفۂ یونان کے نزدیک درحقیقت عالم کی مدبر اور کائنات کے اندر موثر ہے "نسب نامہ" پیش کر دیا جاتا ہے، جو ان حکماء نے تجویز کیا ہے اور جس پر انھوں نے سارے خلق و امر کی

---

[1] سورۂ مومن۔ ۳۶۔ ۳۷

[2] مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

بنیاد رکھی ہے، اس کے ایک ایک نقطہ پر موافق اور مخالف دلائل کا انبار ہے، لیکن یہاں صرف فہرست شجرہ پر اکتفا کی جاتی ہے:۔

"مبدأ اول (واجب الوجود) چونکہ تمام وجوہ سے واحد ہے اور یہ مسلّم ہے کہ واحد سے صرف واحد کا صدور ہو سکتا ہے، اور عالم مختلف چیزوں سے مرکب ہے اس لئے اس کا صدور اس سے نہیں ہو سکتا، اس کے وجود سے اس کے بلا ارادہ و اختیار اور علم، عقل اول کا اس طرح فیضان ہوا جس طرح چراغ سے روشنی کا فیضان ہوتا ہے اور انسان کے ساتھ سایہ ہوتا ہے، عقل اول ایک ایسا موجود ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے، نہ تو وہ جسم ہے اور نہ کوئی جسم اس کا محل ہے، اس کو اپنے نفس کی معرفت ہے اور اپنے مبدأ کی بھی، اس کا نام خواہ فرشتہ رکھا جائے خواہ عقل اول، خواہ کچھ اور اس کے وجود سے تین چیزیں لازم آتی ہیں، عقل ثانی اور فلک علی (یا فلک الافلاک) (جو نواں آسمان ہے) کا نفس اور اس فلک کا جرم، پھر عقل ثانی سے عقل ثالث اور فلک کواکب کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر اس عقل ثالث سے عقل رابع اور فلک زحل کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل رابع سے عقل خامس اور فلک مشتری کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل خامس سے عقل سادس اور فلک مریخ کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل سادس سے عقل سابع اور فلک شمس کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل سابع سے عقل ثامن اور فلک زہرہ کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل ثامن سے عقل تاسع اور فلک عطارد کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، پھر عقل تاسع سے عقل عاشر اور فلک قمر کا نفس اور اس کا جرم وجود میں آیا، یہی عقل اخیر ہے جس کا نام عقل فعال ہے، اس سے فلک قمر کا حشو لازم آیا جو ایک مادہ ہے، جو عقل فعال اور طبائع افلاک کے اثر سے کون و فساد کو قبول کرتا ہے، پھر ان مواد میں کواکب کی حرکات کے سبب مختلف طرح کے امتزاج ہوتے ہیں، جن سے معادن، نباتات اور حیوانات پیدا ہوتے ہیں، یہ عقول عشرہ

اور افلاک تسعہ ہیں"۔

یہ دراصل یونانیوں کا وہ علم الاصنام ہے جس کا نام انھوں نے فلسفہ اور الٰہیات رکھ دیا' اور لوگوں نے اس پر سنجیدگی سے غور و فکر اور مباحثہ شروع کر دیا یا محض فرضی داستان گوئی اور افسانہ آرائی ہے جس پر بے اختیار قرآن کی یہ آیت یاد آتی ہے:۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	میں نے ان کو آسمان و زمین کی پیدائش پر اور
وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ	خود ان کی پیدائش پر گواہ نہیں بنایا اور میں
الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ٥	گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بنانے
(الکہف ۵۱)	والا نہیں ہوں۔

امام غزالیؒ نے (اس نقشہ کو نقل کرنے کے بعد) سچ لکھا ہے کہ "یہ محض دعاوی و تحکمات ہیں، بلکہ درحقیقت "ظلمات فوق ظلمات" تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں، اگر کوئی شخص اپنا ایسا خواب ہی دیکھنا بیان کرے تو اس کے سوء مزاج کی دلیل ہوگی"[1]۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں" مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے چہ جائیکہ وہ عقلاء جو اپنے خیال میں معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہوں"[2]۔

ان فلاسفہ نے اللہ سے تمام صفات کمال اور تمام مخلوقات کی خلق و صنعت کی نفی کی اور اس کو بالکل معطل و غیر مختار ثابت کیا اور یہ سب اپنے نزدیک ذات واجب الوجود کی تعظیم و تنزیہ کے لئے کیا، امام غزالیؒ اس موقع پر بے اختیار ہو کر لکھتے ہیں:۔

"جو اس پر قانع ہو کہ اللہ کے بارے میں اس کے قول کا حاصل یہ مرتبہ ہو تو اس نے اس کو ہر اس موجود سے بھی زیادہ حقیر قرار دیا جس کو اپنے نفس کا بھی شعور ہے اس لئے کہ جس کو دوسرے کا

---

[1] تہافت الفلاسفہ ص ۳۰   [2] ایضاً ص ۳۳

اور اپنا شعور ہوگا وہ اس مرتبہ میں بلند ہوگا جس کو اپنے سوا کسی چیز کا شعور نہ ہو، تعظیم میں یہ موشگافی ان کو یہاں تک لے گئی کہ انھوں نے عظمت کے تمام معانی اور مفہومات کو باطل کر دیا اور اس کو ایسے مردہ کے درجہ کو پہونچا دیا جس کو کچھ خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، بس صرف اتنا فرق ہے کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو یہ بھی نہیں ہوتا) اللہ اس طرح لوگوں کو سزا دیتا ہے، جو اس کے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں، اور ہدایت کے راستہ سے کترا کر چلتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول "مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (میں نے ان کو آسمان و زمین کی پیدائش پر گواہ نہیں کیا) کے منکر ہیں، جو اللہ کے ساتھ برا گمان رکھتے ہیں، جن کا اعتقاد ہے کہ امور ربوبیت کی حقیقت و گہرائی کو انسانی طاقتیں پورے طور پر پا سکتی ہیں، جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں جن کا خیال ہے کہ عقل کے ہوتے ہوئے انبیاء اور ان کے متبعین کی تقلید کی ضرورت نہیں، اس کا لامحالہ نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ان کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے "معقولات" کا لب لباب وہ نکلا کہ اگر خواب کے طور پر بھی بیان کیا جائے تو تعجب ہو"[1]۔

ان سب چیزوں کو دیکھ کر نعمت رسالت کی قدر آتی ہے کہ "مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ" یہ عقل کی بے بسی اور عقلاء و حکماء (جن کی حکمت و عقل علوم ریاضیہ اور علوم عملیہ میں کامیاب ہوئی) کی ان مسائل الٰہیہ میں ناکامی کا پُر عبرت نمونہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی طرف کس طرح ان چیزوں کی نسبت کی جن کی نسبت وہ اپنی طرف اور حقیر ترین مخلوقات کی طرف پسند نہیں کرتے اور اس کو کس طرح معطل، بے اختیار اور لا علم قرار دیا، اور اس کو اس کی تعظیم کا عین تقاضا سمجھا "سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"۔

---

[1] تہافت الفلاسفہ ص ۳۱

اب حضرت مجدد کے مندرجہ ذیل ارشادات پر نظر ڈالئے جو ان کے مختلف مکاتیب سے اقتباس کئے گئے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"عقل اگر معرفت الٰہی کے مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدی بنایا ہے گمراہی کے بیابان میں نہ بھٹکتے، اور حق تعالیٰ کو اور دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پہچانتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے معاملہ میں جاہل ترین شخص یہی لوگ ہیں کہ انھوں نے حق سبحانہ کو بیکار ومعطل سمجھ لیا اور سوائے ایک چیز (عقل فعال) کے اس کو کسی چیز کا فاعل اور خالق نہیں مانتے اور وہ بھی (ان کے خیال کے مطابق) اس سے اضطراراً نہ کہ اختیاراً وجود میں آئی ہے انھوں نے اپنی طرف سے عقل فعال تراشی ہے، حوادث کو زمین وآسمان کے خالق سے ہٹا کر اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اثر کو مؤثر حقیقی سے روک کر اپنی تراشیدہ چیز (عقل فعال) کا اثر مانتے ہیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک معلول علت قریبہ کا نتیجہ ہوتا ہے، علت بعیدہ کے لئے معلول کے حصول میں وہ کوئی دخل واثر نہیں مانتے، اور اپنی نادانی سے ان اشیاء کی اللہ کی طرف نسبت نہ ہونے کو اللہ کی صفت کمال جانتے ہیں، اور اس کو بیکار و معطل ماننے کو اس کی تعظیم سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے کو خود زمین وآسمان کا خالق کہتا ہے، اور "رَبُّ الْمَشْرِقِ وَرَبُّ الْمَغْرِبِ" کے ساتھ اپنی تعریف بیان کرتا ہے۔

ان بے عقلوں کو اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی کچھ احتیاج نہیں، اور نہ اس کے سامنے کچھ عجز ونیاز ہے، مجبوری اور ضرورت کے وقت چاہئے کہ یہ اپنی "عقل فعال" کی طرف رجوع کریں، اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل اسی سے چاہیں، اس لئے کہ اصل قدرت اور اصل اختیار ان کے نزدیک اسی کا ہے، بلکہ "عقل فعال" بھی ان کے خیال کے مطابق اپنا عمل کرنے میں مجبور اور غیر مختار ہے، اس لئے اس سے بھی اپنی ضرورت کی تکمیل چاہنا غیر معقول بات ہے،

اصل یہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "اَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَهُمْ" (ان کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں) ان کا بھی کوئی حامی وناصر نہیں، خدا بھی نہیں اور عقل فعال بھی نہیں، عقل آخر کیا چیز ہے، جو چیزوں کا انتظام کرتی ہے اور حوادث کے ظہور وخلق کی اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے محض اس کے ثابت ہونے اور اس کی ہستی میں ہزاروں اعتراض وکلام ہیں، کیونکہ اس کا ثبوت ووجود محض فلسفہ کے گڑھے ہوئے مقدمات پر مبنی ہے، جو اسلام کے قواعد صحیحہ کی رُو سے نامکمل اور ناقص ہیں، کوئی احمق ہی ہوگا جو اشیاء کو قادر ومختار جل شانہ، سے ہٹا کر اسے محض ایک فرضی اور موہوم چیز کی طرف منسوب کرے گا، بلکہ خود ان چیزوں کو اس بات سے ہزار ہزار ننگ وعار ہے کہ وہ اپنے خلق میں فلسفہ کی ایک تراشی ہوئی بے حقیقت چیز کی طرف منسوب ہوں، بلکہ یہ چیزیں اپنے نابود ہونے پر راضی ومسرور ہوں گی، اور ان کو موجود ہونے کی کوئی خواہش نہ ہوگی، اس بات کے مقابلہ میں کہ ان کے وجود کی نسبت ایک بے حقیقت فرضی شیئ کی طرف ہو اور وہ قادر ومختار کی قدرت کی طرف منسوب ہونے کی سعادت سے محروم ہو جائیں (قرآن مجید میں ہے) "کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا" (بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے، یہ محض جھوٹ کہتے ہیں) دار الحرب کے کافر اپنی بت پرستیوں کے باوجود اس جماعت (فلاسفہ) سے بہتر ہیں کہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے مشکل کے وقت التجا کرتے ہیں، اور بتوں کو اس کے حضور میں شفاعت کے لئے وسیلہ بناتے ہیں۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک گروہ ان احمقوں (حکمائے یونان) کو حکماء کے لقب سے یاد کرتا ہے، اور حکمت کی طرف ان کو منسوب کرتا ہے، ان (فلاسفہ) کے اکثر مسائل خصوصاً الٰہیات میں (جو مقصد اعلیٰ ہے) غلط ہیں، اور کتاب وسنت کے مخالف،

حکماء کا ان کو لقب دینا جن کا سرمایہ جہل مرکب ہے، آخر کس لحاظ سے ہے؟ ہاں البتہ طنز و مذاق کے طور پر ہو سکتا ہے یا اس طرح جس طرح نابینا کو بینا کہا جائے[1]؟

عقل حقائق دینی کے ادراک میں ناکافی ہے

"اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو اس کی طرف ہدایت کی اور ہم کو ہدایت نہیں ہو سکتی تھی اگر اللہ خود ہماری ہدایت نہ کرتا، بیشک ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق کے ساتھ آئے، انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے بھیجنے کے احسان کا شکر کس زبان سے بجا لایا جائے، اور کس دل سے اس... محسن کا اعتقاد کیا جائے اور وہ اعضاء و جوارح کہاں ہیں کہ اعمال حسنہ کے ذریعہ اس نعمت عظمیٰ کی مکافات کی جائے اگر ان حضرات کا وجود مبارک نہ ہوتا تو ہم کوتاہ فہم انسانوں کو زمین و آسمان بنانے والے کے وجود اور اس کی یکتائی کی طرف کون رہنمائی کرتا، متقدمین فلاسفۂ یونان باوجود اپنی ذہانتوں کے زمین و آسمان کے بنانے والے (جل شانہ) کے وجود کی طرف راستہ نہ پا سکے، اور کائنات کے وجود کو انھوں نے "دہر" (زمانہ) سے منسوب کیا اور جب روز بروز انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی دعوت روشن ہوتی چلی گئی، متاخرین فلاسفہ نے ان انوار کی برکت سے قدماء کے مذہب کی تردید کی اور صانع جل شانہ کے وجود کے قائل ہو گئے اور اس کی توحید کا بھی اقرار کیا، پس ہماری عقلیں انوار نبوت کی امداد کے بغیر اس کام سے بے بس اور ہمارا فہم انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے وجود کے توسط کے بغیر اس معاملہ سے دور ہے[2]"۔

---

[1] مکتوب ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

[2] مکتوب ۲۵۹/۱ بنام مخدوم زادہ خواجہ محمد سعیدؒ۔

نبوت کا طور عقل و فکر کے طور سے ماوراء ہے

"نبوت کا طریق عقل و فکر کے طور سے ماوراء ہے جن امور کے ادراک میں عقل قاصر ہے ان کا ثبوت نبوت کے طریق سے ہوتا ہے، اگر عقل کافی ہوتی تو انبیاء کس لئے مبعوث ہوتے "صلوات اللہ تعالیٰ وتسلیماتہ علیہم اجمعین" اور آخرت کے عذاب کو کیوں ان کی بعثت کے ساتھ وابستہ کیا جاتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولًا"[1] (ہم اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کسی پیغمبر کو نہ بھیجیں) عقل اگرچہ حجت ہے لیکن حجت بالغہ نہیں ہے اور اپنے حجت ہونے میں کامل نہیں ہے، حجت بالغہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت سے ثابت ہوئی ہے اور اس نے مکلفین کی زبان عذر بند کر دی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا"[2] (پیغمبر جو بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں، تاکہ لوگوں کے لئے اللہ کے اوپر کوئی حجت باقی نہ رہے، انبیاء کی بعثت کے بعد اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے) جب بعض مسائل میں عقل کے ادراک کا عجز اور کوتاہی ثابت ہو گئی پس تمام احکام شرعیہ کو عقل کی ترازو میں تولنا مستحسن نہیں، ہمیشہ ان مسائل و احکام کو عقل سے مطابق کرنے کی کوشش اور اس کی پابندی عقل کے کافی ہونے کا فیصلہ کرنا ہے اور نبوت کے طریق کا انکار، اللہ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے[3]"۔

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل - ۱۵ [2] سورۂ النساء - ۱۶۵ [3] مکتوب ۳۶/۳ بنام میر محمد نعمان۔

عقل کا خالص و بے آمیز ہونا ممکن نہیں اور وہ حقائق الٰہیہ کی دریافت کے لئے (خواہ اس کو اشراق اور صفائی نفس کی مدد حاصل ہو) مفید نہیں

حیرت انگیز بات یہ ہے (جس کی تائید الٰہی اور اعلیٰ درجہ کی سلامت فکر کے سوا کوئی توجیہ ممکن نہیں) کہ اس دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں جب ساری دنیا پر اور خاص طور پر ایران اور ہندوستان پر فلسفہ و حکمت کی اس تعلیم کے اثر سے جس کا انحصار فلسفۂ یونانی پر تھا اور جس نے افلاطون وارسطو کو مقام تقدس اور درجۂ عصمت تک پہونچا دیا تھا، دماغوں پر عقلیت کا ایسا سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ مقدمات عقلیہ سے منطقی طریقہ پر کسی نتیجہ کو ثابت کر دینے پر اور فلاسفۂ یونان نے جن چیزوں کو بدیہی اور قطعی بنایا ہے، ان کا نام لے لینے کے بعد زبانیں گنگ اور نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں، بلکہ پرستاران حکمت و عقلیت ان مزعومہ "حقائق" کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔

مجدد صاحب نے (ہمارے علم میں کم سے کم علماء اسلام میں) پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی کہ عقل کا خالص و بے آمیز ہونا جسم عنصری کے تعلق اور ماحول میں پھیلے ہوئے اوہام و تخیلات، عقائد و مسلمات نیز باطنی رجحانات اور راسخ اخلاق اور خواہشات سے آزاد ہونا تقریباً محال ہے، یہاں تک کہ اگر اس کو اشراق و صفائی نفس کی رفاقت و مدد بھی حاصل ہو تب بھی اس کا باطنی و خارجی اثرات تعلیم و تربیت اور معاشرہ یا ماحول میں جن چیزوں نے مسلمات کا درجہ حاصل کر لیا ہے، ان کے اثر سے آزاد ہو کر حقیقت نفس الامری تک پہونچنا اور بے لاگ فیصلہ صادر کرنا "الشاذ کالمعدوم" کا حکم رکھتا ہے اور جس کا کچھ اعتبار نہیں، مجدد صاحب کی یہ تحقیق اور اپنے مکتوبات میں بار بار اس پر

زور دینا یہ اس عہد اور ان کے ماحول کے لحاظ ہی سے نہیں، بلکہ علمی و فکری دنیا میں ایک دریافت اور ایک ایسا انقلابی اور جرأت مندانہ اعلان ہے، جس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ صحیح طور پر ابھی تک نہیں کیا گیا، حالانکہ وہ اس کا مستحق تھا کہ اس کو بحث و تحقیق اور شرح و تفصیل کا موضوع بنایا جاتا۔

عجیب توارد اور حیرت انگیز بات ہے کہ مجدد صاحب سے تقریباً دو سو سال بعد جرمنی کے مشہور فلسفی ایمنول کانٹ (IMMANUEL KANT. 1724–1804) نے عقل کے خالص اور مجرد ہونے اور اس کے ماحول، ورثہ اور عادات و معتقدات سے آزاد ہو کر بے لاگ فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر علمی اور تحقیقی بحث کا آغاز کیا، اس نے عقل کے حدود کی جرأت و وضاحت کے ساتھ تعیین کی اور ۱۷۸۱ء میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب "تنقید عقل محض" (CRITIQUE OF PURE REASON) شائع کی[۱] جس نے دنیائے فکر و فلسفہ میں ہلچل ڈال دی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے الفاظ میں "روشن خیالوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر کر دیا"[۲] مغرب میں اس کے اس کارنامہ کی عظمت کا شاندار طریقہ پر اعتراف کیا گیا، اور کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ وہ جرمن قوم کے لئے خدا کا سب سے بڑا عطیہ تھا، تاریخ فلسفہ جدید کا مصنف ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفڈنگ اس کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "یہ کتاب فلسفہ کا ایک غیر فانی کمال پارہ ہے جس نے فکر انسانی کی ہرزہ گردیوں میں انگشت رہنما کا کام کیا"[۳]

---

[۱] اس کتاب کا ترجمہ جو اصلاً جرمن زبان میں تھی، "تنقید عقل محض" کے نام سے ہندوستان کے مشہور اہل قلم اور کامیاب مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا، اور "انجمن ترقی اردو ہند" دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔

[۲] THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM. P.5

[۳] تاریخ فلسفۂ جدید ترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم جلد دوم ص ۳۸

کانٹ کے نزدیک فکر اپنا عمل ادعائی طور پر شروع کرتا ہے اسے غیر ارادی طور پر اور اکثر سادہ لوحی سے اپنے قوٰی اور اپنے مفروضات و مقدمات کی صحت پر اعتماد ہوتا ہے اسے یقین ہوتا ہے کہ میں تمام مسائل کو حل کر سکتا ہوں اور کائنات کی کنہ تک میری رسائی ہو سکتی ہے...... اس کے بعد ایک زمانہ آتا ہے جس میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تعمیرات فکر افلاک تک نہیں پہونچ سکتیں اور ہندسوں میں ان کے نقشوں کے متعلق اتفاق رائے نہیں ہو سکتا یہ تشکیک کا زمانہ ہے، اس نے دیکھا کہ ابھی ایک ایسا کام باقی ہے، جسے ادعائیین اور تشکیکین دونوں نے نظر انداز کر دیا تھا، وہ یہ کہ ہم اپنی عقل اور اپنے علم کی ماہیت کے متعلق تحقیق کریں اور دریافت کریں کہ ہمارے اندر فہم اشیاء کے لئے کس قسم کے صور و قوی پائے جاتے ہیں، اور ان کی مدد سے ہم کہاں تک جا سکتے ہیں[1]۔

اب اس کے بعد ایک مسلمان عالم و مفکر کا (جو ہندوستان کے محدود علمی و مدرسی ماحول میں رہا اور جس نے حکمت و فلسفہ کے بجائے علوم نبوت اور معرفت و رضائے الٰہی کے حصول کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا) عقل خالص کی تنقید میں فلسفہ کے پیچ و خم سے دور رہتے ہوئے عام فہم و دل نشین بیان پڑھئے۔ مجدد صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ "عقل اپنی ذات سے اگرچہ احکام الٰہی میں ناقص و ناتمام ہے مگر یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ صفائی نفس اور تزکیہ کے بعد عقل کو ایک مناسبت اور ذات الٰہی سے ایک بے کیف اتصال پیدا ہو جائے جس کے ذریعہ سے وہ وہاں سے احکام اخذ کرے اور بعثت کی ضرورت جو فرشتہ کے واسطہ سے ہوتی ہے نہ پڑے"

[1] ایضاً صفحہ ۳۰-۳۱

تحریر فرماتے ہیں:-

"(جواب) عقل خواہ وہ مناسبت و اتصال پیدا کرے مگر جو تعلق وہ جسم عنصری سے رکھتی ہے وہ کلیتہً زائل نہیں ہوتا، اور کمل آزادی و بے آمیزی وہ نہیں پیدا کر سکتی واہمہ ہمیشہ اس کا دامنگیر رہتا ہے، اور متخیلہ اس کے خیال کو کبھی نہیں چھوڑتا غصہ اور خواہش کی قوتیں سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہیں اور حرص و ہوس کی صفات مذموم کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بھول چوک جو انسان کے لوازم میں سے ہے اس سے علیحدہ نہیں ہوتے، خطا اور غلطی جو اس زندگی کے خواص میں سے ہیں، اس سے جدا نہیں ہوتے، پس عقل اعتماد کے لائق نہیں اور اسی کے اخذ کئے ہوئے احکام وہم و تصرف اور خیال کے اثر و اقتدار سے آزاد نہیں، اور بھول چوک کی آمیزش اور غلطی کے شبہ سے محفوظ نہیں، بخلاف فرشتہ کے جو ان صفات سے پاک ہے اور ان نقائص سے بری، پس لامحالہ وہ اعتبار کے لائق ہے، اور اس کے اخذ کئے ہوئے احکام وہم و خیال کی آمیزش اور نسیان و غلطی کے شبہ سے محفوظ ہیں بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ وہ علوم جن کو اس نے روحانی اخذ و تحصیل کے ذریعہ حاصل کیا ہے، قوی اور حواس تک ان کو پہونچانے میں بعض ایسے مقدمات جو اس کے نزدیک مسلّم ہیں (لیکن غیر واقعی ہیں، اور وہم و خیال یا کسی اور طریقہ سے حاصل ہوئے ہیں) بے اختیار ان علوم کے ساتھ اس طرح شامل ہو جاتے ہیں کہ اس وقت بالکل اس کی تمیز نہیں ہونے پاتی، دوسرے وقت کبھی اس کا امتیاز عطا ہوتا ہے، اور کبھی نہیں ہوتا، پس لامحالہ ان علوم میں ان مقدمات کی شمولیت کی وجہ سے غیر واقعیت اور عدم صداقت کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ اعتبار کے لائق نہیں رہتے"[1]

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔

اہل اشراق وصفائی نفس

حصول یقین، علم صحیح، تہذیب اخلاق وتزکیۂ نفس اور اس کے ذریعہ انسانی معاشرہ کی تنظیم اور صالح تمدن کی تعمیر کا ایک بے خطا اور معصوم ذریعہ قدیم زمانہ سے اشراقیت وروحانیت کو سمجھا گیا، زمانۂ قدیم میں مصر وہندوستان اس کا بہت بڑا مرکز تھے، اس تحریک کے فروغ اور اس کی ہردلعزیزی میں وہ ردّعمل بھی کام کر رہا تھا، جو ایک طرف غالیانہ عقل پرستی دوسری طرف مجنونانہ حواس پرستی کے خلاف یونان وروم میں پیدا ہو گیا تھا، اور بالآخر اس نے اسکندریہ (مصر) کو جو مشرقی ومغربی عقلیت ومذاہب کا سنگم تھا اپنا مرکز بنایا۔

اس فلسفہ اور تحریک کے داعیوں اور پیروؤں کا کہنا یہ ہے کہ حصول یقین وعلم صحیح کا سب سے بڑا ذریعہ مشاہدہ ہے، اور وہ نور باطن صفائی نفس اور باطنی حاسہ کو بیدار کرنے سے حاصل ہوتا ہے، حقائق کا حصول اسی خالص وبے آمیز عقل (حکمت اشراق) اور اسی اندرونی روشنی (نور باطن) سے ممکن ہے، جو ریاضت، مخالفتِ نفس اور مراقبہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اگر یہ قول تسلیم کر لیا جائے تو اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کے اندر حواس خمسہ کے علاوہ ایک چھٹا حاسہ (باطنی) عمل کرنے لگتا ہے اور اس کے عمل کے نتائج (مشاہدات) غیر مرئی انوار غیر مسموع اصوات اور پہلے سے غیر معلوم حقائق ظاہر ہونے لگتے ہیں، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ حاسہ انسان کے دوسرے حواس کی طرح محدود اور غلطی وغلط فہمی میں مبتلا ہونے والا نہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو اس کے نتائج میں تعارض وتضاد کا وجود اور شک واحتمال نہ پایا جاتا، لیکن اشراقیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس حاسۂ باطنی کے محسوسات اور وہ جن نتائج وعقائد

تک پہونچتا ہے، ان میں اسی طرح سے تعارض واختلاف پایا جاتا ہے، جیسا کہ فلاسفۂ یونان اور مشرق کے حکماء وعقلیین میں پایا جاتا ہے، اشراقیت قدیم کو چھوڑ کر (جس کی تاریخ محفوظ نہیں) اشراقیت جدیدہ (NEO - PLATONISM) کو لے لیجئے اس کے پیشواؤں کے مذہبی عقائد پر مرتب ہونے والے اعمال میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے، پلاٹینس (PLOTINUS) اپنے زمانہ کے مذہبی نظام اور مروجہ عبادات کا قائل نہیں، اور آزاد مشرب فلسفی ہے، جو عمل کے بجائے تفکر اور مراقبہ پر زور دیتا ہے، لیکن اس کا شاگرد رشید پارفری (PORPHYRY) ایک زاہد خشک صوفی ہے، PLOTINUS انسانی روح کے جانوروں کے جیون میں ظاہر ہونے کا قائل ہے، لیکن PORPHYRY اس کا منکر ہے، اس مسلک کا تیسرا نامور پیشوا پراکلس (PROCLUS) پورے مصری رسوم، دینی ومذہبی تقریبات کا پابند تھا، اور دن میں تین دفعہ سورج کی پرستش کرتا تھا، اس کا مذہب مختلف مذاہب واعتقادات کا معجون مرکب تھا، اور یہ سب اہل مشاہدہ اور یقین تھے۔[1] PORPHYRY نے مسیحیت کی مخالفت کی اور رومی بت پرستی اور جاہلیت (PAGANISM) کے احیاء کی تحریک میں شہنشاہ روم کی تائید کی، اور اس کو نور باطن نے شرک وبت پرستی کے اس ڈوبتے ہوئے جہاز کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دینے سے روکا نہیں۔

مسلمانوں میں بھی جن کو اشراق اور قوت کشفیہ پر پورا اعتماد تھا، ان کے باطنی محسوسات ومکشوفات میں بھی بکثرت تعارض ملتا ہے، ایک صاحبِ کشف دوسرے صاحب کشف سے اختلاف کرتا ہے، اس کے کشف کو امر واقعی کے خلاف بتاتا ہے، اور کبھی اس کو سُکر اور غلبۂ حال پر محمول کرتا ہے، عقول (جن کا ذہن اور کتب فلسفہ کے علاوہ) کہیں وجود خارجی نہیں، ان سے یہ اہل کشف مصافحہ کرتے ہیں، اور ان سے اپنی ملاقات ثابت کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، تصوف

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مذہب واخلاق کا انسائیکلوپیڈیا بعنوان (NEO - PLATONISM)

کی تاریخ اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔

شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی مقتول

ان مسلمان اہل اشراق میں چھٹی صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) کا اشراقی حکیم شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی (۵۴۹ - ۵۸۷ھ) معروف بالمقتول خاص شہرت رکھتا ہے، جو اپنے مخالف اسلام اور انتشار انگیز عقائد و خیالات کی بنا پر الملک الظاہر کے حکم سے ۵۸۷ھ کو قتل کیا گیا، وہ اپنے کو مشائی و صوفی کہتا تھا، اس کے یہاں مشائی تصورات کے ساتھ بقول (S. V. DEN BERGH) "وہ سارا متصوفانہ فلسفہ موجود ہے جو مسلمانوں نے یونانی نظریۂ تطبیق معتقدات اور اتحاد مذاہب سے اخذ کیا" انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مذکورہ بالا مقالہ نگار کے بقول "دراصل یہ نوافلاطونی نظریۂ نور ہے، جس کو اشیاء کی بنیادی حقیقت تصور کیا جاتا ہے"[1]۔

شہرزوری لکھتے ہیں "وہ دونوں فلسفے یعنی فلسفۂ ذوقیہ (اشراقیہ) اور فلسفۂ بحثیہ (فلسفہ مشائیہ) کا جامع تھا" اس کی اہم کتاب "حکمت الاشراق" ہے، جس کی شرح علامہ قطب الدین شیرازی نے کی اور وہ "شرح حکمت الاشراق" کے نام سے علمی و درسی حلقوں میں مشہور ہے۔

شیخ الاشراق کے نزدیک عقول کی تعداد دس میں محدود نہیں بلکہ ہر نوع کے لئے ایک عقل ہے، جو اس کی حفاظت کرتی ہے، شیخ الاشراق ان کو انوار مجردہ کہتا ہے، شیخ الاشراق کے نزدیک آسمان ایک زندہ مخلوق ہے، اس میں نفس مجردہ پایا جاتا ہے، جو اس کو حرکت دیتا ہے، وہ عدم و فساد سے محفوظ ہے، آسمان میں نفس ناطقہ پایا جاتا ہے، اس لئے اس میں حواس بھی پائے جاتے ہیں، اس کے نزدیک کل آسمان ایک زندہ مخلوق ہیں، اور انوار عالیہ یعنی عالم مجردات کا

[1] دائرۂ معارف اسلامیہ۔

اثر ان پرستاروں کے ذریعہ سے پڑتا ہے، اور انہی کے ذریعہ سے قوائے جسمانیہ حرکت میں آتے ہیں سب سے بڑا ستارہ سورج ہے، اشراقیین کے مذہب میں اس کی تعظیم واجب ہے، عالم کائنات میں بالذات و بالواسطہ نور ہی نور کی حکومت ہے، حرکت و حرارت نور سے پیدا ہوتی ہے، اور آگ میں یہ دونوں اوصاف اور عناصر سے زیادہ پائے جاتے ہیں، جس طرح نفس عالم ارواح کو روشن کرتا ہے، اسی طرح آگ عالم اجسام کو روشن کرتی ہے، خدا نے ہر عالم میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کیا ہے، عالم عقول میں عقل اول، عالم افلاک میں ستارے اور ان کے نفس ناطقہ، عالم عناصر میں نفوس بشریہ اور ستاروں کی شعاعیں اور آگ بالخصوص (رات کی تاریکی میں) اس کے خلیفہ ہیں، یعنی اس کی اصلاح و تدبیر کرتی ہے، خلافت کبریٰ انبیاء کے نفوس کاملہ کو حاصل ہوتی ہے، خلافت صغریٰ آگ سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ تاریک راتوں میں وہ انوار علویہ اور ستاروں کی شعاعوں کی قائم مقامی کرتی ہے، غذا اور خام چیزوں کو پختہ کرتی ہے، شیخ الاشراق کے نزدیک عالم قدیم ہے، زمانہ ازلی و ابدی ہے، وہ تناسخ کا قائل نہیں، لیکن اس کا انکار بھی نہیں کرتا (کیونکہ اس مسئلہ میں فریقین کے دلائل تسلی بخش نہیں ہیں[1])۔

اس طرح اپنے وقت کا ممتاز اشراقی حکیم جس نے مشرق میں شیخ الاشراق کا لقب پایا، اور جس کی ذہانت، تبحر علمی اور زہد و تجرد اس کے معاصرین کو بھی تسلیم ہے، اس کو اس کی اشراقیت وصفائے نفس، یونانی مفروضات اور ایرانی و مجوسی مزخرفات کے اختیار کرنے سے باز نہیں رکھ سکی، وہ بعثت محمدی اور اس پر مرتب ہونے والی ہدایت، فلاح دینی و دنیوی اور معرفت صحیحہ سے محروم رہا، اس نے ایک غیر متوازن، انتشار و اضطراب سے بھری ہوئی ناکام زندگی گزاری اور وہ اپنے پیچھے ہدایت اور نفع خلائق کا کوئی نظام چھوڑے بغیر دنیا سے رخصت ہوا۔

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حکمائے اسلام" ج ۲ از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم۔

عقل وکشف دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں

کانٹ (KANT) نے عقل خالص کے وجود میں بہت شبہ ظاہر کیا ہے، اور ثابت کیا کہ اس کا بے آمیز اور اندرونی وبیرونی اثرات سے آزاد ہونا تقریباً ناممکن ہے، لیکن وہ کشف و علم باطنی کی دنیا سے ناآشنا تھا، اس لئے وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا، مجدد صاحبؒ جو اس دریا کے بھی غواص تھے ایک قدم آگے بڑھ کر کشف خالص اور الہام خالص کے مشکل اور نادرالوجود ہونے پر مفصل روشنی ڈالی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ اشراق اور صفائی نفس کے ذریعہ بھی ان غیبی حقائق اور لاریبی علوم تک رسائی ممکن نہیں جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی بعثت کے راستہ سے عوام وخواص کو حاصل ہوتے ہیں، اس طرح بعثت کے بغیر نہ وصول الی المعرفت ہوتا ہے، نہ حصولِ نجات، نہ حقیقی تزکیہ اس سلسلہ میں ان کے چند مکتوبات کے اقتباسات پڑھئے!

"ان نادانوں (حکماء) کے ایک گروہ نے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے راستہ کی پابندی کے بغیر صوفیہ الہیہ (جو ہر زمانہ میں انبیاء کے پیرو اور تبع رہے ہیں) کی تقلید میں ریاضت اور مجاہدہ کا راستہ اختیار کیا ہے، اور اپنے وقت کی صفائی پر فریب کھایا، اور اپنے خواب وخیال پر اعتماد کیا، اور اپنے خیالی کشف وکشوف کو اپنا مقتدیٰ بنایا، "ضلّوا فاضلّوا" (خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کیا) یہ نہیں جانتے کہ یہ صفائی نفس کی صفائی ہے جو گمراہی کی طرف راستہ دکھاتی ہے، نہ کہ صفائی قلب جو کہ ہدایت کا دریچہ ہے، اس لئے کہ قلب کی صفائی انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی پیروی سے وابستہ ہے، اور نفس کا تزکیہ (اصلاح وتصفیہ) قلب کی صفائی کے ساتھ مربوط ہے، [1] اس شرط کے ساتھ کہ وہ نفس کی اصلاح وتربیت کرے، قلب جو ذاتِ باری تعالیٰ کے انوار کا مظہر ہے، اس کی ظلمت کے ساتھ نفس جو صفائی پیدا کرے گا اس کا حکم اس چراغ کا سا ہے جس کو اس لئے روشن کیا گیا ہو تا کہ

پوشیدہ دشمن یعنی ابلیس لعین (اس کی روشنی میں) گھر کو تاراج وبرباد کردے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کا طریقہ نظر واستدلال کے رنگ میں اس وقت اعتبار واعتماد پیدا کرے گا، جب وہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی تصدیقات کے ساتھ ہو جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے تبلیغ فرماتے ہیں، اور اس کی مدد ان کی امداد کرتی ہے ان حضرات کا نظام ایسے ملائکہ کے نزول کی وجہ سے (جو غلطی اور گناہ سے محفوظ ہیں) دشمن لعین کے مکر سے محفوظ ہے، اللہ تعالےٰ ان کے متعلق فرماتا ہے کہ "إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ" (بے شک میرے خاص بندے تیرا (اے ابلیس) ان پر کوئی زور نہیں) اور یہ بات دوسروں کو میسر نہیں اور اس لعین کے نامبارک جال سے ان کی رہائی متصور نہیں سوائے اس کے جو ان حضرات کی پیروی کرے، اور ان کے نقش قدم پر چلے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے سچ کہا ہے ؎

محالست سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

"سعدی سلامتی کے راستہ پر محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے بغیر چلنا محال ہے" اللہ کا درود وسلام ہو، ان پر اور ان کی آل اور ان کے تمام برادران انبیاء پر۔[1]

کشف میں آمیزش

"یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کشف کی غلطی ہمیشہ القاء شیطانی ہی کی بنا پر نہیں ہوتی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض غیر واقعی اور صداقت سے عاری احکام متخیلہ میں جاگزیں ہو جاتے ہیں، وہاں شیطان کا کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن (یہ خیالات) خارج میں متشکل ہو کر آتے ہیں اسی سلسلہ کی

[1] مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی

یہ چیز ہے کہ بعض لوگوں کو خواب میں آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوتی ہے' اور وہ آپ سے بعض ایسے احکام اخذ کرتے ہیں' (جو شریعت کے ثابت شدہ مسائل اور احادیث صحیحہ کے خلاف ہوتے ہیں) اس صورت میں القاء شیطانی متصور نہیں ہے' علماء کی تحقیق یہ ہے کہ شیطان آپ کی صورت میں متمثل نہیں ہوتا تو اس صورت میں صرف متخیلہ کا تصور ہوتا ہے' جس نے خلاف واقع کو واقع سمجھ لیا ہے۔[1]

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"نفس خواہ تزکیہ کے ذریعہ نفس مطمئنہ بن گیا ہو لیکن وہ اپنی صفات سے پورے طور سے مجرد نہیں ہوتا اس لئے غلطی کو اس کے اندر بھی راہ پا جانے کا موقع ملتا ہے۔"[2]

فلاسفہ اور انبیاء کی تعلیم کا تضاد

اتنا تحریر فرمانے کے بعد آپ فلاسفہ و انبیاء کی تعلیمات کے درمیان اس کھلے تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے' اور جن میں تطبیق ممکن نہیں اور یہ کہ ان کی عقلی مساعی اور بلند پروازیاں "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مرادف ہیں۔

ارشاد فرماتے ہیں:۔

"فلاسفہ کی عقل ناقص گویا نبوت سے بالکل ضد اور مقابل سرے پر واقع ہوئی ہے' ابتدائے عالم کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی' ان کے مسائل و مباحث انبیاءً علیہم الصلوات والتسلیمات کی تعلیمات کے بالکل مخالف ہیں' انھوں نے نہ ایمان باللہ درست کیا نہ ایمان بالآخرت' عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں' حالانکہ تمام اہل ادیان و

---

[1] مکتوب ۱۰۷ بنام محمد صادق کشمیریؒ۔ [2] مکتوب ۲۱۱ بنام شیخ درویش۔

اہل ملل کا اجماع ہے کہ عالم حادث ہے' اپنے تمام اجزاء کے ساتھ' اسی طرح آسمانوں کے پھٹ جانے' تاروں کے جھڑ جانے' پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے' سمندروں کے بہ پڑنے کے قائل نہیں جس کا بروز قیامت وعدہ ہے' اسی طرح اجسام کے دوبارہ زندہ ہونے کے منکر ہیں' اور قرآن کی تصریحات کا انکار کرتے ہیں' ان کے متأخرین جو اپنے کو اہل اسلام کے گروہ میں شامل کرتے ہیں' اسی طرح اپنے فلسفی اصول پر جمے ہوئے ہیں' اور افلاک و کواکب اور اسی طرح دوسری چیزوں کے قدیم ہونے کے قائل ہیں' اور ان کے فنا و ہلاک نہ ہونے کے مدعی' ان کی خوراک قرآنی تصریحات کی تکذیب' اور ان کا رزق دین کے اصولی مسائل کا انکار ہے' عجب طرح کے مومن ہیں کہ خدا اور رسول پر ایمان لاتے ہیں' لیکن خدا اور رسول نے جو کچھ فرمایا ہے' اس کو قبول نہیں کرتے' اس سے بڑھ کر حماقت نہیں ہو سکتی' کسی شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

فلسفہ چوں اکثرش باشد سفہ پس کُل آں
ہم سفہ باشد کہ حکم کل حکم اکثر است

فلسفہ چوں کہ اس کے لفظ کا بڑا حصہ "سفہ" (حماقت ہے) اس لئے وہ کل حماقت ہی ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ اکثر کُل کا حکم رکھتا ہے۔

اس جماعت نے اپنی عمر ایسے آلہ (منطق) سیکھنے سکھانے میں صرف کی جو فکری غلطی سے محفوظ رکھنے والا ہے' اور اس بارے میں انھوں نے بڑی زحمتیں اٹھائیں' مگر جب ذات و صفات و افعال باری تعالےٰ کی بحث کو پہونچے جو مقصد اعلیٰ ہے' تو انھوں نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیئے' اور اس آلہ کو جو غلطی سے محفوظ رکھنے والا ہے' ہاتھ سے دیکر ٹھوکریں کھانے لگے' اور گمراہی کے دشت و بیابان میں بھٹکنے لگے' جیسے کہ ایک شخص برسوں جنگ کے سامان و آلات کو

تیار کرتا رہتا ہے، اور عین جنگ کے وقت ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے اور اس سے کچھ بنتا نہیں۔

لوگ علوم فلسفہ کو بہت باقاعدہ اور منظم سمجھتے ہیں، اور غلطی و خطا سے محفوظ جانتے ہیں، اگر اس کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ حکم ان علوم کے بارے میں ہوگا جن میں عقل تنہا کافی ہوسکتی ہے، جو یہاں مبحث سے خارج ہے، اور مالایعنی (غیر مفید مطلب) کے حکم میں ہے اور آخرت سے جو دائمی ہے، کچھ واسطہ نہیں رکھتے اور نجات اخروی ان سے وابستہ نہیں، گفتگو ان علوم کے بارے میں ہے کہ عقل ان کے ادراک میں عاجز و قاصر ہے، اور وہ طریقۂ نبوت سے مربوط ہیں اور نجات اخروی ان سے وابستہ ہے" پھر آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

"علم منطق جو ایک ایسا علم ہے جو (بعد کے علوم عالیہ کے لئے) ایک آلہ کے طور پر ہے، اور اس کے متعلق لوگوں نے کہا ہے کہ وہ خطا سے حفاظت کرنے والا ہے، ان کو کام نہیں آتا اور مقصد اعلیٰ میں ان کو خطا اور غلطی سے اس نے باہر نہیں نکالا، وہ ان کے کام نہ آیا تو دوسروں کے وہ کیا کام آئے گا، اور غلطی سے کسی طرح نکالے گا؟

(اللہ تعالیٰ سے اسی کے الفاظ میں دعا ہے) "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ" (اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کر اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش بے شک تو بڑا بخشنے والا ہے۔ سورۂ آل عمران۔ ۸)

بعض آدمی جو علوم فلسفہ میں کچھ "دخل در معقولات" رکھتے ہیں، اور فلسفیانہ ملمع سازیوں کے فریب میں ہیں، اس جماعت کو حکماء جان کر انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کا ہم سر اور مقابل سمجھتے ہیں، بلکہ قریب ہے کہ ان کے جھوٹے علوم کو سچا جان کر انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی شریعتوں پر مقدم رکھیں، اللہ ہم کو برے اعتقاد سے بچائے، تو ہاں حسب وقت

ان کو حکماء جانتے ہیں اور ان کے علم کو حکمت کہتے ہیں، خواہ مخواہ اس بلا میں گرفتار ہوتے ہیں، اس لئے کہ حکمت نام ہے کسی شیئی کے اس علم کا جو حقیقت واقعی کے مطابق ہو، پس جو علوم (مثلاً انبیاء کی شریعتیں) ان علوم حکمت کے مخالف ہوں گے، وہ ان حکماء کے خیال میں حقیقت واقعی کے خلاف ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان کی تصدیق اور ان کے علوم کی تصدیق انبیاء کی تکذیب اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے علوم کی تکذیب ہے، اس لئے کہ یہ دونوں (حکماء اور انبیاء کے) علوم ایک دوسرے سے بالکل مقابل سرے پر واقع ہوئے ہیں، ایک کی تصدیق دوسرے کی تکذیب کو مستلزم ہے، جو چاہے انبیاء کے دین کا پابند ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے ہو اور اہل نجات میں سے ہو اور جس کا جی چاہے فلسفی ہو جائے، اور شیطان کے گروہ میں سے ہو اور نامراد و ناکامیاب ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا"[۱] (جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے بیشک ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ تیار کی ہے جس کی قناتوں نے ان کو گھیر لیا ہے، اور اگر وہ پیاس سے فریاد کریں گے تو ان کی دادرسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے سیسہ کی طرح ہوگا جو منہ کو جلادے گا اور وہ بری چیز ہوگی) اور سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی پابندی کی، ان پر اور ان کے برادران انبیاء کرام و ملائکہ عظام پر مکمل ترین اور اعلیٰ ترین درود و سلام ہو[۲]۔

[۱] سورۂ الکہف۔ ۲۹ [۲] مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

بعثت کے بغیر حقیقی تزکیہ ممکن نہیں

"ہم یہ کہتے ہیں کہ تصفیہ وتزکیہ ان نیک اعمال سے وابستہ ہیں، جو مولیٰ جل شانہ کو پسندیدہ اور اس کے یہاں مقبول ہوں اور یہ بات جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا بعثت پر موقوف ہے پس بعثت کے بغیر صفائی اور تزکیہ کی حقیقت نصیب نہیں ہوتی۔"[1]

انبیاء کی بعثت کی ضرورت اور عقل کا ناکافی ہونا

مجدد صاحب بعثت انبیاء ورسل کی ضرورت، ہدایت کے لئے اس کے ناگزیر ہونے اور تنہا عقل کے (خواہ وہ کتنی بلند پایہ ہو) ناکافی ہونے پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت دنیا والوں کے لئے رحمت ہے اگر ان حضرات کے وجود کا ذریعہ نہ ہوتا تو ہم گمراہوں کو اللہ تعالیٰ (جو واجب الوجود ہے) کی ذات وصفات کی پہچان کی طرف کون رہنمائی کرتا، اور اس کی پسندیدگی وناپسندیدگی کے کاموں میں کون امتیاز پیدا کرتا؟

ہماری ناقص عقلیں ان حضرات انبیاء کی دعوت کی روشنی کی مدد کے بغیر اس مطلب سے عاجز اور ہماری ناتمام سمجھ ان حضرات کی تقلید کے بغیر اس معاملہ میں بے بس اور درماندہ ہے۔

ہاں عقل ضرور حجت ہے لیکن حجت ہونے میں ناکمل اور تاثیر وتکمیل کے درجہ کو

۱؎ مکتوب ۱/۲۶۶ بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ۔

نہیں پہونچتی حجت بالغہ صرف انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت ہے جس سے دائمی عذاب وثواب اخروی وابستہ ہے۔"[1]

بعثت اللہ کی ذات و صفات و احکام کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے

"بعثت رحمت ہے اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی پہچان حاصل کرنے کا سبب ہے، جو تمام دینوی واخروی سعادتوں پر مشتمل ہے، بعثت کی اسی دولت سے اس بات کا علم وامتیاز ہوتا ہے کہ جناب باری تعالیٰ کے مناسب شان کیا ہے، اور نامناسب کیا ہے، اس لئے کہ ہماری بے بصیرت اور عاجز عقل جو امکان اور حدوث کے داغ اور نقص سے داغدار ہے، اس کو کیا معلوم کہ حضرت باری جو قدیم ہے کون سے اسماء صفات اور افعال اس کی شان کو مناسب ہیں، جن کا اطلاق کیا جائے اور کون سے نامناسب جن سے احتراز کیا جائے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے نقص کی وجہ سے ہماری عقل کمال کو نقص اور نقص کو کمال جانتی ہے، یہ امتیاز (جو نبوت پیدا کرتی ہے) خاکسار کے نزدیک تمام ظاہری وباطنی نعمتوں سے بڑھ کر ہے بڑا بدبخت ہے جو نامناسب امور اور ناشائستہ اشیاء کی اس ذات عالی سے نسبت کرے، بعثت ہی ہے، جس نے باطل کو حق سے جدا کیا اور اس میں جو عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور جو عبادت کا مستحق ہے امتیاز پیدا کر دیا ہے، بعثت ہی کے ذریعہ یہ حضرات انبیاء اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور بندگان خدا کو قرب الٰہی اور وصال مولیٰ کی سعادت سے مشرف کرتے ہیں، اور اسی بعثت کے ذریعہ مالک جلّ وعلا کے مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے، جیسے کہ اوپر بیان ہوا اور اس کی تمیز ہوتی ہے کہ اس کے

۱؎ مکتوب ۱/۲۶۶ بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ۔

ملک میں کس چیز میں تصرف جائز ہے اور کس میں جائز نہیں، بعثت کے اس طرح کے فوائد بہت ہیں، پس ثابت ہوا کہ انبیاء کی بعثت رحمت ہے، جو شخص نفس امارہ کی خواہشات کا پیرو ہو کر شیطان لعین کے حکم سے بعثت کا انکار کرے، اور بعثت کے احکام و مقتضا پر عمل نہ کرے تو اس میں بعثت کا کیا گناہ ہے اور بعثت کیوں رحمت نہ ہو؟"[1]

اللہ کی معرفت انبیاء ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے

"چونکہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے تواتر و تسلسل کی وجہ سے خدا کی طرف (جو زمین و آسمان کا خالق ہے جل شانہ) ان کی دعوت دینے کی شہرت ہوئی، اور ان حضرات کی بات اور پیغام بلند ہوا تو ہر زمانہ کے بے عقل جو صانع عالم کے ثبوت کے بارے میں تردد کرتے تھے، اپنی غلطی پر مطلع ہو کر بے اختیار صانع کے وجود کے قائل ہو گئے، اور اشیاء و مخلوقات کو اس کی طرف منسوب کیا، یہ روشنی حضرات انبیاء ہی کے انوار سے ماخوذ ہے اور یہ دولت انبیاء ہی کے خوان نعمت سے ملی ہے، اللہ کا درود و سلام ہو ان پر قیامت بلکہ ابدالآباد تک۔

اسی طرح وہ تمام منقولات جو ہم تک انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے پہونچانے سے پہونچے ہیں مثلاً ذات الٰہی کے صفات کمالیہ، انبیاء کی بعثت، ملائکہ کا معصوم ہونا، علیہم الصلوات والتسلیمات والبرکات، حشر و نشر، بہشت و دوزخ کا وجود اور جنت کی دائمی راحت و عیش اور جہنم کا دائمی عذاب، یہ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کی شریعت خبر دیتی ہے عقل ان کو پالینے سے قاصر ہے، اور ان حضرات (انبیاء) سے سنے بغیر ان کے ثابت کرنے میں ناقص اور تنہا ناکافی ہے۔"[2]

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ۔ [2] مکتوب ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

صحیح ترتیب

"سب سے پہلے رسول پر ایمان لانے کی فکر کرنی چاہئے، اور اس کی رسالت کی تصدیق کرنی چاہئے تاکہ تمام احکام میں اس کو سچا جانا جائے اور اس کے ذریعہ سے شکوک و شبہات کی تاریکیوں سے نجات میسر ہو، جڑ کو پہلے معقول و معلوم کر لینا چاہئے، تاکہ سب فروع اور شاخیں بے تکلف معقول و معلوم ہو جائیں، ہر شاخ و ہر فرع کو اصل کے ثابت کئے بغیر معقول بنانا بڑا مشکل ہے۔

اس تصدیق تک پہونچنے اور اطمینان قلب کے حاصل کرنے کا قریب ترین راستہ ذکر الٰہی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝"[1] (یاد رکھو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے خوشحالی ہے اور اچھا ٹھکانہ) غور و استدلال کے راستہ سے اس بلند مقصد تک پہونچنا دور ہے۔ بقول شاعر ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود"

(اہل استدلال کا پاؤں لکڑی کا ہے، اور لکڑی کا پاؤں بے قابو و بے ثبات ہوتا ہے)[2]

انبیاء کی رسالت کی تصدیق کرنے والا اصحاب استدلال میں سے ہے

"معلوم ہونا چاہئے کہ انبیاء کرام کی تقلید کرنے والا ان کی نبوت کے ثابت کرنے

[1] سورۂ الرعد۔ ۲۸-۲۹۔ [2] مکتوب ۳۶/۳ بنام میر محمد نعمانؒ۔

کے بعد اور ان کی رسالت کی تصدیق کے بعد اس کا شمار صاحب استدلال لوگوں میں ہے، اس کا ان حضرات کی باتوں کو بے دلیل ماننا اس وقت (ان کی نبوت کو استدلال کے ساتھ مان لینے کے بعد) عین استدلال ہے، مثلاً ایک شخص نے اصول کو استدلال سے ثابت کر لیا ہے، اس وقت جتنے فروع اس اصل سے پیدا ہوتے ہیں، وہ اسی (پہلے) استدلال کے ساتھ متعلق ہوں گے، اور وہ شخص اس اصل کے استدلال کے ساتھ ان تمام فروع کے اثبات میں صاحب استدلال ہوگا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ[1] وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی[2]" (اس اللہ کا شکر ہے، جس نے ہم کو اس کی ہدایت دی اور ہم ہدایت پانے والے نہ تھے، اگر ہمیں ہدایت نہ دیتا بیشک ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق کے ساتھ آئے اور سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی[3]"

انبیاء کی اطلاعات کو اپنی عقل کا پابند بنانا طریق نبوت کا انکار ہے

"حساب، میزان، صراط، حق ہے، اس لئے کہ سچے خبر دینے والے (علیہ وعلی آلہ الصلوات والتسلیمات) نے اس کی خبر دی ہے، طریق نبوت کے بعض ناواقفوں کا ان کے وجود کو مستبعد سمجھنا درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، اس لئے کہ نبوت کا طریق عقل کے طریق سے ماوراء ہے، انبیاء کی دی ہوئی سچی اطلاعات کو عقل کے طریق بحث و نظر سے موافق کرنا درحقیقت نبوت کے طریق کا انکار کرنا ہے (ان مسائل ماوراء عقل میں) دار و مدار انبیاء کی باتوں کے بے دلیل ماننے پر ہے[4]"

---

[1] سورۂ الاعراف۔۴۳ [2] سورۂ طٰہٰ۔۴۷ [3] مکتوب ۳۶/۳ بنام میر محمد نعمانؒ۔

[4] مکتوب ۲۶۶/۱

مخالف عقل اور ماوراء عقل میں بڑا فرق ہے

"یہ نہ سمجھیں کہ نبوت کا طریق کچھ عقل کے طریق کے مخالف ہے بلکہ بات یہ ہے کہ عقل کا طریق (علم و استدلال) انبیاء کی تقلید کے بغیر اس مقصد عالی تک پہونچ نہیں سکتا، مخالفت دوسری چیز ہے، اور نارسائی دوسری چیز، اس لئے کہ مخالفت پہونچنے کے بعد متصور ہو سکتی ہے[1]"

خدا کی تعظیم کا طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے

"پس انبیاء کے وجود سے چارہ نہیں، تاکہ محسن حقیقی جل سلطانہ (جس کی ہستی عقل سے لازماً ثابت و ضروری ہے) کے شکر کے طرف رہنمائی کریں اور ان احسانات کے کرنے والے کی علمی و عملی تعظیم کو اس کی طرف سے معلوم کر کے ظاہر کریں، اس لئے کہ اس کی تعظیم جو اس کے یہاں سے معلوم نہ کی جائے، اس کے شکر کے شایان شان نہیں، اس لئے کہ انسانی قوت اس ادراک کرنے سے عاجز ہے، بلکہ بسا اوقات انسان غیر تعظیم کو تعظیم سمجھنے لگتا ہے، اور شکر سے ہجو کی طرف چلا جاتا ہے، اور اس سے اس کی تعظیم کا معلوم کرنا نبوت پر منحصر ہے، اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے، اولیاء کو جو الہام ہوتا ہے، وہ بھی انوار نبوت سے ماخوذ ہے، اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے اتباع و پیروی کے فیوض و برکات میں سے ہے[2]"

---

[1] مکتوب بنام پیرزادگان خواجہ عبداللہؒ خواجہ عبیداللہؒ فرزندان گرامی حضرت خواجہ باقی باللہؒ ۲۶۶/۱

[2] مکتوب ۲۳/۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے ماوراء ہے اسی طرح نبوت کا مرتبہ عقل سے ماوراء ہے

"اور جس طرح سے کہ عقل کا مرتبہ حواس کے مرتبہ سے ماوراء ہے کہ جس چیز کا حواس سے ادراک نہیں کیا جا سکتا عقل اس کا ادراک کرتی ہے، اسی طرح سے نبوت کا طریقہ عقل کے طریقہ اور مرتبہ سے ماوراء ہے، جس کا عقل سے ادراک نہیں کیا جا سکتا، وہ نبوت کے وسیلہ سے ادراک میں آتا ہے، جو شخص عقل کے طریقہ کے علاوہ حصول علم کے لئے کوئی اور طریقہ تسلیم نہیں کرتا وہ فی الحقیقت طریقۂ نبوت کا منکر اور ہدایت کا مخالف ہے۔"[1]

مقامِ نبوت

یونان کے علوم، حکمت و فلسفہ میں (جو صدیوں تک انبیاء کی دعوت اور نور نبوت سے دور دور برگ و بار لاتے رہے ہیں) شب و روز مشغول رہنے اور اسی کو علم و دانش کا سدرۃ المنتہیٰ سمجھنے، دوسری طرف کتاب و سنت کی رہنمائی اور ان سے ضروری واقفیت اور حدیث و سیرت سے شغف کے بغیر جسمانی ریاضتوں نفس کشی اور چلہ کشی میں ہمہ تن منہمک رہنے کی بنا پر پچھلی صدیوں میں (جن کا واضح طور پر آغاز آٹھویں صدی سے ہو جاتا ہے) مقامِ نبوت سے نہ صرف ایک ناآشنائی اور بے اُنسی بلکہ ایک طرح کی اجنبیت اور وحشت پیدا ہونے لگی تھی، اور چونکہ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور خود سیرت نبوی ان حکماء اور اشراقیین کے سامنے اس طرح آتی تھی کہ یہ نفوس قدسیہ عام انسانوں کی طرح زندگی گزارتے تھے، شادی بیاہ کرتے تھے، آل و اولاد رکھتے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بعض اوقات

[1] مکتوب ۲۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی۔

انھوں نے تجارت بھی کی، جانور بھی چرائے، جنگوں میں حصہ لیا، واقعات سے متأثر ہوتے تھے، خوشی کی بات پر خوش ہوتے تھے اور رنج و قلق کی بات پر محزون و مغموم ہوتے تھے، نہ ان کے یہاں ایسی عبادات شاقہ تھیں، نہ صوم دائمی، نہ چلہ کشی، جن کا ذکر متوسط درجے کے اولیاء و مرتاضین کے یہاں ملتا ہے، پھر دعوت و تبلیغ رسالت کے کام میں ان کو خلق خدا کی طرف توجہ کرنی پڑتی تھی، جس کے بغیر یہ فریضہ ادا نہیں ہو سکتا، اور ایک توجہ دوسری توجہ سے عام طور سے مانع ہوتی ہے، اس لئے اشراق و روحانیت کے ان حلقوں میں جہاں علومِ دینیہ بالخصوص حدیث سے اشتغال نہیں تھا، اور جہاں اولیاء متقدمین اور اشراقیین کے عروج روحانی، تجرید و تفرید کامل اور فنائیت و غیبوبت کے واقعات دن رات ورد زبان رہتے تھے، یہ خیال عام ہوتا جا رہا تھا کہ ولایت کا مقام نبوت کے مقام سے افضل ہے، اور یہ کہ ولایت تمامتر توجہ الی الحق اور انقطاع عن الخلق کا نام ہے، اور نبوت کا موضوع دعوت ہے، جس کا تعلق خلائق سے ہے، ولی "رو بحق" ہوتا ہے، اور نبی "رو بخلق" اور "رو بحق" ہونے کی حالت بہرحال "رو بخلق" ہونے کی حالت سے اعلیٰ و افضل ہے، بعض لوگوں نے اس میں اتنی احتیاط برتی کہ انھوں نے یہ کہا کہ ولایت مطلقاً نبوت سے افضل نہیں، جنھوں نے ایسا کہا ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے، اور نبی جب مشغول بالخالق ہوتا ہے تو اس کی یہ حالت اس حالت سے افضل ہوتی ہے جب وہ دعوت کے سلسلہ میں مشغول بالخلق ہوتا ہے، لیکن یہ طرز فکر اس پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ مقام ولایت کی عظمت اور اس کے کمالات و ترقیات سے مرعوبیت مسلمانوں کے بھی ایک وسیع دینی حلقہ میں پیدا ہوتی جا رہی تھی، جو امت کے اپنے اصل سرچشمۂ نبوت و شریعت کے ساتھ ربط پر اثر انداز ہو رہی تھی، اور یہ ایک خطرہ تھا جس کا مقابلہ مجدد دین اسلام اور

نائبین انبیاء کو کرنا ضرور تھا۔

ہمارے علم میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے پرزور مدلل اور وجد انگیز طریقہ پر آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں ہندوستان کے مشہور عارف و محقق صوفی حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (۶۶۱-۷۸۶ھ) نے آواز بلند کی اور اپنے مکتوبات میں اس کی پُرزور تردید کی،[1] انھوں نے یہاں تک لکھا کہ انبیاء کی ایک سانس اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے، انبیاء کا جسم خاکی اپنی صفائی و پاکیزگی اور قرب خداوندی میں اولیاء کرام کے دل اور ان کے سر اور راز و نیاز کے برابر ہے۔[2]

حضرت مخدوم بہاری کے بعد پھر حضرت مجدد الف ثانی ہی اس علم عظیم اور اس طریق قویم کے مجدد اور خاتم ہوئے، انھوں نے اپنے مکاتیب میں ثابت کیا کہ انبیاء کرام اعتقادی، روحانی، ذہنی اور خلقی طور پر اللہ تعالیٰ کی صنعت اور صفتِ جود کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، ان کو ایسا تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے، جس میں کوئی توجہ اور مصروفیت حاجب نہیں ہوتی، اور یہ اس شرح صدر کا نتیجہ ہے، جس سے اللہ تعالیٰ ان کو خاص کرتا ہے، ان کی عالی ظرفی، قوت تحمل، وسعت صدر اور ان کے پیغام اور کام کا (جو ان کے سپرد کیا جاتا ہے) تقاضا "صحو دائم"، ہر وقت کی بیداری، حاضر دماغی اور ہوش ہے، جو اہلِ ولایت و اہل سکر کو حاصل نہیں، ان کی جہاں سے ابتدا ہوتی ہے، وہ اولیاء کی انتہا ہے، نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے، جس کو قرب بالنوافل کبھی نہیں پہونچ سکتا، کمالاتِ ولایت کمالات نبوت کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتے ہیں جو قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے، اب قارئین مجدد صاحب کی زبانِ قلم سے ان حقائق اور علوم عالیہ کو سنیں:!

۱؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم باب دہم ص ۲۹۸-۳۰۲ ۲؎ ایضاً ص ۳۰۲

انبیاء بہترین موجودات ہیں، اور بہترین دولت ان کے سپرد کی گئی ہے

"انبیاء تمام موجودات میں بہترین ہیں، اور بہترین دولت ان کے حوالہ کی گئی ہے، ولایت جزءِ نبوت ہے، نبوت کُل ہے، لامحالہ نبوت ولایت سے افضل ہوگی، خواہ نبی کی ولایت ہو خواہ ولی کی، پس صحو بھی سکر سے افضل ہے، اس لئے کہ صحو میں سکر مندرج ہے، جیسے کہ ولایت نبوت میں مندرج ہے، باقی تنہا ہوش و بیداری جو عوام الناس کو رہتی ہے خارج از بحث ہے، اس عامیانہ صحو پر ترجیح دینا کوئی معنی نہیں رکھتا، وہ صحو جو سکر پر مشتمل ہے، وہ ضرور سکر سے افضل ہے، علوم شریعت جن کا ماخذ و سرچشمہ مرتبہ نبوت ہے، سراسر صحو ہے، ان علوم کے مخالف جو کچھ ہوگا وہ سکر ہے، صاحب سکر معذور ہے، تقلید کے لائق علوم صحو ہیں نہ کہ علوم سکر۔"[1]

انشراح صدر کی وجہ سے انبیاء کی توجہ خلق توجہ حق سے مانع نہیں ہوتی

"بعض مشائخ نے سکر و مستی کے وقت فرمایا ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے، اور بعض دوسرے صاحبوں نے فرمایا کہ اس ولایت سے نبی کی ولایت مراد ہے، تاکہ ولی کی نبی پر افضلیت کا وہم دور ہو جائے، لیکن فی الحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہے، اس لئے کہ نبی کی نبوت اس کی ولایت سے افضل ہے، ولایت میں سینہ کی تنگی کی وجہ سے خلق کی طرف پوری توجہ نہیں ہو سکتی، اور نبوت میں سینہ کی انتہائی فراخی اور کشائش کی وجہ سے نہ توجہ حق توجہ خلق سے مانع ہوتی ہے، اور نہ توجہ خلق توجہ حق میں حائل ہوتی ہے، نبوت میں تنہا خلق کی

۱؎ مکتوب ۹۵، ۱ سید احمد بجواڑہ۔

طرف توجہ نہیں ہوتی کہ ولایت کو (جس کا رخ اور توجہ حق کی طرف ہوتی ہے) ترجیح دی جائے عیاذاً باللہ سبحانہ، تمامتر توجہ خلق عوام کالانعام کا مرتبہ ہے، نبوت کی شان اس سے بلند و برتر ہے اس حقیقت کا سمجھنا اربابِ سکر کے لئے دشوار ہے، یہ معرفت صاحبِ استقامت اہلِ ہوش کا حصہ ہے۔ ع

هنيئاً لأرباب النعيم نعيمها"[1]

نبی کا باطن حق کے ساتھ ہوتا ہے اور ظاہر خلق کے ساتھ

"بعض اہل سکر علم ولایت کو جو سکر کی طرف رخ رکھتا ہے، علم نبوت پر جو صحو کا رنگ رکھتا ہے، ترجیح دیتے ہیں، اسی عالم سکر کا یہ مقولہ بھی ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ" (ولایت نبوت سے افضل ہے) اس بنا پر کہ ولایت میں توجہ حق تعالےٰ کی طرف ہوتی ہے اور نبوت میں خلق کی طرف، اور اس میں شبہ نہیں کہ "روبحق" "روبخلق" سے افضل ہے اور بعض اس کی توجیہ میں کہتے ہیں کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے۔

خاکسار کے نزدیک اس طرح کی باتیں دوراز کار ہیں، اس لئے کہ نبوت میں خلق ہی کی طرف توجہ نہیں ہوتی، بلکہ اس توجہ کے ساتھ حق کی طرف بھی رخ ہوتا ہے، صاحبِ مقامِ نبوت کا باطن حق کے ساتھ ہوتا ہے، اور ظاہر خلق کے ساتھ جو تمام تر خلق کی طرف متوجہ ہو وہ مدبروں اور برگشتہ لوگوں میں سے ہے"[2]

"اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہا ہے" کے مقولہ کی تردید

"کسی کا یہ مقولہ بالکل بے معنیٰ بات ہے کہ اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہا ہے اور

[1] مکتوب ۱۰۴/۱ میاں سید احمد بجواڑی [2] مکتوب ۹۵/۱ سید احمد بجواڑہ

اولیاء کی ابتداء اور انبیاء کی انتہا سے مراد ان کے نزدیک شریعت ہے، ہاں اس غریب کو چونکہ حقیقت حال سے آگاہی نہیں اس لئے یہ خلاف ظاہر بات زبان سے نکالی، ان حقائق کو اگرچہ کسی نے بیان نہیں کیا، بلکہ اکثر لوگوں نے اس کے بالکل برعکس اظہار خیال کیا ہے، اور یہ بعید از فہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن وہ منصف جو انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی بزرگی کا پہلو دیکھتا ہے اور شریعت کی عظمت اس پر مستولی ہے وہ ان دقیق اسرار کو قبول کرسکتا ہے، اور اس کو قبول کرنے کو زیادتیٔ ایمان کا وسیلہ بنا سکتا ہے"[1]

انبیاء نے دعوت کو عالم خلق پر منحصر کیا ہے اور صرف قلب سے بحث کی ہے

"اے فرزند سنو! کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نے دعوت کو عالم خلق پر منحصر رکھا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں (شہادت توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) پر ہے، اور چونکہ قلب کو عالم خلق سے زیادہ مناسبت ہے، اس لئے قلب کی تصدیق کی بھی دعوت دی، اور قلب کے ماوراء کو نہیں چھیڑا اور اس سے بحث نہیں کی، اور اس کو مقاصد میں شمار نہیں کیا، دیکھو بہشت کے عیش، دوزخ کی تکلیفیں، دولت دیدار اور محرومی کی بے دولتی یہ سب عالم خلق سے وابستہ ہیں، عالم امر کو ان سے تعلق نہیں ہے"[2]

نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے

"اسی طرح فرض، واجب اور سنت کے اعمال کی ادائیگی کا تعلق قالب سے ہے، جو عالم خلق سے ہے، جو عالم امر کا حصہ ہے وہ اعمال نافلہ میں سے ہے، جو قرب ان اعمال کی

[1] مکتوب ۲۶۰/۱ بمخدوم زادہ میاں شیخ محمد صادق [2] ایضاً

ادائیگی کا ثمرہ ہے، وہ اعمال کے مطابق ہوتا ہے پس لامحالہ جو قرب اداء فرائض کا ثمرہ ہے، وہ عالم خلق کا حصہ ہے، اور جو قرب ادائے نوافل کا ثمرہ ہے وہ عالم امر کا حصہ ہے، اور اس میں شک نہیں کہ نفل کا فرض کے مقابلہ میں کوئی شمار و حساب نہیں، اس کو وہ نسبت بھی تو نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے، بلکہ نفل کو سنت کے مقابلہ میں بھی یہی نسبت ہے اگرچہ سنت و فرض کے درمیان بھی قطرہ و دریا کی نسبت ہے، اس بات سے دونوں قرب کا باہمی تفاوت میں قیاس کیا جاسکتا ہے، اور عالم خلق کی فضیلت و خصوصیت عالم امر پر اس فرق سے سمجھی جاسکتی ہے۔"[1]

کمالات ولایت کمالات نبوت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے

"اس فقیر پر اللہ تعالےٰ نے واضح کردیا ہے کہ کمالات ولایت کا کمالات نبوت کے مقابلہ میں کوئی شمار نہیں، وہ نسبت بھی تو نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے پس جو فضیلت و خصوصیت نبوت کی راہ سے حاصل ہوتی ہے، وہ اس فضیلت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، جو ولایت کی راہ سے حاصل ہوتی ہے، پس افضلیت مطلق انبیاء ہی کو حاصل ہے (علیہم الصلوٰت والتسلیمات) ملائکہ کرام کو جزئی فضیلت حاصل ہے، اس لئے جمہور علماء ہی کا قول درست ہے۔ اس تحقیق سے ظاہر ہوا کہ کوئی ولی نبی کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا (علیہم الصلوات والتسلیمات) بلکہ اس ولی کا سر اس نبی کے قدم کے نیچے ہوگا۔"[2]

علماء کے علوم و تحقیقات کی صحت و فوقیت کی وجہ

"جس مسئلہ میں علماء اور صوفیاء کے درمیان اختلاف ہے، اگر تم غور سے دیکھو گے تو

۱؎ مکتوب ۲۶۰/۱ بمخدوم زادہ میاں شیخ محمد صادق ۲؎ مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و عبیداللہ۔

حق علماء کی جانب نظر آئے گا، اس کا راز یہ ہے کہ انبیاء کی پیروی کی وجہ سے علماء کی نظر کمالات نبوت اور ان کے علوم تک نفوذ کرجاتی ہے، اور صوفیہ کی نظر کمالاتِ ولایت اور ان کے علوم و معارف پر مقصور رہتی ہے، پس لامحالہ جو علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوگا، وہ زیادہ صحیح اور حق ہوگا بمقابلہ اس کے جو مرتبۂ ولایت سے ماخوذ ہوگا۔"[1]

"فقیر نے اپنی کتابوں اور خطوط میں لکھا ہے، اور تحقیق کی ہے کہ کمالات نبوت سمندر کا حکم رکھتے ہیں، اور کمالات ولایت ان کے مقابلہ میں ایک حقیر قطرہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے ایک جماعت نے کمالات نبوت تک نہ پہونچنے کی وجہ سے کہا ہے "الولایۃ افضل من النبوۃ" (ولایت نبوت سے افضل ہے) ایک دوسرے گروہ نے اس کی تاویل اس طرح کی ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے، ان دونوں گروہوں نے حقیقت نبوت کو نہ جاننے کی وجہ سے غائب پر حکم لگایا ہے، اسی حکم کے قریب سُکر کو صحو پر ترجیح دینا بھی ہے، اگر صحو کی حقیقت ان کو معلوم ہوتی تو ہرگز سُکر کو صحو سے کچھ نسبت بھی نہ دیتے۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

شاید انھوں نے خواص کے صحو کو عوام کی ہوشیاری و بیداری کے مثل سمجھ کر سکر کو اس پر ترجیح دی ہے تو خواص کے سُکر کو عوام کے نشہ و مستی کا مماثل قرار دے کر یہی حکم لگاتے کیونکہ عقلاء کے نزدیک ثابت ہے کہ صحو سکر سے بہتر ہے، اگر صحو و سُکر مجازی ہے تو بھی یہی حکم ہے اور اگر حقیقی ہے تو بھی یہی حکم ثابت ہے۔"[2]

انبیاء کی عظمت نبوت کی وجہ سے ہے

"اتنا ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات نے جو کچھ عظمت و بزرگی

۱؎ ایضاً ۲؎ مکتوب ۲۶۸/۱ بنام خانخاناں

پائی ہے، وہ نبوت کی راہ سے پائی ہے نہ کہ ولایت کی راہ سے، ولایت کی حیثیت نبوت کے لئے ایک خادم سے زیادہ نہیں، اگر ولایت کو نبوت پر ترجیح ہوتی تو ملاء اعلیٰ کے ملائکہ جن کی ولایت تمام ولایات سے زیادہ کامل ہے، انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات سے افضل ہوتے، اس جماعت کے ایک گروہ نے چونکہ ولایت کو نبوت سے افضل مانا اس لئے ملاء اعلیٰ کی ولایت کو انبیاء کی ولایت سے اکمل سمجھا اور لامحالہ ملائکہ ملاء اعلیٰ کو انبیاء علیہم الصلوات التسلیمات سے افضل گردانا، اور جمہور اہل سنت سے علیحدہ ہو گئے، یہ سب حقیقت نبوت سے بے خبری ولاعلمی کا نتیجہ ہے، چونکہ عہد نبوت کے بُعد کی وجہ سے لوگوں کی نگاہ میں کمالاتِ نبوت کمالاتِ ولایت کے مقابلہ میں حقیر نظر آتے ہیں، اس لئے اس مضمون کو میں نے اس باب میں تفصیل و وضاحت سے لکھا، اور حقیقت حال کا ایک شمہ بیان کیا، "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ"[1]

ایمان بالغیب انبیاء، ان کے اصحاب اور علماء و عام مومنین کا حصہ ہے

"حمد و صلوٰۃ کے بعد سیادت پناہ اخوی واعزی میر محب اللہ کو معلوم ہو کہ وجودِ واجب تعالےٰ اور اس کی تمام صفات پر ایمان بالغیب انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات اور ان کے اصحاب کا حصہ ہے، اور ان اولیاء کا جو تمام و کمال (خلق کو خالق جل وعلا کی طرف دعوت دینے کے لئے) بازگشت فرماتے ہیں، اور ان کی نسبت بھی (پیغمبروں کے) اصحاب کی نسبت ہوتی ہے، اگرچہ وہ کمتر بلکہ اقل قلیل ہیں، اور یہ ایمان بالغیب علماء اور عام مومنین کا بھی حصہ ہے، اور ایمان شہودی عام صوفیاء کا حصہ ہے، ارباب عزلت (خلقِ خدا سے یکسو

[1] مکتوب ۲۶۸/۱ بنام خانخاناں۔

ہوں)، یا ارباب عشرت (اصحاب اختلاط) ہوں، اس لئے کہ ارباب عشرت اگرچہ مرجوع (بازگشت کرنے والے) ہیں لیکن تمام و کمال ان کا بازگشت نہیں ہوتا، ان کا باطن اسی طرح اوپر کی طرف نگراں رہتا ہے، وہ بظاہر خلق کے ساتھ ہوتے ہیں، اور بباطن حق جل شانہ کے ساتھ، اس لئے ہر وقت ایمان شہودی ان کے حصہ میں ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات چونکہ تمام و کمال بازگشت فرما چکے ہوتے ہیں، اور ظاہر و باطن سے خلق کو حق جل وعلا کی طرف دعوت دینے میں متوجہ ہوتے ہیں، اس لئے ایمان غیب ان ہی کا حصہ ہوتا ہے"[1]

انبیاء کی بازگشت کامل نہایۃ النہایۃ تک پہونچ جانے کی علامت ہے

"اس فقیر نے اپنے بعض خطوط میں ثابت کیا ہے کہ بازگشت کے باوجود بلندی کی طرف آنکھوں کا لگا رہنا نقص کی علامت ہے اور انجام کار تک نہ پہونچنے کا ثبوت ہے، اور تمام و کمال بازگشت نہایۃ النہایۃ (انتہا کی انتہا) تک پہونچ جانے کی علامت ہے، صوفیاء نے دونوں توجہات (توجہ بخلق و توجہ بحق) کی جامعیت کو کمال سمجھا ہے، اور تشبیہ و تنزیہ کے جامع کو کاملین میں شمار کیا ہے۔ ع

آں ایشانند و من چنینم یا رب"[2]

شریعت کی حمایت و نصرت اصلاح عقائد اور ردِّ شرک و رسوم جاہلیت

تعلق مع اللہ کی تقویت و استواری، غفلت و مادیت سے حفاظت اور امراض نفسانی کے علاج کا وہ طریقہ جس کا نام مرور زمانہ اور بعض اسباب و محرکات کی بنا پر بعد میں تصوف

[1] مکتوب ۲۷۲/۱ بنام میر سید محب اللہ مانکپوری۔ [2] ایضاً

پڑ گیا، حقیقت میں قرآنی اصطلاح کے مطابق "تزکیہ" اور حدیث صحیح کی تعبیر کے مطابق "احسان" ہی کا وہ دینی شعبہ تھا جس کو قرآن مجید میں بعثت محمدی کے مقاصد چہارگانہ میں شمار کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ○ (الجمعہ - ۲)	وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب سے) ایک پیغمبر بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ) سے پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں) سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

امت کی یہ خدمت اور دین کو اس کے قالب و قلب، جسم و روح اور ضابطہ و رابطہ کے ساتھ قائم رکھنے کا کام خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین اور نائبین برحق کے ذمہ تھا، اور وہ شریعت محمدی کے ساتھ اس "طب نبوی" کی بھی حفاظت و تجدید کرتے رہے، اور فقہ ظاہر کے ساتھ فقہ باطن کی بھی اشاعت و تبلیغ میں سرگرم رہے، ان کا یہ کام تفصیل کے بجائے اجمال، اور فروع سے زیادہ اصول پر مبنی تھا، لیکن قلمرو خلافت اور فتوحات اسلامی کی توسیع، وسیع پیمانہ پر اشاعت اسلام، دولت اور وسائل عیش و عشرت کی فراوانی، زمانۂ نبوت سے بُعد اور بمصداق "فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ" جب شیطان کے مکائد، مادیت کے فتنے اور امراض نفسانی و روحانی نئی نئی شکلوں میں اور نئے نئے فلسفوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے تو تزکیہ و احسان کا فن بھی "تصوف" کی حادث اصطلاح کے ساتھ اسی طرح ایک مدون فن بن گیا، جس طرح عجمی قوموں کے اختلاط نے قواعد زبان (صرف و نحو اور فن معانی و بیان کو (جن کے اصول و مبادی عربی اللسان قوموں کی فطرت میں داخل تھے) نحو و بلاغت کے وسیع و دقیق فن کی شکل میں منتقل کر دیا اور اس کے ماہرین خصوصی پیدا ہونے شروع ہو گئے، جنھوں نے مستقل "مدارس" و "جامعات" قائم کئے اور ان کے لئے مستقل نصاب

وضع کئے، اور ان کی طرف ان علوم کے طالبین اور ان مقاصد کے شائقین کا رجوع عام شروع ہوا۔

ابتدائی صدیوں میں اس طریقۂ علاج (تزکیہ یا تصوف) کا مدار کار کتاب و سنت، اسوۂ رسول کی پیروی اور شمائل و اخلاق نبوی کے تتبع پر تھا، لیکن زمانہ کے اثرات عجمی اور نومسلم قوموں کے اختلاط، عجمی زہاد و نساک کی صحبت و عقیدت کے نتیجہ میں تصوف میں بدعات، زہد و عبادت میں غلو، تجرد و رہبانیت کے جراثیم، اشخاص و معتقد فیہ لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم و تقدیس کی رسم اور بہت سے خود ساختہ اعمال و رسوم داخل ہونے شروع ہو گئے، یہاں تک کہ یہ غیر اسلامی اور سر تا سر اجنبی و بیرونی اعتقاد بھی بعض روحانی حلقوں اور سلسلوں میں دبے پاؤں چلا آیا کہ "اخلاص و انہماک اور پوری دقیقہ رسی کے ساتھ ایک عرصہ تک عبادت میں مشغول رہنے اور فرائض و سنن کی پابندی کرنے اور عرفان کامل حاصل ہونے کے بعد ایک منزل ایسی آتی ہے، جب سالک ان فرائض شرعی اور عبادات راتبہ کا مکلف نہیں رہتا اور وہ ان کی پابندی سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے" اسی کا نام "سقوط تکلیف" ہے اور اس اعتقاد کے لوگ قرآن مجید کی مشہور آیت "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ"[1] (اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ آپ کو "یقین" آجائے) سے استدلال کرتے ہیں، یہ ایک عظیم فتنہ تھا، جو پورے نظام شریعت کو معطل اور سالک کو بے قید اور عبادات کی پابندیوں سے آزاد کر دیتا تھا۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی کی ابتدا سے جب عباسی خلافت اپنے اوج شباب پر اور عظیم اسلامی شہر اپنے تمدن و ترقی کے نقطۂ عروج پر تھے، بدعات و تحریفات کا یہ سلسلہ

[1] یہاں یقین سے باتفاق مفسرین و اہل لغت موت مراد ہے۔ (الحجر - ۹۹)

واضح طریقہ پر شروع ہوگیا تھا تصوف کی سب سے قدیم کتاب جو اس وقت تک زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہے، شیخ ابو النصر سراج (م ۳۷۸ھ) کی "کتاب اللمع" ہے، اس کا ایک حصہ "کتاب الاسوۃ والاقتداء برسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" سے موسوم ہے[1] اس کے بعد حضرت سید علی ہجویری[2] (م ۴۶۵ھ) کی کتاب "کشف المحجوب" میں غالباً اسی بنا پر "اقامت حقیقت بے حفظ شریعت محال...... وحقیقت بے شریعت نفاق" کے آگاہی دینے والے الفاظ آئے ہیں، امام ابو القاسم قشیری متوفی ۴۶۵ھ کا "رسالہ قشیریہ" تصوف کا سب سے قدیم ہدایت نامہ اور دستور العمل تھا، ان کے زمانہ ہی میں تصوف میں اتنا تنزل ہوگیا تھا کہ وہ "رسالہ قشیریہ" میں لکھتے ہیں:۔

وارتحل عن القلوب حرمة الشريعة	دلوں سے شریعت کی حرمت رخصت ہوگئی
فعدوا قلة المبالاة بالدين أوثق	انھوں نے دین سے لاپرواہی کو ایک بڑا قابل
ذريعة ...... واستخفوا بأداء	اعتماد ذریعہ سمجھ لیا، عبادات کے اداء کرنے کو
العبادات واستهانوا بالصوم والصلوة[3]	کوئی اہمیت نہیں دی اور صوم وصلوٰۃ کو
	معمولی چیز سمجھا۔

ان کی کتاب کے باب اول کا عنوان ہی تعظیم شریعت سے متعلق ہے، اور اس میں انھوں نے قدیم صوفیاء اور مشائخ کی تعظیم شریعت اور اتباع سنت کے حالات لکھے ہیں، آخری باب (۵۴) میں جو "باب وصیۃ المریدین" کے عنوان سے ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

بناء هذا الامر وملاكه على حفظ آداب	اس معاملہ کی بنیاد اور دار ومدار آدابِ شریعت
الشريعة۔	کی حفاظت پر ہے۔

---

[1] "کتاب اللمع" ص ۹۳-۱۰۴ مطبوعہ لندن ۱۹۱۴ء [2] پورا نام ابو الحسن علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی ہے، عام طور پر داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، لاہور میں مزار ہے۔ [3] رسالہ قشیریہ ص ۱ مطبوعہ مصر۔

پوری کتاب حقائق شرعیہ وعلوم صحیحہ کے مطابق ہے، اور محققین صوفیاء نے اس کو ایک مستند درسی کتاب کی سی اہمیت دی ہے۔

مشائخ طریقت وائمۂ حقیقت میں شریعت کے سب سے بڑے حامی وناصر سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رح ہوئے ہیں، ان کی تعلیمات میں سب سے زیادہ زور پابندی سنت واتباعِ شریعت پر تھا، اور ان کی پوری زندگی اسی کا جلوہ اور نمود تھی "غنیۃ الطالبین" لکھ کر انھوں نے طریقت کا پلو شریعت کے دامن سے باندھ دیا ہے، ان کے مواعظ "فتوح الغیب" کا مقالۂ دوم اتباع سنت وترک بدعت ہی سے مخصوص ہے اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

اتبعوا ولا تبتدعوا	پیروی سنت کرتے رہو اور راہ بدعت نہ اختیار کرو!

طریقت کو شریعت کا خادم وتابع بنانے کے کام میں ان کو مجدد کا درجہ حاصل ہے، وہ پہلے فرائض پھر سنن پھر نوافل سے مشغول ہونے کی ہدایت فرماتے ہیں، اور اول کو چھوڑ کر دوسرے سے مشغول ہونے کو حمق ورعونت بتاتے ہیں۔

تصوف کی مقبول ترین ومستند ترین کتاب شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) کی "عوارف المعارف" ہے، جس کو محققین صوفیاء نے ہر دور میں حرز جان بنا کر رکھا، اور بہت سی خانقاہوں میں اس کا درس ہوتا تھا، اس کتاب کی جلد ثانی ارکان شریعت کے آداب واسرار کے بیان میں ہے، شیخ نے کتاب میں نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "تصوف نام ہے قولاً فعلاً حالاً ہر حیثیت سے اتباع رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا، اور اسی پر مداومت رکھنے سے اہل تصوف کے نفوس مقدس ہوجاتے ہیں، حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور ہر شئی میں اتباع رسول ہونے لگتا ہے"[1]

نویں صدی ہجری میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے تلامذہ کے برقی اثر سے جو

---

[1] تفصیل اور مزید مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو "تصوف اسلام" از مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم

عالم اسلام میں ایک تیز لہر کی طرح پھیل رہا تھا تصوف ایک فلسفہ بن گیا، جس میں یونانی فلسفۂ الٰہیات کی بہت سی اصطلاحیں اور مسائل شامل ہو گئے، وحدۃ الوجود اہل تصوف کا شعار اور سرمایۂ افتخار بن گیا، اور خانقاہوں سے لے کر مدرسوں تک اسی کا دم بھرا جانے لگا، کتاب و سنت سے عدم اشتغال، اور فن حدیث سے ناواقفیت، اور اس کی صحیح اور اس کی مستند کتابوں سے محرومی کی بنا پر، خانقاہیں ایسے عقائد و اعمال کی آماجگاہ بن گئیں، جن کی سند دین کے اصلی ماخذوں سے ملنا مشکل اور جن سے قرون اولیٰ کے مسلمان یکسر ناآشنا تھے۔

ادھر ہندوستان میں جو ہزاروں برس سے جوگ اور سنیاس کا مرکز تھا، مسلمان صوفیوں کا واسطہ ان مرتاض جوگیوں سے پڑا جنھوں نے اپنے خیال اور نفس کی قوت حبس دم اور آسنوں کے ذریعہ بہت بڑھالی تھی، بعض مسلمان صوفیوں نے ان سے یہ علم حاصل کیا، دوسری طرف (گجرات کو مستثنیٰ کر کے جہاں علمائے عرب کی تشریف آوری اور حرمین شریفین کی آمد و رفت کی وجہ سے حدیث کی اشاعت ہو چکی تھی، اور علامہ علی متقی برہان پوری اور ان کے نامور شاگرد علامہ محمد طاہر پٹنی پیدا ہوئے تھے) یہ ملک صحاح ستہ اور ان مصنفین کی کتابوں سے ناآشنا تھا، جنھوں نے نقد حدیث اور رد بدعت کا کام کیا، اور سنت صحیحہ اور احادیث ثابتہ کی روشنی میں زندگی کا نظام العمل پیش کیا، ہندوستان کے ان مقامی روحانی فلسفوں اور تجربوں کا اثر اپنے زمانہ کے مشہور و مقبول شطاری شیخ محمد غوث گوالیاری کی مقبول کتاب "جواہر خمسہ" میں دیکھا جا سکتا ہے، جس کی بنیاد زیادہ تر بزرگوں کے اقوال اور اپنے تجربات پر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہونے یا معتبر کتب شمائل و سیر سے اخذ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا گیا، اس میں نماز احزاب، صلوٰۃ العاشقین، نماز تنویر القبر اور مختلف مہینوں کی مخصوص نمازیں اور دعائیں ہیں، جن کا حدیث و سنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے، جو ہر دوم میں

اسماء اکبر یہ خاص شیخ کے جمع کئے ہوئے ہیں، جن میں فرشتوں کے عبرانی و سریانی نام ہیں اور حرف ندا سے ان کو خطاب کیا گیا ہے، جس سے استعانت بغیر اللہ کا شبہ ہوتا ہے، ایک دعائے بشنخ بھی آتی ہے، جس میں عبرانی و سریانی اسماء حرف ندا کے ساتھ ہیں، ساری کتاب کی بنیاد دعوت اسماء پر ہے، ان اسماء کے موکل مانے گئے ہیں، جو اس کی اصل ماہیت سے واقف ہیں، حروف تہجی اور ان کے موکلوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اور "ناد علیاً مظہر العجائب" کی دعا بھی ہے۔

سنت و بدعت، شریعت و فلسفہ اور تصوف (اسلامی) اور جوگ کے اس اختلاط کے زمانہ میں حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کام شروع ہوا، اس صورت حال کی تصویر کھینچتے ہوئے، وہ خود اپنے مخدوم زادہ خواجہ محمد عبد اللہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

دریں وقت عالم بواسطہ کثرت ظہور بدعت در رنگ دریائے ظلمات بنظر می درآید و نور سنت باغربت و ندرت درآں دریائے ظلمانی در رنگ کرمکہائے شب افروز محسوس می گردد۔[1]

اس وقت عالم میں بدعات کا اس کثرت سے ظہور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ظلمات کا دریا امنڈ رہا ہے، اور سنت کا نور اس مواج دریا میں اس کے مقابلہ میں اس طرح ٹمٹما رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے اندھیرے میں کہیں کہیں جگنو اپنی چمک دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجدد نے اس نازک دور میں کہ ہندوستان میں مسلمان سلطنت کے ہاتھوں اسلام کی بیخ کنی اور خانقاہوں میں سنت کی ناقدری کی جا رہی تھی، اور صاف صاف کہا جا رہا تھا کہ "طریقت و شریعت دو الگ الگ کوچے ہیں، جن کی راہ و رسم ایک دوسرے سے جدا اور

---

[1] مکتوب ۲۳/۲ بنام مخدوم زادہ خواجہ محمد عبد اللہ۔

جن کا قانون ایک دوسرے سے الگ ہے" اور جہاں کسی صاحبِ علم طالب حق کو جو کبھی کسی امر کا شرعی ثبوت پوچھنے کی جرأت کر دیتا تھا، یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا تھا ؎

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

پوری بلند آہنگی سے آواز لگائی کہ "طریقت تابع و خادم شریعت ہے، کمالات شریعت احوال و مشاہدات پر مقدم ہیں، ایک حکم شرعی پر عمل ہزار سالہ ریاضت سے زیادہ نافع ہے، اتباعِ سنت میں خواب نیمروز (قیلولہ) احیائے لیل (شب بیداری) سے افضل ہے، حلت و حرمت میں صوفیاء کا عمل سند نہیں، کتاب و سنت اور کتب فقہ کی دلیل چاہئے، اہل ضلالت کی ریاضتیں موجب قرب نہیں باعث بُعد ہیں، صور و اشکال غیبی داخل لہو و لعب ہیں، تکلیف شرعی کبھی ساقط نہیں ہوتی"۔

اب اس کے بعد مکتوبات کے وہ اقتباسات پڑھئے جو انھیں حقائق پر مشتمل ہیں:۔

"شریعت تمام دنیوی و اخروی سعادتوں کی ضامن ہے، کوئی مطلوب ایسا نہیں کہ اس کی تکمیل کے لئے شریعت کے علاوہ کسی اور چیز کی احتیاج واقع ہو، طریقت و حقیقت جو صوفیاء کا مابہ الامتیاز ہے، دونوں شریعت کے خادم اور اخلاص کے حصول میں معاون ہیں، اس طرح طریقت و حقیقت کے حصول کا مقصد محض شریعت کو اس کی اصل روح کے ساتھ عمل میں لانے کا ذریعہ ہے، نہ کہ کوئی اور بات جو شریعت کے دائرہ سے خارج ہو، وہ حالات، وجد کی کیفیات اور علوم و معارف جو صوفیاء کو سلوک کے درمیان حاصل ہوتے ہیں، مقاصد میں داخل نہیں، وہ کچھ اشکال و خیالات ہیں جن کے ذریعہ اطفال طریقت کے دل بہلائے اور ان کی ہمت بڑھائی جاتی ہے، ان سب سے گزر کر مقام رضا پر پہونچنا چاہئے جو مقامات و

سلوک و جذبہ کی انتہا ہے"[1]

اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"کوتاہ اندیش، احوال و مواجید کو مقاصد اور شاہدات و تجلیات کو مطالب میں شمار کرتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہم و خیال کے زندان میں گرفتار ہیں اور کمالات شریعت سے محروم۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۚ[2] (الشوریٰ - ۱۳)	مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ ان کو بلاتے ہیں، اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دیدیتا ہے

ایک دوسرے مکتوب میں نوافل پر فرائض کی تقدیم و ترجیح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جن اعمال سے تقرب خداوندی حاصل کیا جاتا ہے، وہ یا تو فرائض ہیں یا نوافل، نوافل کی فرائض کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں، اپنے وقت پر کسی فرض کی ادائیگی ایک ہزار سال کے نوافل سے بہتر ہے اگرچہ وہ نیت خالص سے ادا کئے جائیں"[3]

ایک دوسرے مکتوب میں کہ نفس کی اصلاح اور اس کے امراض کے ازالہ میں بھی احکام شریعت پر عمل ہزاروں ریاضتوں اور مجاہدوں سے کہیں زیادہ مفید ہے، فرماتے ہیں:۔

"احکام شرعیہ میں سے کسی حکم پر عمل ہوائے نفسانی کے ازالہ میں ایک ہزار سال کی ان ریاضتوں اور مجاہدوں سے زیادہ اثر کرتا ہے جو اپنی طرف سے کئے جائیں بلکہ یہ ریاضات و مجاہدات جو شریعت غراء کے تقاضے سے واقع نہ ہوں نفسانی خواہشات و امراض کو اور زیادہ قوت پہونچانے والے ہیں، برہمنوں اور جوگیوں نے ریاضت و مجاہدہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن وہ ان کے لئے کچھ مفید نہ ہوئے، اور سوائے نفس کو اور موٹا کرنے اور اس کو

---

[1] مکتوب ۳۶/۱ بنام ملا حاجی محمد لاہوری [2] ایضاً [3] مکتوب ۲۹/۱ بنام شیخ نظام تھانیسری۔

غذا پہونچانے کے کچھ اور کام نہ آئے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں کمالات شریعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"دنیا کے اکثر لوگ خواب وخیال میں مست اور بادام واخروٹ پر اکتفا کئے ہوئے ہیں' ان کو کمالات شریعت کی کیا خبر اور طریقت وحقیقت کی اصل حقیقت کا کیا علم؟ شریعت کو وہ پوست (چھلکا) اور حقیقت کو مغز (گودا) سمجھتے ہیں' وہ نہیں جانتے کہ حقیقت حال کیا ہے' صوفیاء کی سطحی باتوں پر فریب کھائے ہوئے اور ان کے احوال ومقامات پر فریفتہ ہیں۔"[1]

ایک مکتوب میں ایک سنت نبوی پر عمل کرنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فضیلت تمام تر سنت سنیہ کی پیروی سے وابستہ اور امتیاز زواء از شریعت پر عمل کرنے سے مربوط ہے' مثلاً دوپہر کا سونا جو اتباع سنت کی نیت سے واقع ہو کروڑوں شب بیداریوں سے افضل اور زکوٰۃ کا ایک پیسہ ادا کرنا سونے کے پہاڑ خرچ کر دینے سے جو اپنی طرف سے ہو افضل ہے۔"[2]

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں کہ:۔

"صوفیائے خام ذکر وفکر کو اہم المہام سمجھ کر فرائض وسنن کی ادائیگی میں تساہلی برتتے ہیں' چلوں اور ریاضتوں کو اختیار کر کے جمعہ وجماعت ترک کر دیتے ہیں' وہ نہیں جانتے کہ جماعت کے ساتھ ایک فرض نماز کی ادائیگی' ان کے ہزاروں چلوں سے بہتر ہے' ہاں ذکر وفکر جو آداب شرعی کے مراعات کے ساتھ ہوں بہت بہتر اور ضروری ہے' ناقص علماء بھی نوافل کی ترویج میں کوشاں رہتے ہیں اور فرائض کو خراب وابتر رکھتے ہیں۔"[3]

میر محمد نعمان کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس گروہ (صوفیاء) میں ایک جماعت ہے' جو نماز کی حقیقت سے آگاہ اور اس کے کمالات

۱؎ مکتوب ۴۳ ج۱ بنام شیخ محمد چتری۔ ۲؎ مکتوب ۱۱۴ ج۱ بنام صوفی قربان ۳؎ مکتوب ۲۶۰ ج۱ بنام مخدوم زادہ شیخ محمد صادق

مخصوصہ سے واقف نہیں ہو سکی وہ اپنے امراض کا علاج دوسری چیزوں سے ڈھونڈتی اور اپنے مقاصد کا حصول دوسرے امور سے مربوط سمجھتی ہے' بلکہ ان میں سے ایک گروہ نماز کو دور از کار سمجھتے ہوئے اور اس کو غیر وغیریت پر مبنی سمجھتے ہوئے روزے کو نماز سے افضل سمجھتے ہیں کہ اس میں صفت صمدیت کا ظہور ہے اور ایک جم غفیر اپنے اضطراب کی تسکین سماع ونغمہ ـــ وجد وتواجد سے تلاش کرتی ہے' اور رقص ورقاصی کو بھی کمال سمجھ لیا ہے' کیا انھوں نے نہیں سنا کہ "ما جعل اللہ فی الحرام شفاءً" (اللہ تعالیٰ نے حرام چیز میں شفا نہیں رکھی) اگر ان پر ان کمالات کا جو نماز سے حاصل ہوتے ہیں' ایک شمہ بھی منکشف ہو جاتا تو وہ سماع ونغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد وتواجد کو یاد نہ کرتے۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند[1]

ایک جگہ اس صفائے نفس کا ذکر کرتے ہوئے جو غیر مسلموں اور فسق وفجور میں مشغول رہنے والے مرتاضوں کو حاصل ہوتی ہے' تحریر فرماتے ہیں:۔

"حقیقی تصفیہ وتزکیہ اعمال صالحہ کے کرنے پر موقوف ہے' جو مالک کی مرضیات میں شامل ہوں اور یہ بات بعثت پر موقوف ہے' جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے' پس بغیر بعثت کے حقیقی تصفیہ وتزکیہ میسر نہیں آسکتا' وہ صفائی جو کفار واہل فسق کو حاصل ہوتی ہے' وہ نفس کی صفائی ہے' قلب کی صفائی نہیں' صفائی نفس سوائے ضلالت کے کسی اور چیز کو نہیں بڑھاتی' اور سوائے خسارت کے کوئی اور راستہ نہیں دکھاتی' باقی بعض امور غیبی کا کشف جو کفار واہل فسق کو صفائی نفس کے وقت کبھی حاصل ہو جاتا ہے' وہ استدراج ہے' جس کا حاصل بربادی اور خسارہ کے علاوہ اس جماعت کے حق میں کچھ نہیں۔"[2]

سالک وعارف سے تکلیف شرعی کے سقوط اور فرائض واحکام شریعت کی پابندی سے اس کو چھٹی مل جانے کے خطرناک عقیدہ کی جو پوری شریعت کو ختم کر دینے کے لئے ایک آتش گیر مادہ

۱؎ مکتوب ۲۶۱ ج۱ بنام میر محمد نعمان ۲؎ مکتوب ۲۶۶ ج۱ بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ۔

یا سرِ رنگ کا کام انجام دے سکتا تھا، کی تردید کرتے ہوئے، —— ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"متصوفین خام اور ملحدین بے سرانجام اس فکر میں ہیں کہ اپنی گردنوں کو شریعت کی طوقِ غلامی سے آزاد اور احکام شرعیہ کو عوام کے ساتھ مخصوص بنا دیں، ان کا خیال ہے کہ خواص صرف معرفت کے مکلف ہوتے ہیں، جیسا کہ امراء و سلاطین محض عدل و انصاف کے مکلف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنے کا مقصد حصول معرفت ہے، جب معرفت میسر آگئی تکلیفات شرعیہ ساقط ہوگئیں اور اپنے استدلال میں یہ آیت پڑھتے ہیں:۔

"وَاعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰى يَاۡتِيَكَ الۡيَقِيۡنُ[1]" اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ آپ کو "یقین" آجائے

ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہوئے کہ حلت و حرمت میں صوفیاء کا عمل سند نہیں تحریر فرماتے ہیں:

"صوفیاء کا عمل حلت و حرمت میں سند نہیں، کیا اتنا کافی نہیں کہ ہم ان کو معذور رکھیں اور ملامت نہ کریں، اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں، اس معاملہ میں تو امام ابوحنیفہؒ امام ابویوسف اور امام محمد کا قول معتبر ہے، نہ کہ ابوبکر شبلی، ابوالحسن نوری کا عمل، اس زمانہ کے صوفیاء خام نے اپنے پیروں کے عمل کو بہانہ بنا کر سرود و رقص کو اپنے دین و ملت کے طور پر اختیار کیا ہے، اور اس کو طاعت و عبادت بنا لیا ہے "اِتَّخَذُوۡا دِيۡنَهُمۡ لَهۡوًا وَّلَعِبًا" (انھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے)[2]"

مجدد صاحب کی یہ حمایتِ شریعت حمیت کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، اور جب وہ کتاب و سنت اور جمہور اہل سنت کے عقیدہ کے خلاف کوئی صوفیانہ تحقیق یا حال سنتے اور اس کی سند تصوف کی کسی کتاب یا بزرگوں کے احوال و اقوال سے لائی جاتی تو ان کی رگِ فاروقی حرکت میں آجاتی اور ان کے قلم سے حمایت شریعت اور غیرت سنت کا طوفان امنڈ پڑتا،

[1] مکتوب ۲۶۰/۱ بنام میاں شیخ بدیع الدین [2] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام خواجہ عبداللہ و عبیداللہ۔

کسی خادم نے کسی بزرگ (شیخ عبدالکبیر یمنی) کا کوئی ایسا ہی شاذ اور وحشت انگیز قول نقل کیا تھا، مجدد صاحب اس کی تاب نہ لا سکے، اور ان کے قلم سے بے اختیار یہ فقرے نکل گئے:۔

"مخدوما! فقیر کو ایسی باتوں کے سننے کی تاب نہیں، بے اختیار میری رگ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے، اور تاویل و توجیہ کا موقع نہیں دیتی، ایسی باتوں کے قائل شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی، ہمیں کلام محمد عربی علیہ وعلیٰ آلہ والصلوٰۃ والسلام درکار ہے، نہ کہ کلام محی الدین بن عربی[1]، صدرالدین قونوی اور شیخ عبدالرزاق کاشی، ہم کو نص سے کام ہے نہ کہ فص سے[2] —— فتوحات مدنیہ نے فتوحات مکیہ سے مستغنی بنا دیا ہے[3]"

حضرت مجدد کے نزدیک شریعت غرّاء کے مطابق جو عمل کیا جائے وہ داخل ذکر ہے، ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ:۔

"تمام اوقات کو ذکر الٰہی جل شانہ میں مشغول رکھنا چاہیئے، جو عمل بھی شریعت غراء کے موافق ہوگا، وہ داخل ذکر ہے، اگرچہ بیع و شراء ہو، پس تمام حرکات و سکنات میں احکام شرعیہ کی مراعات ہونی چاہیئے تاکہ وہ سب ذکر ہو جائے، اس لئے کہ ذکر نام ہی ہے غفلت دور کرنے کا اور جب تمام افعال میں اوامر و نواہی شرعیہ کی مراعات کی جائے گی تو کرنے والے کو ان کا حکم دینے والے (خدائے واحد) سے جو حقیقی آمر و ناہی ہے، غفلت سے نجات حاصل ہو جائے گی اور اس کو دوام ذکر کی دولت میسر آئے گی[4]"

[1] شیخ محی الدین ابن عربی مراد ہیں، جن کا انتقال دمشق میں ہوا، اور وہیں مدفون ہوئے۔

[2] نص سے مراد نص شرعی ہے فص سے مراد شیخ اکبر کی کتاب "فصوص الحکم" کا کوئی حصہ (فص)۔

[3] مکتوب ۱۰۰/۲ بنام ملا حسن کشمیری۔

[4] مکتوب ۲۵/۲ بنام خواجہ محمد شرف الدین حسین۔

اس حمایت وحمیت شرعی کی بنا پر مجدد صاحب نے سجدۂ تعظیمی پر سخت نکیر کی، جو بعض مشائخ کے یہاں رائج ہونے لگا تھا، اور اپنے بعض اہل تعلق کو جن کے متعلق اس بارے میں تساہلی کی اطلاع ملی تھی سخت تنبیہ فرمائی[1] نیز مشرکانہ اعمال ورسوم کی تردید ومذمت میں (جن میں اس زمانہ میں تساہل شروع ہوگیا تھا) مراسم شرک کی تعظیم، غیر اللہ سے استمداد وطلبِ حوائج کے مشرکانہ عقیدہ، اہل کفر کے تہواروں کی تعظیم اور ان کے رسوم وعادات کی تقلید، بزرگوں کے لئے حیوانات کو نذر وذبح کرنے، پیروں، بیبیوں کی نیت سے روزہ رکھنے کی تردید ومذمت کے سلسلہ میں حضرت مجدد کی کھلی تصریحات اور واضح تنبیہات اس طویل مفصل مکتوب میں ملاحظہ ہوں، جو ایک ارادت رکھنے والی نیک خاتون کے نام لکھا گیا ہے۔[2]

یہ اصلاح عقائد، ردّ شرک وبدعت اور دین خالص کی دعوت کا وہ عظیم الشان تجدیدی کام تھا جو عرصۂ دراز کے بعد حضرت مجدد نے ہندوستان کی سرزمین پر شروع کیا، (جس کی مسلمان آبادی غیر مسلم اکثریت کے درمیان گھری ہونے اور اسلام کے حدیث العہد ہونے کی بنا پر مشرکانہ جاہلیت کے خطرہ سے ہر وقت دوچار تھی) اور پھر اس کی تکمیل وتوسیع انھیں کے سلسلہ کے نامور مشائخ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خاندان[3] اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت نے زبان وقلم، رسائل وتصنیفات، ترجمۂ قرآن وحدیث اور اپنے وسیع تبلیغی دوروں کے ذریعہ کی۔

---

[1] ملاحظہ ہو مکتوب ۹۲/۲ بنام سیادت پناہ میر محمد نعمان، ومکتوب ۲۹/۱ بنام شیخ نظام الدین تھانیسری۔

[2] مکتوب ۴۱/۳ بصالحہ از اہل ارادت۔

[3] جن میں ان کے نامور پوتے مولانا محمد اسماعیل شہید (۱۲۴۶ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہاں اس پر قدرے تفصیل وتعیین کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے:-

ہندوستان میں جہاں اسلام کی بنیاد مختلف تاریخی اسباب کی بناء پر ہمیشہ سے کمزور رہی ہے اور جو دنیا کے چند بڑے مشرکانہ مذاہب واقوام کا مرکز ووطن ہے اسلام کا چشمۂ صافی زیادہ مکدّر ہونے لگا تھا، اور اندیشہ تھا کہ یہ چشمۂ حیواں اس بحرِ ظلمات میں اس طرح گم ہو جائے کہ کسی خضرِ طریق کو بھی اس کا نشان نہ ملے، الف ثانیؒ کے مجدّد نے جب اپنا سفرِ تجدید شروع کیا تو انبیاء کے کارِ نبوّت کی عین ترتیب کے مطابق پہلا قدم یہیں سے اٹھایا، جہانگیر کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار آپ کی تاریخ تجدید کا روشن عنوان ہے، اپنے مکاتیب میں نہایت واضح اور جامع، جچے تُلے الفاظ میں توحید کی تشریح فرمائی[1] اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کے تنہا مستحق عبادت ہونے کے دلائل بیان کئے، جو آپ کے رسوخ فی العلم کا نمونہ ہیں، شرک کے مراسم ومظاہر کی تردید فرمائی، رسوم جاہلیت، اعمال مشرکانہ، تقلید کفار سے اپنے متبعین ومعتقدین کو سختی سے منع فرمایا کہ تجدید کا کام اس کے بغیر شروع ہی نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ مکمل ہو۔

تعظیمِ مراسمِ شرک

شرک کے مراسم، اور کفر کے میلہ اور تہوار کی تعظیم کا شرک میں بڑا پایہ ہے، دو دینوں کو بیک وقت سچّا ماننے والا اہل شرک میں سے ہے اور اسلام وکفر دونوں کے احکام پر عمل کرنے والا مشرک ہے، کفر سے علٰحدگی اور بیزاری اسلام کے لئے شرط ہے اور شرک کے شائبہ سے نفرت توحید ہے۔

غیر اللہ سے استمداد و طلب حوائج

امراض اور بیماریوں کے دور کرنے میں بتوں اور طاغوت سے مدد طلب کرنا جس کا جاہل مسلمانوں میں عام رواج ہوگیا ہے، عین شرک اور گمراہی ہے، تراشے ہوئے ناتراشیدہ پتھروں سے اپنی ضرورتیں مانگنا، حق تعالے کا صاف صاف انکار اور عین کفر ہے، اللہ تعالے بعض گمراہوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :۔

یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ	وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنا مقدمہ سرکش کے
وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَیُرِیۡدُ	پاس لے جائیں حالانکہ ان کو حکم ہوا ہے کہ
الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ۔	اس کو نہ مانیں، اور شیطان ان کو بھٹکا کر
(النساء ۔ ٦٠)	بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔

اکثر عورتیں اپنی انتہائی جہالت کی وجہ سے غیر اللہ سے جس مدد کے طلب کرنے کی ممانعت ہے، اس میں مبتلا ہیں، اور ان فرضی ناموں سے بلا دفع کرنے کی درخواست کرتی ہیں، اور شرک اور مراسم شرک کے ادا کرنے میں گرفتار ہیں۔

سیتلہ

خصوصیت کے ساتھ اس مشرکانہ عقیدہ، اور مشرکانہ اعمال و رسوم کا مشاہدہ اور احساس اس وقت ہوتا ہے، جب چیچک کا مرض (جو ہندوستان کی عورتوں میں سیتلہ کے نام سے مشہور ہے) پیش آجائے، اس وقت اچھی بری عورتیں سب اس عام جہالت اور کفر میں مبتلا نظر آتی ہیں، مشکل سے کوئی عورت ہوگی جو اس شرک کی باریکیوں سے

محفوظ ہو، اور اس کے رسوم میں سے کسی رسم کی طرف اس موقعہ پر وہ پیش قدمی نہ کرے، سوائے اس کے جس کو اللہ محفوظ رکھے۔

کافروں کے تہواروں کی تعظیم اور ان کی رسوم و عادات کی تقلید

اسی طرح ہندوؤں کے تہواروں کی تعظیم، اور یہودیوں کے مروّجہ رسوم کے دنوں کا منانا بھی شرک کا مستلزم، اور کفر کا متوجب ہے، چنانچہ ہندوؤں کی دیوالی کے دنوں میں جاہل مسلمان خصوصًا ان کی عورتیں کفار کی رسمیں پوری کرتی ہیں، اور اپنی عید مناتی ہیں، اور کفار کے تحائف کی طرح اپنی طرف سے بھی اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو بالکل مشرکین کے ہمرنگ تحفے تحائف بھیجتی ہیں، اور اپنے برتنوں کو (بالکل کفار کے رنگ میں) رنگین کرتی ہیں، اور سرخ فیرینی سے بھر کر بھیجتی ہیں، اور اس تہوار اور زمانہ کا بڑا اہتمام کرتی ہیں، یہ سب شرک ہے، اور دین اسلام کے ساتھ کفر و انکار ہے۔

بزرگوں کے لئے حیوانات کو نذر اور ذبح کرنا

اسی طرح حیوانات کی پیروں اور بزرگوں کے لئے منّت مانتے ہیں، اور ان کی قبروں پر لے جا کر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں، فقہی روایات میں اس عمل کو بھی شرک میں شمار کیا ہے، اور اس بارہ میں بڑی صفائی اور سختی سے کام لیا ہے، اور ایسے جانوروں کو ذبح کرنے کو بھی انھیں ذبیحوں کے ذیل میں شمار کیا ہے، جو جنّات کے نام پر، اور ان سے طمع اور خوف کی بنا پر مشرکین ذبح کیا کرتے تھے، جو شرعًا ممنوع ہے، اور شرک میں

داخل ہے، اس عمل سے بھی اجتناب ضروری ہے، کیونکہ اس میں شرک کی بو پائی جاتی ہے، نذر کے طریقے اور صورتیں بہت ہیں، کیا ضروری ہے کہ جانور کے ذبح کی ہی منّت مانی جائے، اور اس عمل کے ساتھ جنّات کے ذبیحوں میں شامل کرکے جنات کے پرستاروں کے ساتھ مشابہت پیدا کریں۔

پیروں اور بیبیوں کی نیت سے روزہ رکھنا

اسی قبیل سے عورتوں کا روزہ بھی ہے، جو وہ پیروں اور بیبیوں کی نیت سے رکھتی ہیں، اکثر اس کے نام اپنی طرف سے تراش کر ان کے ناموں پر اس کی نیت کرتی ہیں، اور افطار کے وقت ہر روزہ کے لئے خاص طریقہ اختیار کرتی ہیں، اور روزہ کے لئے دنوں کا تعیین بھی کرتی ہیں، اپنے مطالب و مقاصد کو ان روزوں کے ساتھ وابستہ کرتی ہیں، اور ان روزوں کے وسیلہ سے پیروں اور بیبیوں سے اپنی ضرورتیں طلب کرتی ہیں، اور یہ سمجھتی ہیں کہ انھیں کی طرف سے ان کی حاجت روائی ہوتی ہے، یہ عبادت میں شرک ہے، اور غیر اللہ کی عبادت کے وسیلہ سے اپنی ضرورتوں کو غیر اللہ سے طلب کرنا ہے، اس عمل کی قباحت اچھی طرح معلوم کرنی چاہئے، حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "روزہ میرے لئے ہے، اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا" یعنی روزہ میرے لئے مخصوص ہے، اور کسی دوسرے کے روزہ کی عبادت میں کوئی شرکت نہیں، اگرچہ کسی عبادت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکت جائز نہیں، لیکن روزہ کی تخصیص اس عبادت کی اہمیت کی وجہ سے ہے، اسی لئے تاکید کے ساتھ اس عبادت میں شرک کی نفی کرنی ہے۔

یہ محض ایک حیلہ ہے، جو بعض عورتیں (جب اس فعل کی قباحت بیان کی جاتی ہے) کہتی ہیں کہ ہم یہ روزے اللہ کے لئے رکھتے ہیں، اور ان کا ثواب پیروں کو بخشتے ہیں، اگر وہ اس بات میں سچّی ہوتیں تو روزوں کے لئے دنوں کا تعیین کیوں ضروری ہوتا، اور کھانے کی تخصیص، اور افطار میں مختلف قبیح طریقوں اور آداب کی تعیین کی حاجت کیا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ افطار کے وقت محرّمات کا ارتکاب کرتی ہیں، اور کسی حرام چیز سے افطار کرتی ہیں، اور بے ضرورت سوال کرتی ہیں، اور بھیک مانگتی ہیں، اور اس سے روزہ کھولتی ہیں، اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل، اور حاجت روائی کو اس فعل حرام کے ساتھ وابستہ سمجھتی ہیں، یہ خود عین گمراہی ہے، اور شیطان لعین کا دھوکہ، اللہ تعالیٰ ہی ان تمام چیزوں سے حفاظت فرمانے والا ہے۔" (مکتوب ۴۱/۳ بصالحہ از اہل ارادت)۔

اسی طرح سجدۂ تعظیمی کی ممانعت کے بارے میں آپ کے متعدد واضح اور طاقتور مکتوبات ہیں، جن میں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

اپنے ایک مرید میر محمد نعمان کے نام مکتوب میں فرماتے ہیں:-

"بعض فقہاء نے اگرچہ سلاطین کے لئے سجدۂ تحیت کو جائز قرار دیا ہے، لیکن سلاطین عظام کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس معاملہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع و فروتنی سے کام لیں، اور اس انتہائی پستی وشکستگی کو اللہ کے سوا کسی کے لئے جائز نہ کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک عالم کو ان کے لئے مسخر کردیا ہے، اور ان کا ضرورت مند بنا دیا ہے، اس نعمت عظمیٰ کو بجا لایا جائے، اور اس طرح کی خاکساری کو جو کمال عاجزی

اور شکستگی کو ظاہر کرتی ہے، اس بارگاہِ عالی کے لئے مخصوص رکھنا چاہیئے، اور اس معاملہ میں اس کے ساتھ شرکت نہیں ہونی چاہئے، اگرچہ ایک جماعت نے اس فعل کو جائز قرار دیا ہے، مگر ان سلاطین کو خود اپنی خاکساری اور ادب سے اس کی اجازت نہیں دینی چاہئے، کیونکہ مطابق ارشادِ ربانی:

"هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ" احسان کا بدلہ احسان ہی ہے"۔

(مکتوب ۹۲/۲ بنام میر محمد نعمان)

اپنے ایک مرید شیخ نظام تھانیسری کے مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

"لوگوں نے بیان کیا ہے کہ تمہارے بعض خلفاء کو ان کے مرید سجدہ کرتے ہیں، وہ زمین بوسی پر بھی اکتفا نہیں کرتے، اس فعل کی قباحت اظہر من الشمس ہے، ان کو منع کرو، اور منع کرنے میں پوری سختی اور تاکید سے کام لو، اس طرح کے افعال سے اجتناب کرنا ہر شخص سے مطلوب ہے، بالخصوص اس شخص سے جس نے اپنے کو خلق خدا کی اقتداء کے لئے پیش کیا ہے، اس قسم کے افعال سے اس شخص کا اجتناب کرنا سخت ترین ضروریات میں سے ہے کیونکہ اس کے پیرو اس کے اعمال کی اقتدا کریں گے، اور بلائیں گرفتار ہوں گے"۔

(مکتوب ۲۹/۱ بنام شیخ نظام تھانیسری)

سنّت کی ترویج اور بدعتِ حسنہ کی تردید

کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ و رسول نے دین میں شامل نہیں کیا اور اس کا حکم نہیں دیا، دین میں شامل کر لینا، اس کا ایک جزء بنا دینا، اس کو ثواب اور

تقرب الی اللہ کے لئے کرنا، اور اس کے خود ساختہ شرائط و آداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی حکم کی پابندی کی جاتی ہے، بدعت ہے، بدعت درحقیقت دین الٰہی کے اندر شریعت انسانی کی تشکیل ہے، اس شریعت کی الگ فقہ ہے اور مستقل فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات، جو بعض اوقات شریعت الٰہی کے متوازی اور بعض اوقات تعداد اور اہمیت میں اس سے بڑھ جاتے ہیں، بدعت اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی، جس کا تعیّن ہونا تھا، اس کا تعیّن ہو گیا، اور جس کو فرض و واجب بننا تھا، وہ فرض و واجب بنایا جا چکا، دین کی ٹکسال بند کر دی گئی، اب جو نیا سکّہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ جعلی ہوگا، امام مالک نے خوب فرمایا:۔

من ابتدع فی الاسلام بدعة يراها حسنة فقد زعم ان محمداً صلی الله علیه وسلم خان الرسالة، فان الله سبحانه يقول "الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ" فما لم يكن يومئذٍ ديناً فلا يكون اليوم ديناً۔

جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کر دی اور اس کو وہ اچھا سمجھتا ہے، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) پیغام پہونچانے میں خیانت کی، اس لئے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، پس جو بات عہدِ رسالت میں دین نہیں تھی، وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔

شریعت منزّل من اللہ کی خصوصیت اس کی سہولت اور اس کا ہر ایک کے لئے ہر زمانہ میں قابل عمل ہونا ہے اس لئے کہ جو دین کا شارع ہے، وہ انسان کا خالق بھی ہے، وہ انسان کی ضروریات

اس کی فطرت اور اس کی طاقت و کمزوری سے واقف ہے۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ، وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (سورۃ الملک-۱۴)	(اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بیں (اور) پورا باخبر ہے۔

اس لئے تشریع الٰہی اور شریعت سماوی میں ان سب چیزوں کی رعایت ہے، مگر جب انسان خود شارع بن جائے گا تو اس کا لحاظ نہیں رکھ سکتا، بدعات کی آمیزشوں اور وقتاً فوقتاً اضافوں کے بعد دین اس قدر دشوار، پیچدار اور طویل ہوجاتا ہے کہ لوگ مجبور ہوکر ایسے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں، اور "مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ" (خدا نے تمہارے لئے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی) کی نعمت سلب کرلی جاتی ہے، اس کا نمونہ عبادات و رسوم اور فرائض و واجبات کی اس طویل فہرست میں دیکھا جاسکتا ہے، جس میں بدعت کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کا موقع ملا ہے۔

دین و شریعت کی ایک خصوصیت ان کی عالمگیر یکسانی ہے، وہ ہر زمانہ اور ہر دور میں ایک ہی رہتے ہیں، دنیا کے کسی حصہ کا کوئی مسلمان باشندہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کو دین و شریعت پر عمل کرنے میں نہ کوئی دقت پیش آئیگی، نہ کسی مقامی ہدایت نامہ اور رہبر کی ضرورت ہوگی، اس کے برخلاف بدعات میں یکسانی اور وحدت نہیں پائی جاتی، وہ ہر جگہ کے مقامی سانچہ اور ملکی یا شہری ٹکسال سے ڈھل کر نکلتی ہیں، وہ خاص تاریخی اور مقامی اسباب اور شخصی وانفرادی مصالح واغراض کا نتیجہ ہوتی ہیں، اس لئے ہر ملک بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض اوقات ایک ایک صوبہ اور ایک ایک شہر کے بدعات اور پھر محلوں اور گھروں کی دینی ایجادیں انہی کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، اور اس طرح شہر شہر اور گھر گھر کا دین مختلف ہوسکتا ہے۔

انہی ابدی و عالمی مصالح کی بنا پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بدعت سے

بچنے اور سنت کی حفاظت کی تاکید بلیغ فرمائی، آپ نے فرمایا:-

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد۔	جو ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں داخل نہیں تھی تو وہ بات مسترد ہے۔
ایاکم والبدعة فان کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار۔	بدعت سے ہمیشہ بچو! اس لئے کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی۔

اور یہ حکیمانہ پیش گوئی بھی فرمائی:-

ما احدث قوم بدعة الا رفع بها مثلها من السنة۔	جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں تو اس کے بقدر کوئی سنت ضرور اٹھ جاتی ہے۔

صحابۂ کرام اور ان کے بعد ائمہ و فقہائے اسلام اور اپنے اپنے وقت کے مجددین و مصلحین اور علماء ربانی نے ہمیشہ اپنے اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے مخالفت کی اور اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول و رواج پذیر ہونے سے روکنے کی اپنے مقدور بھر کوشش کی، ان بدعات میں عوام و خوش عقیدہ لوگوں کے لئے جو مقناطیسی کشش ہر زمانہ میں رہی ہے، اور ان سے ان پیشہ ور دنیا دار مذہبی گروہوں اور افراد کے جو ذاتی مفادات وابستہ رہے ہیں ان کی تصویر اللہ تعالے نے قرآن مجید کی اس معجزانہ آیت میں کھینچی ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (سورۂ توبہ-۳۴)	اے ایمان والو! اکثر احبار اور رہبان لوگوں کے مال ناشروع طریقہ سے کھاتے ہیں، اور اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں۔

اس کی بنا پر ان کو سخت مخالفتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انھوں نے اس کی پرواہ

نہیں کی، اور اس کو اپنے وقت کا جہاد اور شریعت کی حفاظت کا اور دین کو تحریف سے بچانے کا مقدس کام سمجھا، ان مخالفین بدعت اور حاملین لواءِ سنت کو اپنے زمانہ کے عوام یا خواص کالعوام سے "جامد" "روایت پرست" "مذہب دشمن" وغیرہ کے خطابات ملے، لیکن انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی، ان کے اس لسانی و قلمی جہاد احقاقِ حق اور ابطالِ باطل سے بہت سی بدعات کا اس طرح خاتمہ ہوا کہ ان کا تمدن کی بعض تاریخوں ہی میں ذکر رہ گیا ہے، اور جو باقی ہیں، ان کے خلاف علمائے حقانی اب بھی صف آرا ہیں:۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا	ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات
اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ	کا اللہ سے عہد کیا تھا، اس میں سچے نکلے، پھر بعضے تو ان میں
مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا	وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق
(سورۂ احزاب - ۲۳)	ہیں، اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑا مغالطہ بدعت حسنہ کا مغالطہ تھا، لوگوں نے بدعت کی دو قسمیں بنا رکھی تھیں، بدعت سیئہ، اور بدعت حسنہ، وہ کہتے تھے کہ ہر بدعت سیئہ نہیں ہوتی، بہت سی بدعات، بدعات حسنہ ہیں، جو حدیث کے اطلاق "کل بدعة ضلالة" سے مستثنیٰ ہیں۔[1]

حضرت مجدد صاحب نے اس تقسیم اور بدعت حسنہ کے خلاف جس زور سے علم جہاد بلند کیا اور

[1] ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمرؓ کا قول ہے جو انھوں نے جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے والوں کو دیکھ کر فرمایا تھا "نعمت البدعة هذه" (یہ بڑی اچھی بدعت ہے) حالانکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہاں محض لغوی حیثیت سے اس کو بدعت کہا گیا ہے، ورنہ تراویح کا پڑھنا احادیث صحیحہ سے ثابت اور متواتر ہے، بدعت کی تعریف کے لئے امام شاطبی کی کتاب "الاعتصام بالسنة" اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی کتاب "ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح" جو اس موضوع پر بہترین کتاب ہے، مطالعہ کرنی چاہئے۔

جس اعتماد و قوت اور علمی استدلال کے ساتھ اس کا انکار کیا اس کی نظیر دور تک اور دیر تک نہیں ملتی، اس سلسلہ میں مکتوبات کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

سنن نبویہ کی ترویج و اشاعت کی تحریض اور بدعات کے انسداد کی ترغیب دیتے ہوئے اپنے مخدوم زادہ خواجہ محمد عبداللہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ وہ وقت ہے کہ حضرت خیر البشر علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰة والسلام کی بعثت پر ہزار سال گزر چکے ہیں، اور علامات قیامت ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہیں، عہد نبوت کے بُعد کی وجہ سے سنت مستور اور چونکہ زمانہ کذب و دروغ کا ہے، بدعت رائج و مقبول ہو رہی ہے، کسی شہباز کی ضرورت ہے، جو سنت کی نصرت و حمایت کرے اور بدعت کو پسپا اور مغلوب کرے، بدعت کی ترویج، دین کی تخریب کے مرادف ہے، اور مبتدع کی تعظیم قصر اسلام کو منہدم کرنے کے ہم معنیٰ۔ حدیث میں آتا ہے:۔

من وقر صاحب بدعة فقد اعان	جو کسی بدعت والے کی توقیر کرے گا اس نے
علی هدم الاسلام۔	اسلام کے منہدم کرنے کے کام میں حصہ لیا۔

پورے عزم و ہمت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ سنتوں میں سے کسی سنت کو رواج دیا جائے اور بدعتوں میں سے کسی بدعت کا ازالہ کیا جائے، یہ کام ہر وقت ضروری تھا، لیکن ضعف اسلام کے اس زمانہ میں کہ مراسم اسلام کا قیام، سنت کی ترویج اور بدعت کی تخریب کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے اور بھی ضروری ہے"

اس کے بعد اسی مکتوب میں بدعت میں ـــــ کسی قسم کے حُسن و جمال ہونے اور بدعتِ حسنہ کی تعبیر و اصطلاح کی مخالفت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"گزشتہ لوگوں میں سے بعض نے بدعت میں کچھ حسن دیکھا کہ بدعت کی بعض قسموں کو

انھوں نے مستحسن قرار دیا لیکن اس فقیر کو اس مسئلہ میں ان سے اتفاق نہیں، وہ کسی بھی بدعت کو حسنہ نہیں سمجھتا اور اس میں اس کو سوائے ظلمت وکدورت کے کچھ اور محسوس نہیں ہوتا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

"کل بدعۃ ضلالۃ"[1] ہر بدعت گمراہی ہے۔

ایک دوسرے مکتوب میں جو عربی میں میر محب اللہ کے نام ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں نے کہاں سے کسی ایسے کام میں حسن ہونے کا فیصلہ کیا جو اسلام کے دین کامل اور خدا کے پسندیدہ ومقبول مذہب میں اتمام نعمت کے بعد ایجاد کیا گیا ہو، کیا ان کو یہ موٹی بات معلوم نہیں کہ اتمام واکمال اور قبولیت کے بعد کسی دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی جائے تو اس میں حسن نہیں ہو سکتا "فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ" (حق کے بعد صرف ضلال ہی کا درجہ رہ جاتا ہے)۔ اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ دین کامل میں کسی نو پیدا شدہ چیز کے حسن کا فیصلہ کرنا اس کے عدم کمال کو مستلزم ہے اور اس بات کا اعلان کہ نعمت ابھی تام نہیں ہوئی تو وہ کبھی اس کی جرأت نہ کرتے۔"[2]

ایک دوسرے مکتوب میں اسی استثنا پر کلام کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب (دین میں) ہر نو ایجاد چیز بدعت ہوگی اور ہر بدعت ضلالت تو کسی بدعت میں حسن پائے جانے کا کیا مطلب؟ اور جب احادیث سے صاف طریقہ پر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ہر بدعت رافع سنت ہوتی ہے اور اس میں کوئی تخصیص نہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہر بدعت سیئہ ہے، حدیث میں آیا ہے:۔

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلھا من السنۃ فتمسک بسنۃ خیر من احداث بدعۃ۔

جب کوئی قوم کوئی بدعت نکالتی ہے تو اسی کے بقدر سنت اٹھالی جاتی ہے پس سنت سے وابستگی بدعت کی ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

[1] مکتوب ۲۳ / ۲ بنام مخدوم زادہ خواجہ محمد عبداللہ۔ [2] مکتوب ۱۹ / ۲ بنام میر محب اللہ۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ما ابتدع قوم بدعۃ فی دینھم الا نزع اللہ من سنتھم مثلھا، ثم لا یعیدھا الیھم الی یوم القیامۃ۔

جب بھی کوئی قوم اپنے دین میں کوئی بدعت پیدا کرے گی تو ضرور اللہ تعالے ان سنتوں میں سے جن پر وہ عمل پیرا ہیں کوئی سنت ضرور سلب کرے گا پھر قیامت تک وہ ان کو واپس نہ دے گا۔

جاننا چاہئے کہ بعض بدعتیں جن کو علماء ومشائخ نے حسنہ سمجھا ہے، جب ان پر اچھی طرح سے غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی رافع سنت ہیں۔"[1]

اسی مکتوب میں بدعت حسنہ کے وجود کا بالکل انکار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"لوگوں نے کہا ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں، بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ، اس نیک عمل کو بدعت حسنہ کہتے ہیں، جو عہد رسالت اور خلفائے راشدین کے زمانہ کے بعد پیدا ہوا ہو اور اس سے کوئی سنت نہ اٹھتی ہو، اور بدعت سیئہ وہ ہے، جو رافع سنت ہو، اس فقیر کو ان بدعات میں سے کسی بدعت میں حسن ونورانیت نظر نہیں آتی، اور اس میں سوائے ظلمت وکدورت کے کچھ محسوس نہیں ہوتا، فرض بھی کر لیا جائے کہ آج کسی عمل مبتدع میں ضعف بصارت کی وجہ سے تازگی اور صفائی نظر آتی ہے تو کل جب نظر تیز اور دور بیں ہوگی تو خسارہ کے احساس اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت

کہ باکہ باختۂ عشق در شب دیجور

سید البشر صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

[1] مکتوب ۱۸۶ / ۱ بنام خواجہ عبدالرحمن مفتی کابلی۔

من احدث فی امرنا ھذا مالیس — جو ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز پیدا کرے گا
منہ فھو ردٌ۔[1] — جو اس کے اصل میں نہیں ہے تو وہ رد ہے (مقبول نہیں)

ان بدعات حسنہ میں جو اس زمانہ میں رواج پذیر ہو رہی تھیں، ایک محفل میلاد بھی تھی، اس کے مقصد اور عالی انتساب کی وجہ سے اس کا بدعت کہنا اور اس کی مخالفت بڑا نازک اور دشوار کام تھا، اور اس سے عوام میں غلط فہمی پیدا ہونے اور اس کو بے ادبی اور محبت کی کمی پر محمول کرنے کا خطرہ تھا، لیکن حضرت مجددؒ نے جن کو اس بارے میں کامل شرحِ صدر حاصل تھا کہ جس چیز کا ثبوت خیر القرون میں نہیں ہے اس میں دین کی ترقی اور امت کی فلاح نہیں ہے، اور اس میں مرورِ زمانہ کے ساتھ مختلف مفاسد کا اندیشہ ہے آپ سے استفسار کیا گیا کہ اگر محفل میلاد محظورات سے خالی ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟ جواب میں ارشاد ہوا:۔

"مخدوما! اس فقیر کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ جب تک کہ اس کا دروازہ مطلقاً نہ بند کر دیا جائے گا، اہل ہوس اس سے باز نہیں رہیں گے، اگر ذرا بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا جائے گا تو رفتہ رفتہ بات کہیں سے کہیں پہونچ جائے گی "قلیلہ یُفضی الی کثیرہ"[2]

اس طرح حضرت مجدد کے اس مبصرانہ و جرأتمندانہ اقدام (بدعات کی عمومی مخالفت اور بدعت حسنہ کے وجود سے اختلاف) سے ایک بڑے خطرہ کا انسداد اور ایک بڑے دینی انتشار کا سدباب ہو گیا، جو غیر محقق علماء کی تائید، خانقاہوں کی سرپرستی اور خوش اعتقاد امراء و رؤساء کی دلچسپی اور حمایت کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں پھیلتا جا رہا تھا، فجزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء۔

---

[1] مکتوب ۱۸۶ بنام خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کابلی۔ [2] مکتوب ۲/۴۲ بنام خواجہ حسام الدین۔

بابِ ششم

وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود؟

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور مسئلۂ وحدۃ الوجود کی تفصیل و تدوین

متقدمین صوفیاء کی زبان سے جو مغلوب الاحوال ہوتے تھے "اتحاد نما" اقوال جو وحدۃ الوجود پر دلالت کرتے ہیں، صادر ہوئے ہیں، ان میں مشہور شیخ و عارف حضرت بایزید بسطامی کا (جو اکثر سلاسل طریقت کے مشائخ کبار میں ہیں) قول "سبحانی ما اعظم شانی" اور "لیس فی جبتی الا اللہ" اور حسین بن منصور حلاج کا نعرۂ أنا الحق خاص طور پر مشہور ہے۔

لیکن شیخ محی الدین بن عربی (م ۶۳۸ھ) جو شیخ اکبر کے نام سے شہرۂ آفاق ہیں، اس ذوق اور مسلک کے مجدد و خاتم اور علمی طور پر بانی و مؤسس ہیں، اور انھیں کے زمانے سے اس کی شہرت و مقبولیت اس درجہ کو پہونچی کہ وہ اہل تصوف میں موسمی اثر کی طرح سرایت کر گئی جس سے قوی مزاج بھی کلّی طور پر محفوظ نہیں رہتا، یہاں تک کہ وہ اہلِ ذوق و تحقیق کا شعار اور ان کا "کلمۂ جامعہ" بن گیا، اور اس کا انکار کرنا اپنی جہالت کا ثبوت دینا یا بزم تصوف میں نامحرم و طفیلی ہونے کا اعلان کرنا تھا، بقول حضرت مجدد:۔

"انھوں نے اس کے اس طرح ابواب و فصول مقرر کئے جس طرح علم نحو و صرف

ہیں دستور ہے[1]" شیخ اکبر کے نزدیک وحدۃ الوجود کی حقیقت کیا ہے، وہ اس کو کس طرح پیش کرتے ہیں، اس پر کیا دلائل قائم کرتے ہیں، اور اس کو کس طرح ایک بدیہی حقیقت، ایک عملی تجربہ اور کشف و مشاہدہ کا معاملہ بنا دیتے ہیں، پھر اس نے کس طرح ایک مستقل فلسفہ اور "مدرسہ" کی حیثیت اختیار کر لی، اور اس پر اتنا بڑا کتب خانہ تیار ہو گیا، جس کا اجمالی جائزہ لینے کے لئے بھی ایک ضخیم دفتر درکار ہے، پیش نظر کتاب میں اس کا ضمنی و اجمالی تذکرہ بھی مشکل ہے، یہ مسئلہ چونکہ فلسفہ اور تصوف دونوں کا دقیق ترین مسئلہ ہے، جس کے لئے فلسفہ اور تصوف کی دقیق اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے، اور اس کا باطنی تجربات اور علمی سیر و سلوک سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لئے اس مختصر باب میں اس کا احاطہ مشکل ہے، قارئین میں سے جن حضرات کو اس کو علمی طور پر سمجھنے کا ذوق ہو وہ شیخ اکبر کی مشہور تصانیف "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" کی طرف رجوع کریں[2]، حضرت مجدد صاحب نے وحدۃ الشہود کے اثبات میں طویل مکتوبات تحریر فرمائے ہیں، ان میں شیخ اکبر کے مسلک کو جس طرح پیش کیا ہے، اور اس کی جو تلخیص و ترجمانی فرمائی ہے، ان سے بھی اس مسلک، اور اس کے مقصود و مراد کے سمجھنے میں مدد ملے گی، ان کے ضروری اقتباسات اس مضمون میں اپنی جگہ پر آئیں گے۔

ہم یہاں پر علامہ عبد العلی بحر العلوم لکھنوی (م ۔ ۱۲۲۵ھ) کے رسالہ وحدۃ الوجود کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، مصنف علوم حکمت و اصول کے بحر زخار ہونے کے ساتھ شیخ اکبر کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے شارح و ترجمان ہیں، اور ان کی تصنیفات بالخصوص "فتوحات مکیہ"

---

[1] مکتوب ۸۹/۲ بنام قاضی اسمٰعیل فرید آبادی۔ [2] اس سلسلہ میں سید شاہ عبد القادر مہربان فخری میلاپوری (م ۱۲۰۴ھ) کی کتاب "اصل الاصول فی بیان مطابقۃ الکشف بالمعقول والمنقول" (مطبوعہ مدراس یونیورسٹی ۱۹۵۹ء) کا مطالعہ بھی مفید ہوگا، جو اس موضوع پر بڑی جامع کتاب ہے۔

اور "فصوص الحکم" کے غواص و شناور، ان اقتباسات سے کسی قدر شیخ اکبر کے منشا و مراد کے سمجھنے میں مدد ملے گی، اگرچہ ان میں بھی ایسے متعدد اصطلاحات اور تعبیرات آئی ہیں، جن سے اہل فن اور وہی حضرات واقف ہیں جو اس سلسلہ کے عارفین کی زبان و طرز بیان سے مانوس ہیں، اس سے مختصر و واضح ترجمانی ہم کو نہیں مل سکی، اس لئے اس سے مدد لی گئی:۔

"اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے، وہ عالم شیونات و تعینات ہے، تمام شیونات و تعینات اس کے مظاہر ہیں، اور وہ ان میں ظاہر اور ساری ہے، اس کی سرایت وہ نہیں جس کے حلولی قائل ہیں یا جس کا بیان اتحادی کرتے ہیں، بلکہ یہ سریان مثل اس سریان کے ہے، جو گنتی کے اعداد میں ایک کی ہے، گنتی کے تمام اعداد بجز اکائیوں کے اور کچھ نہیں، عالم میں ایک ہی عین یعنی ایک ہی ذات کا ظہور ہے، کثرت میں وہی ظاہر ہے، اپنی ذات سے کثرت کا وجود نہیں ہے، اللہ کی پاک ذات کے وجود سے اس کا ظہور ہوا ہے، اللہ ہی کی ذات اس کثرت میں ظاہر ہے، اللہ ہی اول ہے، اللہ آخر ہے، اللہ ہی ظاہر ہے، اللہ ہی باطن ہے، اللہ ان کے شریک بنانے سے پاک ہے۔"

"اللہ تعالیٰ کے نام بغیر کسی مظہر کے ظاہر نہیں ہوتے، وہ مبارک نام چاہے تنزیہی ہوں چاہے تشبیہی، اب جب کہ اسماء مظاہر پر موقوف ہوئے اور بغیر مظاہر کے ان کا کمال متصوّر ہی نہیں ہو سکتا، تو اللہ تعالیٰ نے اعیانِ عالم کو موجود کیا، تاکہ وہ اعیان اس کے مظاہر ہوں اور اس کے اسماء کا کمال پوری طرح ظاہر ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے ذاتی کمال میں قطعاً غنی ہے، لیکن اسمائی کمال کے مرتبہ میں عالم کے وجودِ خارجی سے غنی نہیں ہے۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں:۔

پرتوِ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد ۔۔۔ ما بدُو محتاج بودیم اُو بہ ما مشتاق بود

یعنی اگر معشوق کا سایہ اور پرتو عاشق پر پڑ گیا تو کیا بات ہوئی ہم اس کے محتاج تھے، اور
وہ ہمارا مشتاق تھا، یہ بیان اس حدیث قدسی سے ثابت ہے "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت
ان اعرف فخلقت الخلق" میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچان لیا جاؤں لہذا
خلق کو میں نے پیدا کیا تاکہ میرا ظہور ہو اور مخلوقات مظہر ہو میرا اور میرے اسماء کا۔"

"جو دو وجود کا قائل ہوا کہ ایک اللہ کا وجود ہے اور ایک ممکن کا تو وہ شرک کر رہا ہے اور
اس کا یہ شرک، شرک خفی ہے، اور جو شخص صرف ایک وجود کا قائل ہوا، اور اس نے کہا کہ وجود
صرف اللہ ہی کا ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ اس کے مظاہر ہیں اور مظاہر کی کثرت اس کی
وحدت کے منافی نہیں تو یہ شخص موحّد ہے۔"

"تم حق کے عین نہیں ہو کیونکہ حق تعالےٰ وجود مطلق ہے اور تم مقید اور متعین ہو اور متعین
کسی طرح بھی عین مطلق نہیں ہو سکتا، ہاں تم اپنی حقیقت سے عین حق ہو، حق تعالےٰ تم میں
متعین ہوا ہے، تم اللہ کو عین موجودات میں تعین کی قید سے آزاد اور تعین کی قید سے مقید
پا رہے ہو یعنی اللہ تعالےٰ کو متعین میں ظاہر دیکھ رہے ہو، "لاموجود ولا الٰہ الا اللہ"
اللہ کے سوا نہ کوئی موجود ہے، اور نہ کوئی معبود ہے[1]۔"

اس مسئلہ کا اثر شیخ اکبر کے زمانہ کے بعد اتنا ہمہ گیر بلکہ عالمگیر تھا کہ کہا جا سکتا ہے کہ
صوفیاء فلاسفہ اور شعراء میں نوے ۹۰ فیصد اس مسئلہ کے قائل یا اس سے مرعوب ہو کر اس کے
ہمنوا بن گئے ہیں، شیخ سے اختلاف کرنے والے زیادہ تر محدثین، فقہاء اور وہ علماء ہیں جن کو
علمائے ظاہر کہا جاتا ہے، ان میں حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ سخاوی، ابو حیان مفسر،

[1] رسالہ "وحدۃ الوجود" تالیف بحر العلوم علامہ عبد العلی انصاری لکھنوی، مترجمہ مولانا شاہ زید ابو الحسن فاروقی
مجددی شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ص ۲۹-۵۶

شیخ الاسلام عز الدین ابن عبد السلام، حافظ ابوزرعہ، شیخ الاسلام سراج الدین البلقینی، ملا علی قاری
علامہ سعد الدین تفتازانی، جیسے نامور علماء اور ائمہ فن تھے۔

یہ حضرات اگرچہ اپنے علم وفضل، کتاب وسنت پر وسیع اور گہری نظر اور علوم دینیہ میں
تبحر کے لحاظ سے بہت فائق تھے، لیکن ایک دو کو مستثنیٰ کر کے اہل تصوف وحقائق کو ان میں
سے کسی کا حقائق وعلوم باطنی کا رمز آشنا ہونا تسلیم نہیں، اس لئے ان کی مخالفت کو "الناس
اعداء ما جھلوا" (لوگ جس کو جانتے نہیں اس کے دشمن ہو جاتے ہیں) کے عام اصول پر
محمول کیا گیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور عقیدۂ وحدۃ الوجود کی مخالفت وتنقید

مسئلہ وحدۃ الوجود کی مخالفت کے سب سے بڑے علمبردار اور اس پر کتاب وسنت کی
بنیاد پر اور ان اثرات ونتائج کی روشنی میں جو قریبی عرصہ میں اس مسئلہ وتحقیق کے اختیار کرنے کی
وجہ سے تصوف کے حلقہ میں اور عوام میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے، تنقید وتبصرہ اور اس کا
تحلیل وتجزیہ کرنے میں شیخ الاسلام تقی الدین حافظ ابن تیمیہؒ (۶۶۱-۷۲۸ھ) کا نام سب سے
زیادہ روشن ہے، وہ شیخ اکبر کی وفات (۶۳۸ھ) سے تئیس سال بعد پیدا ہوئے، شیخ اکبر کی
وفات جس شہر (دمشق) میں ہوئی اور جس کو ان کی آخری آرامگاہ اور مدفن بننے کا شرف
حاصل ہوا، وہیں امام ابن تیمیہؒ نے ہوش سنبھالا، تعلیم وتربیت حاصل کی اور یگانہ علمی و
ذہنی کمالات کو پہونچے، ان کا شعور جب بالغ ہوا اور وہ جب ماحول پر ناقدانہ نظر ڈالنے
کے قابل ہوئے تو شیخ اکبر کی وفات کو ۴۰-۴۵ سال سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، مصر و
شام کی فضا ان کی علمی نادر تحقیقات کے شور سے گونج رہی تھی، اور علم ومعرفت کے خمخانے

ان کے ذوق توحید سے مخمور تھے، مصر میں شیخ ابو الفتح نصر المنبجی، شیخ اکبر کے غالی معتقدین میں تھے اور سلطنت کا مدار المہام اور سیاہ وسفید کا مالک رکن الدین بیبرس الجاشنگیر، شیخ نصر المنبجی کا معتقد و مرید تھا، شام میں اور اسی طرح بیشتر عرب ممالک میں شیخ کی کتابیں خصوصاً "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" عام طور پر متداول تھیں، اور لوگ ان کو پڑھ پڑھ کر سر دھنتے تھے، خود امام ابن تیمیہؒ نے اعتراف کیا ہے کہ "فتوحات مکیہ" "کنہ المحکم المربوط" "الدُّرّۃ الفاخرۃ" "مطالع النجوم" وغیرہ میں بڑے اچھے علمی فوائد و نکات ملتے ہیں، شیخ اکبر کے مسلک کے حاملین میں ابن سبعین، صدر الدین قونوی، (جو شیخ اکبر کے براہ راست شاگرد تھے) بلیانی اور تلمسانی خاص طور پر شہرۂ آفاق تھے، امام ابن تیمیہؒ نے اس پوری جماعت میں شیخ اکبر کو ان سب پر ترجیح دی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انصاف و تحقیق کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اور "اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ" پر عمل کیا ہے، وہ کہتے ہیں:-

"ابن عربی ان لوگوں میں اسلام سے قریب ترہیں اور ان کا کلام بہت سے مقامات پر نسبتاً بہتر ہے اس لئے کہ وہ مظاہر...... اور ظاہر میں فرق کرتے ہیں، امر و نہی اور شرائع و احکام کو اپنی جگہ رکھتے ہیں، مشائخ نے جن اخلاق و عبادات کی تاکید کی ہے، ان کے اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اس لئے بہت سے عابد و صوفی ان کے کلام سے سلوک کو اخذ کرتے ہیں، اگرچہ وہ ان کے حقائق کو اچھی طرح نہیں سمجھتے، ان میں سے جو ان حقائق کو سمجھ لیتے ہیں، اور ان کی موافقت کرتے ہیں، ان پر ان کے کلام کی حقیقت منکشف ہوجاتی ہے[1]۔"

دوسری جگہ ایک بلند مرتبہ مسلمان سے حسن ظن اور اپنے حکم لگانے کی نازک ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

[1] مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر المنبجی مندرجہ "جلاء العینین" ص ۵۷

"اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ ان کا خاتمہ کس چیز پر ہوا، اللہ تعالیٰ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں زندہ و مردہ کی مغفرت فرمائے "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" (ہمارے پروردگار ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ چلے گئے اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کی طرف سے کھوٹ نہ رکھ اے ہمارے پروردگار تو بہت شفقت والا مہربان ہے[1])۔"

عقیدۂ وحدۃ الوجود کے غالی مبلغ و داعی اور ان کے اثرات و نتائج

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحقیق کے خاص مزاج و مذاق، اس کی عمومی تبلیغ و اشاعت اور اس کی تعلیم و تلقین میں زیادہ جوش سے کام لینے اور احتیاط ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے خود شام میں جو علوم دینیہ کا بڑا مرکز اور مصر کی مسلم ترکی النسل حکومت کا ایک اہم صوبہ تھا، ایک طرح کا ذہنی و اخلاقی انتشار پیدا ہونے لگا تھا، لوگ شریعت، عقل اور اخلاق کے حدود پھلانگنے لگے تھے، اور ایک بحرانی کیفیت اسلامی معاشرہ میں رونما تھی، ایک حکیم کے قول کے مطابق "درخت اپنی جڑ سے نہیں اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" عقیدۂ وحدۃ الوجود کا درخت جس طرح کے برگ و بار لانے لگا تھا، وہ ایک حامی شریعت اور غیور عالم و داعی کے لئے باعث تشویش اور موجب نقد تھے۔

امام ابن تیمیہؒ ناقل ہیں (اور وہ نقول میں عام طور پر محتاط ہیں) کہ تلمسانی (جو اس معرفت کے علم میں سب سے بڑھے ہوئے تھے) مسلک وحدۃ الوجود کے صرف قائل ہی نہیں بلکہ اس پر عامل بھی تھے، شراب پیتے تھے، اور محرمات کا ارتکاب کرتے تھے (کہ جب موجود

[1] ایضاً

ایک ہے تو حلال و حرام کی تفریق کیسی؟) امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:۔

"مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا کہ وہ تلمسانی سے فصوص الحکم کا درس لیتے تھے اور اس کو اولیاء اللہ اور عارفین کا کلام سمجھتے تھے، جب انھوں نے فصوص کو پڑھا اور دیکھا کہ اس کے مضامین تو قرآن شریف کے صریح مخالف ہیں تو انھوں نے تلمسانی سے کہا کہ یہ کلام تو قرآن کے خلاف ہے تو اس نے جواب دیا کہ قرآن تو سارا شرک سے بھرا ہوا ہے، اس لئے کہ وہ رب و عبد کے درمیان فرق کرتا ہے، توحید تو ہمارے کلام میں ہے، اس کا یہ بھی مقولہ ہے کہ کشف کے ذریعہ وہ ثابت ہوا ہے، جو صریح عقل کے خلاف ہے[1]۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"ایک شخص نے جو تلمسانی اور اس کے ہم خیال کے ساتھ تھا، مجھے خود سنایا کہ ہمارا گذر ایک مردہ کتے کے پاس سے ہوا جس کو خارش تھی، تلمسانی کے رفیق نے کہا کہ یہ بھی ذاتِ خداوندی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کیا کوئی چیز اس کی ذات سے خارج ہے، ہاں سب کے سب اسی کی ذات کے اندر ہیں[2]۔"

وہ اپنی دوسری کتاب "الرد الأقوم علی فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں:۔

"بعض لوگوں سے کہا گیا کہ جب وجود ایک ہے تو بیوی کیوں حلال اور ماں حرام ہے؟ اس محقق نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک سب ایک ہیں، لیکن ان محجوبین نے (جو توحید حقیقی سے نا آشنا ہیں) کہا کہ ماں حرام ہے، ہم نے بھی کہا کہ ہاں تم (محجوبین) پر حرام ہے[3]۔"

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان بیباکانہ اقوال اور اباحیت و فوضویت (اخلاقی انارکی)

۱؎ الفرقان بین الحق والباطل ص ۱۴۵ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ص ۴۲

کی ذمہ داری شیخ اکبر جیسے عارف و محقق پر یا ان کی کتابوں پر عاید ہوتی ہے، جو بغایت درجہ متبع سنت[1]، عابد و زاہد، مرتاض و مجاہد اور نفس سے شدید محاسبہ کرنے والے، مکاید شیطان اور غوائل نفس سے بدرجۂ تمام واقف تھے[2]، لیکن ان کے یہاں اس طرح کے عجیب اور وحشی اقوال ملتے ہیں، جن سے رائی کا پربت بنا لینے والوں کو مسالہ ہاتھ آتا ہے، مثلاً یہ کہ "عہد موسوی کے گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی، موسیٰؑ نے ہارونؑ کو جو ٹوکا تھا، تو اس بات پر کہ انھوں نے گوسالہ پرستی کی (جو دراصل خدا پرستی تھی اس لئے کہ موجود تو ایک ہی ہے) مخالفت کیوں کی؟ ان کے نزدیک موسیٰؑ ان عارفین میں سے تھے، جو ہر چیز میں حق کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس کو ہر چیز کا عین سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برسرِ حق تھا کہ "أنا ربکم الأعلی" بلکہ وہ عین تھا، فرعون کو چونکہ تکوینی طور پر منصب حکومت حاصل تھا، اور وہ صاحب حق تھا، تو اس نے بجا طور پر "أنا ربکم الأعلی" کہا، اس لئے کہ جب سب کسی نہ کسی نسبت میں رب ہیں تو میں ان میں سب سے اعلیٰ ہوں، کیوں کہ مجھے ظاہر میں تم پر حکومت کرنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جادوگروں کو جب فرعون کی صداقت کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی مخالفت نہیں کی، بلکہ اس کا اعتراف کیا اور کہا کہ "إقض ما أنت قاض إنما تقضي هذه الحياة الدنيا" (جو تمہیں فیصلہ کرنا ہو کرو تم اس دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتے ہو) اس لئے فرعون کا یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ "أنا ربکم الأعلی" وہ حضرت نوحؑ پر تنقید کرتے ہیں، اور ان کی کافر قوم کی تصویب و تعظیم، جنھوں نے پتھروں کی پرستش کی، وہ کہتے ہیں کہ ان بت پرستوں نے درحقیقت اللہ ہی کی

۱؎ شیخ اکبر امام داؤد ظاہری کے مذہب ظاہری کے پیرو تھے، جو قیاس کے قائل نہیں اور ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ ۲؎ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ان کا رسالہ "روح القدس"۔

عبادت کی تھی، اور طوفان نوحؑ دراصل معرفتِ الٰہی کی طغیانی اور اس کے سمندر کا جوش تھا جس میں وہ غرق ہوئے[1]۔

اسی بنا پر بہت سے ایسے مشائخ وعارفین جو شیخ اکبر کے علوم مرتبہ کے قائل تھے، اور ان کو مقبولین میں سمجھتے تھے، وہ اپنے اہل تعلق کو ان کی کتابوں کے عام مطالعہ سے سختی سے منع کرتے تھے، شیخ محی الدین عبدالقادر عیدروسی مصنف "النور السافر" اپنے شیخ علامہ بحرق سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے مرشد شیخ وقت شیخ ابوبکر عیدروسی نے بیان کیا کہ مجھے یاد نہیں کہ میرے والد (شیخ عبداللہ ابن ابی بکر حضرمی) نے مجھے کبھی مارا یا جھڑکا ہو، یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے میرے ہاتھ میں شیخ اکبر کی "فتوحات مکیہ" کا ایک جز دیکھا، ان کو سخت غصہ آیا، میں نے اس دن سے ان کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا، وہ کہتے تھے کہ میرے والد شیخ کی دونوں کتابوں، 'فتوحات' اور 'فصوص' کے مطالعہ سے شدت سے منع کرتے تھے، لیکن اسی کے ساتھ شیخ سے حسن ظن رکھنے کی تاکید بھی کرتے تھے، اور اس کا عقیدہ رکھنے کی ہدایت کرتے تھے کہ وہ اکابر اولیاء اللہ اور کبار عارفین میں تھے[2]۔

عقیدۂ وحدۃ الوجود ہندوستان میں

آٹھویں صدی میں جب یہ عقیدہ ہندوستان آیا تو اس وجہ سے کہ ہندوستان خود

[1] شیخ اکبر کے یہ سب اقوال "الرد الأقوم علی ما فی کتاب فصوص الحکم" اور "الفرقان بین الحق والباطل" سے ماخوذ ہیں، اور امام نے ان کو "فصوص الحکم" سے اقتباس کرکے لکھا ہے، یہاں اس بات کا بھی اظہار ضروری ہے کہ شیخ اکبر کے علوم سے اشتغال رکھنے والوں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ شیخ کی کتابوں بالخصوص "فصوص الحکم" میں کثرت سے الحاقات واضافات کئے گئے ہیں۔

[2] النور السافر ص ۳۴۶

اس مسلک و ذوق کا قدیم ترین اور پرجوش ترین قائل وداعی رہ چکا تھا، اور بعض مورخینِ تصوف کے قول کے مطابق متصوفین اسلام نے جو ایران، عراق اور مغرب میں پیدا ہوئے توحیدِ وجودی کا سبق ہندوستان ہی سے لیا تھا، اسلام کی آمد کے بعد بھی بلا کسی انقطاع کے یہ ملک اس مسلک وعقیدہ کا علمبردار "ہمہ اوست" کا قائل ہے، اور آرین نسلوں کے مزاج اور یہاں کے مذاہب اور فلسفوں کی (جو سامی اقوام اور انبیاء کے مرزبوم میں پیدا ہونے والے مذاہب کے برخلاف تعینات وقیود سے گریزاں اور وحدت وجود اور وحدت ادیان کے ہزاروں برس سے قائل ہیں) اطلاق پسندی کی وجہ سے اس مشرب نے اور گہرا اور شوخ رنگ اختیار کرلیا، اور یہاں آکر اس فلسفہ کے مزاج نے مقامی مزاج سے ہم آہنگ وہم آغوش ہوکر ایک نیا جوش اور ایک نیا مکتب خیال پیدا کرلیا، یہاں کے مشائخ میں ایک بڑی تعداد اس مشرب کی حامی و حال اور مبلغ وداعی نظر آتی ہے، ان میں خاص طور پر سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے نامی وگرامی شیخ شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ (م ۹۴۴ھ) شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی (م ۹۴۹ھ) شیخ عبدالعزیز دہلوی معروف بہ شکر بار (م ۹۷۵ھ) شیخ محمد ابن فضل اللہ برہان پوری (م ۱۰۲۹ھ) اور شیخ محب اللہ الہ آبادی (م ۱۰۵۸ھ) میں سے ہر ایک اپنے عہد وعصر کا ابن عربی اور اپنے شہر ومصر کا ابن فارض تھا، ان میں سے اکثر حضرات حضرت مجدد سے کچھ پیشتر یا ان کے زمانہ سے قریب یا متصلاً مسند آرائے تحقیق وارشاد ہوئے۔

شیخ علاء الدولہ سمنانی اور وحدۃ الوجود کی مخالفت

جیسا کہ اوپر کہا گیا مسلک وحدۃ الوجود کی تردید اور شیخ اکبر پر تنقید کرنے والے زیادہ تر علوم ظاہر کے دریا کے غواص اور حقیقت ومعرفت کے کوچہ ریاضت ومجاہدہ کی دنیا اور

معارف وحقائق اور علمی تجربات اور ذوق سے ناآشنا تھے اس لئے اس مشرب کے ذوق آشنا ان کی تنقیدات کو یہ کہہ کر ناقابل اعتناء قرار دے دیتے تھے کہ ۔ ع

لذتِ مے نشناسی بخدا تا نچشی

اور ۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

پہلے محقق اور مسلم صوفی اور عارف جنھوں نے خصوصیت واہتمام کے ساتھ اس مشرب کی تنقید اور تردید کی وہ شیخ رکن الدین ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی ہیں[1]۔

علاء الدولہ السمنانی (۶۵۹-۷۳۶ھ) خراسان میں سمنان کے ایک دولت مند اور مشہور گھرانہ میں پیدا ہوئے جس کے افراد حکومت ووزارت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے انھوں نے شیخ نورالدین عبدالرحمٰن الکسرقی الاسفرائنی سے کبروی سلسلہ میں باطنی استفادہ کیا اور اجازت پائی، شیخ اکبر کے وحدۃ الوجود کے نظریہ کے خلاف انھوں نے مسلسل مناظرات جاری رکھے، اور اپنے خطوط میں بھی جابجا ذکر کیا، ان کے نزدیک سالکِ طریقت کی انتہائی منزل "توحید" نہیں بلکہ "عبودیت" ہے، ان کے ملفوظات ان کے مرید اقبال ابن سالق سیستانی نے مرتب کئے جس کے کئی نسخے "چہل مجلس" یا ملفوظات شیخ علاء الدولہ السمنانی وغیرہ کے ناموں سے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، جامی کے "نفحات الانس" ص۵۰۴-۵۱۵ کا بیشتر حصہ بھی انہی ملفوظات پر مبنی ہے[2]۔

وحدۃ الشہود

ہمارے علم ومطالعہ میں دو نامور شخصیتیں ایسی گذری ہیں، جن کے یہاں وحدۃ الوجود

۱؎ مکتوبات امام ربانی مکتوب ۸۹ دفتر سوم ۲؎ مقالہ F. MEIER مندرجہ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ"۔

کے متوازی وحدۃ الشہود کا ذکر اور اس کی طرف اشارات ملتے ہیں، ان دونوں میں اختلافِ ذوق بلکہ تباین راستوں کے باوجود صرف ایک (حسن نیت، سلامت ذوق اور اخلاص) کی وحدت ہے، جس پر ہدایت کے ابواب کے مفتوح ہونے کا وعدۂ قرآنی "وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" کے الفاظ ہیں، موجود ہے، ایک شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ جو اصلاً محدث متکلم اور فقیہ تھے، دوسرے مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ جو اصلاً عارف ومحقق اور امام تصوف وحقیقت تھے، اول الذکر کی کتاب "العبودیۃ" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وحدۃ الشہود کے کوچہ سے آشنا ہیں، اور اس حقیقت سے واقف ہیں کہ سالکین کو اثنائے سلوک میں یہ مقام پیش آتا ہے، اور وہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے تبعین کاملین صحابۂ کرام وغیرہم کی معرفت سے فروتر لیکن وحدۃ الوجود کے مقام سے بہتر وبلند تر ہے[1]، لیکن چونکہ یہ ان کا اصل میدان نہیں اس لئے وہ صرف اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیکن مخدوم بہاری (م ۷۸۲ھ) نے اپنے مکتوبات میں بڑی خوبی کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کیا ہے، وہ اپنے ذاتی تجربہ اور اس مقام کی تحقیق کی روشنی میں جو ان کو حاصل تھا کہتے ہیں کہ "عام طور پر جس کو وحدۃ الوجود اور غیر حق کا عدم محض اور فنا کامل سمجھا جاتا ہے، وہ دراصل وجود حقیقی کے سامنے دوسرے موجودات کا اس طرح ماند پڑجانا اور مغلوب ہوجانا ہے جس طرح آفتاب کی روشنی کے سامنے تاروں کی روشنی ماند اور ذرات کا وجود بے حقیقت ہوجاتا ہے" وہ دو لفظوں میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں "نابودن دیگر و نادیدن دیگر" کسی چیز کا معدوم ونابود ہوجانا اور چیز ہے، اور نظر نہ آنا اور چیز، اور فرماتے ہیں، یہ ایک ایسا نازک مقام ہے، جہاں اچھے اچھوں کے قدم لڑکھڑا گئے، اور توفیق الٰہی

۱؎ ملاحظہ ہو "رسالۃ العبودیۃ" ص۸۵-۸۸ "واما النوع الثانی فهو الغناء عن شهود السوى" الخ (المکتب الاسلامی، دمشق)

اور خضر کامل کے بغیر جادۂ حقیقت پر قائم رہنا مشکل ہے۔[1]

ایک نئی تجدیدی شخصیت کی ضرورت

لیکن اس مسئلہ کی تنقیح، اس سلسلہ میں اتمام حجت کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو سیر و سلوک کی ان پرخار وادیوں اور ان اعلیٰ منازل سے گذر چکا ہو، دریائے حقیقت کا غواص ہو اور جو ان علمی تجربات کے امواج اور طوفانی سمندر سے گذر کر ساحلِ حقیقت پر پہونچا ہو، وہ عدم علم کو عدم شئی کی دلیل نہ بنائے بلکہ ایک عینی مشاہد اور ایک بلند ہمت و بلند نظر مسافر کی طرح پوری خود اعتمادی کے ساتھ علی وجہ البصیرۃ یہ کہے کہ جہاں تک توحید وجودی کا تعلق ہے ؎

ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہے۔ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

وحدۃ الوجود کے سلسلہ میں اس وقت تک اثبات و نفی کرنے والوں کے تین مسلک رہے ہیں۔

۱۔ وحدۃ الوجود کا مکمل اثبات اور یہ کہ وہ ایک بدیہی حقیقت ہے، اور تحقیق و معرفت کی آخری منزل ہے۔

۲۔ وحدۃ الوجود کا مکمل انکار اور یہ کہ وہ وہم و خیال، قوت متخیلہ کی کارفرمائی اور باطنی مشاہدہ کے سوا کچھ نہیں۔

[1] ملاحظہ ہو مکتوب اول مکتوبات سرصدی اور اس کا اقتباس مندرجہ "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم ص ۲۸۴-۲۸۶

۳۔ وحدۃ الوجود کے متوازی وحدۃ الشہود کا نظریہ اور یہ کہ حقیقت میں سالک کو جو کچھ نظر آتا ہے، اور جو حقیقت نفس الامری ہے، وہ یہ نہیں کہ وجود واحد ہے، اور واجب الوجود کے سوا ہر وجود حقیقتاً منتفی و معدوم ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودات اپنی جگہ پر موجود اور قائم ہیں، لیکن واجب الوجود کے وجود حقیقی کے نور نے ان پر ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ معدوم نظر آتے ہیں، اور جس طرح ستارے آفتاب کے طلوع کے بعد اس کے نور کے سامنے اس طرح ماند پڑ جاتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ ستارے نہیں ہیں تو وہ کاذب نہیں ہوگا، اسی طرح موجودات اس وجود کامل و حقیقی کے سامنے ایسے بے حقیقت نظر آتے ہیں کہ گویا ان کا سرے سے وجود ہی نہیں۔

مجدد صاحب کا اضافہ اور تجدیدی کارنامہ

مجدد صاحب نے ان تین مسلکوں کے مقابلہ میں ایک چوتھا مسلک اختیار کیا، وہ یہ کہ وحدۃ الوجود سالک کے سیر و سلوک کی ایک منزل ہے، اس کو عیاناً و مشاہدۃً نظر آتا ہے کہ وجود حقیقی و کامل کے علاوہ کسی چیز کا وجود نہیں، جو کچھ ہے، وہ سب ایک ہی وجود ہے، باقی سب اس کی "تلوینات و تنوعات" ہیں، یا شیخ اکبر اور اس مشرب وجودی کے عارفین کے بقول "تنزلات" ہیں

لیکن اگر توفیق الٰہی شامل حال اور شریعت کا چراغ رہنما ہوتا ہے، اور سالک کی ہمت بلند ہوتی ہے، تو دوسری منزل بھی سامنے آتی ہے، اور وہ وحدۃ الشہود کی منزل ہے۔

اس طرح حضرت مجدد وحدۃ الوجود (جو صدیوں تک عالی استعداد سالکین و عارفین اور دقیقہ رس حکماء اور غواصین کا مسلک رہا ہے) کی نفی اور اس کے سب سے بڑے علمبردار و شارح

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (جن کے علوم و معارف نکات و اسرار اور کمالاتِ روحانی کا انکار مکابرہ ہے) کے علوِ مقام، مقبولیت عند اللہ اور اخلاص کا انکار کیے بغیر بلکہ بلند الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے ایک اضافہ فرماتے ہیں، اور ایک نئی یافت و دریافت کا اعلان کرتے ہیں، جو ایک طرف عقیدۂ جمہور مسلمین، کتاب و سنت اور شریعت حقہ کے مطابق ہے، دوسری طرف وہ پیچھے کی طرف لے جانے اور ایک بڑے گروہ کے علوم و تحقیقات پر خط نسخ پھیرنے کے بجائے ایک ایسی چیز کا اضافہ کرتا ہے، جس سے نصوص شرعیہ، اصولِ قطعیہ اور سیرِ انفس و آفاق کے آخری کشوفات و تحقیقات میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔

ذاتی تجربہ و مشاہدہ

اس تمہید کے بعد حضرت مجدد کے چند بلند پایہ مکتوبات کے (جو زیادہ واضح اور سہل الفہم ہیں) اقتباسات پڑھیئے:۔

اپنے روحانی ارتقاء اور وحدۃ الوجود کے مشرب سے وحدۃ الشہود تک پہونچنے کا حال اپنے ایک اہل تعلق "شیخ صوفی" کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مخدوم مکرم! کمسنی سے اس فقیر کا اعتقاد اہل توحید کا مشرب تھا فقیر کے والد قدس سرہٗ ظاہراً اسی مشرب پر تھے، اور مستقلاً اسی طریق سے اشتغال رکھتے تھے، .... بحکم "ابن الفقیہ نصف الفقیہ" فقیر کو بھی اس نسبت سے علمی طور پر حظ وافر حاصل تھا، اور وہ اس میں بڑی لذت پاتا تھا، یہاں تک کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے ارشاد پناہ، حقائق و معارف آگاہ مؤید الدین شیخ راشد رہنمائے راہ خدا محمد الباقی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچایا، اور آں جناب نے اس فقیر کو طریقۂ علیہ نقشبندیہ کی تعلیم دی، اور اس کے

حال پر توجہ بلیغ ملحوظ رکھی، اس طریق علیہ کے اشتغال و ممارست کے بعد تھوڑی مدت میں اس پر توحید وجودی کا انکشاف ہوا، اور اس انکشاف میں ایک طرح کا غلو پیدا ہو گیا، اس مقام کے علوم و معارف کا بکثرت فیضان ہوا، اور اس مرتبہ کے دقائق میں شاید ہی کوئی بات رہی ہو جو منکشف نہ کر دی گئی ہو۔

شیخ محی الدین ابن عربی کے نازک و دقیق علوم جیسا چاہیئے تھا، سامنے آئے اور تجلیِ ذاتی جس کو صاحبِ فصوص نے بیان کیا ہے، اور اس کا وہ انتہائی عروج حاصل ہوا جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ "ما بعد هذا الا العدم المحض" سے بھی مشرف کیا گیا، اور اس تجلی کے وہ علوم و معارف جس کو شیخ خاتم الولایت کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، بتفصیل علم میں آئے، اس توحید میں سکر و غلبۂ حال اس حد تک پہونچا کہ اپنے بعض عرائض میں جو حضرت خواجہ کو لکھے تھے، ایسے سکر کے اشعار لکھ دیئے۔

اس حال نے مدت مدید تک طول کھینچا اور مہینوں سے برسوں کی نوبت آئی کہ ناگاہ حضرت حق کی عنایت بے غایت نے دریچۂ غیب سے منہ نکالا، وہ عرصۂ ظہور میں آئی اور بے چونی و بے چگونی "لیس کمثلہ شیء" کے چہرہ پر جو پردہ پڑا تھا، اس کو ہٹا دیا اور سابق کے وہ علوم جو اتحاد اور وحدۃ الوجود کی خبر دیتے تھے، رو بزوال ہوئے اور احاطہ اور سریان اور قرب و معیتِ ذاتی جو اس مقام میں منکشف ہوئی تھی، روپوش ہو گئی، اور یقین الیقین سے معلوم ہو گیا کہ صانع جل شانہ، اس عالم کے ساتھ ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، اس کا احاطہ و قرب علمی ہے، جیسا کہ اہل حق کا عقیدہ ہے "شکر الله سعیهم" وہ پاک ذات کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں، وہ بے چون و بے چگون ہے، اور عالم سراسر اس داغ سے داغدار ہے، جو بے کیف ہے وہ باکیف کا عین اور مثل کیسے کہا جا سکتا ہے، واجب کو عین ممکن کیسے کہہ سکتے

ہیں؟ قدیم عین حادث کبھی نہیں ہو سکتا، ممتنع العدم عین جائز العدم نہیں ہو سکتا، انقلاب حقائق محال ہے عقلاً و شرعاً اور ایک کا دوسرے پر محمول کرنا کبھی صحیح نہیں ہو سکتا، اصلاً وراساً، تعجب ہے کہ شیخ محی الدین اور ان کے تابعین، ذات واجب تعالےٰ کو مجہول مطلق کہتے ہیں، اور اس کو کسی حکم کا محکوم علیہ نہیں سمجھتے، پھر اس کے باوجود احاطۂ ذاتی اور قرب و معیت ذاتی کو ثابت کرتے ہیں، اس بارے میں صحیح بات وہی ہے، جو علماء اہل سنت نے کہی ہے کہ سارا معاملہ قرب علمی اور احاطۂ علمی کا ہے۔

مشرب توحید وجودی کے منافی ان علوم و معارف کے حصول کے زمانہ میں اس فقیر پر سخت اضطراب کا زمانہ گذرا اس لئے کہ وہ اس توحید سے بالاتر کسی اور امر کو نہیں سمجھتا تھا وہ بڑے تضرع و زاری کے ساتھ دعا کرتا تھا کہ یہ معرفت زائل نہ ہو، یہاں تک کہ سارے حجابات جو اس حقیقت پر پڑے ہوئے تھے، اٹھ گئے اور حقیقت نفس الامری منکشف ہو گئی، اور معلوم ہوا کہ عالم اگرچہ اللہ تعالےٰ کے کمالات صفاتی کے لئے آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مظہر (آئینہ میں جو عکس پڑ رہا ہے) وہ عین ظاہر (صاحب عکس) نہیں اور سایہ اپنی اصل کا (جس کا وہ سایہ ہے) عین نہیں ہو سکتا، جیسا کہ توحید وجودی کے قائلوں کا مسلک ہے۔

اس مسئلہ کو ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے، مثلاً ایک جامع علوم و فنون عالم کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے کمالات گوناگوں کو عرصۂ ظہور میں لائے، اور اپنے مخفی محاسن و کمالات کو منظر عام پر لائے تو اس نے حروف و اصوات کی ایجاد کی تاکہ ان کے آئینوں میں اپنے کمالات مخفی کو ظاہر کرے، ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حروف و اصوات جو ان کمالات مخفی کی جلوہ گاہ اور آئینہ ہیں، ان کمالات کا عین یا ان کمالات کو محیط ہیں، یا ان کے قریب ہیں، یا معیت ذاتیہ رکھتے ہیں، بلکہ ان کے درمیان وہی نسبت ہو گی جو دال و مدلول کے

درمیان ہوتی ہے، حروف و اصوات ان کمالات کی دلیل ہونے سے زیادہ اور کچھ نہیں، اور جو نسبت پیدا ہوئی ہے، وہ وہمی اور تخیلی ہے، فی الحقیقت ان نسبتوں (عینیت، اتحاد، احاطۂ قرب، معیت بالذات) میں سے کوئی بھی نسبت ثابت نہیں، لیکن چونکہ ان کمالات اور ان حروف و اصوات کے درمیان ظاہر و مظہر اور مدلول و دال ہونے کی نسبت متحقق ہے، اس وجہ سے بعض لوگوں کو بعضے عوارض کی بنا پر ان وہمی نسبتوں کا حصول ہو جاتا ہے لیکن نفس الامر میں وہ کمالات ان تمام نسبتوں سے معرّا و مبرّا ہیں، حق اور خلق کے درمیان بھی اس دالّیت و مدلولیت اور ظاہریت و مظہریت کے سوا کوئی علاقہ نہیں ....

بعض حضرات کو مراقبۂ توحید کی کثرت ان وہمی احکام کے لگانے کے باعث ہو جاتی ہے، ان مراقبات کی صورت قوت خیالیہ میں منقش ہو جاتی ہے، بعض دوسرے لوگوں کو علم توحید اور اس کے اعادہ و تکرار سے ان احکام کا ایک طرح کا ذوق حاصل ہو جاتا ہے، بعض لوگوں کے اس طرف مائل ہونے کا سبب (اور وحدۃ الوجود کے قائل ہونے کا باعث) غلبۂ محبت ہے، اس لئے کہ محبوب کی محبت کے غلبہ کی بنا پر محب کی نظر سے غیر محبوب نکل جاتا ہے اور وہ محبوب کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا، واقعہ یہ نہیں ہے کہ نفس الامر میں غیر محبوب کا وجود نہیں ہے اس لئے کہ یہ مخالف حسّ و عقل و شرع ہے، اور کبھی یہی محبت احاطہ و قرب ذاتی کا حکم لگانے پر آمادہ کرتی ہے، .... اور توحید کی یہ قسم پہلی دونوں قسموں سے اعلیٰ ہے اور احوال کے دائرہ میں داخل ہے اگرچہ نفس الامر کے مطابق اور عقل کے موافق نہیں ہے، شریعت اور نفس الامر کے ساتھ اس کی تطبیق کی کوشش تکلف محض ہے، غایت ما فی الباب یہ خطائے کشفی ہے، جو خطائے اجتہادی کا حکم رکھتی ہے کہ ملامت و عتاب اس سے اٹھ جاتا ہے بلکہ ایک حیثیت سے حال و مغلوبیت ہونے کی وجہ سے اس کی تصویب کی جا سکتی ہے۔[1]

---

[1] مکتوب ۳۱/۱ بنام شیخ صوفی۔

توحید شہودی

ایک دوسرے مکتوب میں جو شیخ فرید بخاری کو لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"وہ توحید جو سلوک کے دوران حضرات صوفیاء کو حاصل ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں، توحید شہودی و توحید وجودی، توحید شہودی نام ہے ایک دیکھنے کا یعنی سالک کا مشہود سوائے ایک کے نہ ہو اور توحید وجودی نام ہے ایک کو موجود جاننے کا اور غیر کو معدوم سمجھنے کا۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"مثلاً ایک شخص کو آفتاب کے وجود کا یقین پیدا ہوگیا، اس یقین کا غلبہ اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ ستاروں کو اس وقت منتفی و معدوم جانے لیکن جس وقت کہ وہ آفتاب کو دیکھے گا ستاروں کو نہ دیکھے گا، اس کا مشہود سوائے آفتاب کے کوئی نہ ہوگا، اور جس وقت وہ ستاروں کو نہیں دیکھے گا، اس وقت بھی وہ جانے گا کہ ستارے معدوم نہیں ہیں، بلکہ وہ جانے گا کہ وہ ہیں لیکن مستور ہیں، اور آفتاب کی روشنی کے پرتو اور غلبہ سے مغلوب ہیں۔"[1]

آگے لکھتے ہیں:۔

"حضرت قبلہ گاہی حضرت خواجہ باقی باللہؒ کچھ عرصہ تک توحید وجودی کا مشرب رکھتے تھے، انھوں نے اپنے رسائل و مکتوبات میں اس کا اظہار بھی فرمایا ہے لیکن آخر میں کمال عنایت خداوندی نے ان کو اس مقام سے ترقی عطا فرمائی اور ایسی شاہراہ پر ڈال دیا جس سے اس معرفت کی تنگی سے خلاصی حاصل ہوگئی۔"[2]

ایک مکتوب میں شیخ اکبر اور ان کے متبعین کا مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

۱؎ مکتوب ۴۳/۱ بنام شیخ فرید بخاری۔ ۲؎ ایضاً۔

"وہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، ان کا خیال ہے کہ خارج میں ایک ہی موجود ہے، اور بس! اور وہ ذات حق ہے، عالم کا خارج میں قطعاً کوئی وجود نہیں، البتہ وہ اس کے ثبوت علمی کے قائل ہیں، اور کہتے ہیں کہ الأعیان ماشمت رائحة الوجود" (یعنی اشیاء خارجی نے ہستی اور وجود کی بو بھی نہیں سونگھی ہے) وہ عالم کو حق سبحانہ تعالےٰ کا ظل سمجھتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک یہ وجود ظلی محض مرتبۂ حس میں ہے، نفس الامر اور خارج میں عدم محض ہے۔"[1]

اسی مکتوب میں وحدۃ الوجود سے اپنی ترقی کی حکایت سناتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"راقم سطور اولاً توحید وجودی کا عقیدہ رکھتا تھا، زمانۂ طفولیت سے اس کو اس توحید کا علم حاصل تھا، اور اس کے دل میں اس کا یقین راسخ تھا، اگرچہ اس معاملہ میں اس وقت صاحب حال نہ تھا، اس نے راہ سلوک پر قدم رکھا تو اول (توحید وجودی) کا طریق منکشف ہوا اور اس نے مدت تک اس مقام کے منازل و مراتب میں جولانی کی، اور بہت سے علوم جو اس مقام کے مناسب تھے اس پر فائز ہوئے، اور وہ مشکلات و واردات جو ارباب توحید پر وارد ہوتے ہیں، وہ ان مکاشفات اور علوم فیضانی سے حل ہوئے ایک مدت کے بعد دوسری نسبت کا اس فقیر پر غلبہ ہوا، اور اس غلبہ کی حالت میں اس کو توحید وجودی کے بارے میں توقف لاحق ہوا، لیکن یہ توقف حسن ظن کے ساتھ تھا، انکار کے ساتھ نہیں، مدت تک وہ متوقف رہا، آخر الامر معاملہ انکار تک پہونچ گیا، اور اس کو دکھایا گیا کہ یہ مرتبہ (وحدت وجود کی منزل) فروتر ہے، اور وہ مقام ظلیت تک پہونچا جو اس سے بالاتر ہے، اس انکار کے معاملہ میں وہ بے اختیار تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس مقام سے باہر نکلے اس لئے کہ بڑے بڑے مشائخ اسی مقام پر طرح اقامت ڈال چکے تھے، لیکن جب وہ مقام ظلیت تک

۱؎ مکتوب ۱۶۰/۱ بنام یار محمد الجدید البدخشی الطالقانی۔

پہونچا، اور اس نے اپنے کو اور عالم کو ظل پایا تو اس کو یہ آرزو ہوئی کہ اس کو اس مقام سے جدا نہ کیا جائے، اس لئے کہ وہ کمال وحدۃ الوجود ہی میں سمجھتا تھا، اور یہ مقام فی الجملہ اس سے مناسبت رکھتا ہے لیکن تقدیری بات کہ کمال عنایت اور غریب نوازی سے اس کو اس مقام سے بھی اوپر لے جایا گیا، اور مقام عبدیت تک پہونچایا گیا، اس وقت اس مقام کا کمال نظر میں آیا، اور اس کی بلندی واضح ہوئی اور وہ مقامات گذشتہ سے توبہ و استغفار کرنے لگا، اگر اس عاجز کو اس راستہ تک نہ لے جاتے اور ایک مقام کی دوسرے مقام پر فوقیت نہ ظاہر کرتے، تو وہ اس مقام میں اپنا تنزل سمجھتا، اس لئے کہ اس کے نزدیک توحید وجودی سے بالاتر کوئی مقام نہ تھا، " وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ "[1] (الاحزاب۔۴)

شیخ اکبر کے بارہ میں منصفانہ و معتدل مسلک

اس اختلاف کے باوجود شیخ اکبر کے بارے میں اپنا مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ فقیر شیخ محی الدین کو مقبولین میں سمجھتا ہے لیکن ان کے وہ علوم (جو جمہور کے عقائد اور کتاب و سنت کے ظواہر کے خلاف ہیں) ان کو خطا اور مضر سمجھتا ہے .... لوگوں نے ان کے بارے میں افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے، اور وہ میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں، ایک جماعت شیخ پر زبان طعن و ملامت دراز کرتی ہے، اور ان کے معارف و حقائق کی بھی تغلیط کرتی ہے، دوسری جماعت نے شیخ کی مکمل تقلید اختیار کی ہے، اور ان کے تمام معارف و حقائق کو برحق سمجھتی ہے اور دلائل و شواہد سے ان کی حقیقت ثابت کرتی ہے، اس میں شک نہیں کہ دونوں فریقوں نے افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے، اور وہ میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں .... عجیب معاملہ ہے کہ

[1] مکتوب ۱۶۰/۱ بنام شیخ یار محمد الجدید البدخشی الطالقانی۔

شیخ محی الدین مقبولین حق میں نظر آتے ہیں، اور ان کے اکثر معارف و تحقیقات جو اہل حق کے خلاف ہیں خطا و ناصواب نظر آتے ہیں"[1]

ایک جگہ اپنا اور توحید وجودی کے منکرین و مخالفین کا فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اس فقیر کا توحید وجودی کے قائلین سے اختلاف کشف و شہود کی راہ سے ہے، علماء ان امور (وحدۃ الوجود اور غیر اللہ کے وجود کی مطلق نفی) کی قباحت کے قائل ہیں، اس فقیر کو توحید وجودی کے ان اقوال و احوال کے حسن میں کوئی اشکال نہیں بشرطیکہ ان سے عبور واقع ہو جائے"[2]

توحید وجودی کی مخالفت کی ضرورت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب توحید وجودی سلوک کی ایک منزل اور سالک کے لئے ایک عبوری مرحلہ ہے جس پر سالکین و منتہلکین کا ایک جم غفیر ہر زمانہ میں پہونچا ہے، ان میں سے ایک بڑی جماعت اس مرحلہ پر پہونچ کر رک گئی، اور کسی کو توفیق الٰہی نے اس سے آگے بڑھا کر توحید شہودی تک پہونچا دیا، تو اس میں کیا قباحت ہے، اور حضرت مجدد اس شدّ و مد سے اس کی مخالفت کیوں فرماتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں اس زور و شور سے توحید شہودی کے اثبات اور اس کی ترجیح پر کیوں خامہ فرسائی فرماتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ توحید وجودی کے قائلین اور اس کے مبلغوں اور داعیوں میں (حضرت مجدد صاحب کے زمانہ میں بھی) ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی تھی جس نے اپنے کو قیود شرعی اور فرائض و واجبات اسلامی سے آزاد سمجھ لیا تھا، اور یہ سمجھ کر کہ جب سب

[1] مکتوب ۲۶۶/۱ بنام حضرت خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ [2] مکتوب ۴۲/۲ بنام خواجہ جمال الدین حسین۔

حق کی طرف سے ہے، بلکہ سب حق ہے، تو پھر حق و باطل کی تفریق اور کفر و ایمان کے امتیاز کا کیا سوال؟[1] انھوں نے شریعت اور اس پر عمل درآمد کو عوام کے درجہ کی ایک چیز سمجھ لیا تھا، ان کے نزدیک مقصود اصلی (توحید وجودی) اس سے بلند تر مقام اور اس سے آگے کی منزل تھی جو کاملین راہ اور واصلین بارگاہ کو حاصل ہوتی ہے، دسویں صدی ہجری میں جو حضرت مجدد کے ذہنی و روحانی ارتقاء کا زمانہ ہے اس توحید وجودی کا رنگ ہندوستان پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ عارفانہ ذوق رکھنے والے شعراء سب اسی کے گیت گاتے تھے، اور کفر و ایمان کو مساوی قرار دیتے تھے، بلکہ بعض اوقات کفر کو ایمان پر ترجیح دینے کی سرحد میں داخل ہو جاتے تھے، اس زمانہ میں ایسے بہت سے اشعار زبان زد خلائق تھے جن میں صاف صاف یہ مضمون بیان کیا گیا ہے، مثلاً ؎

کفر و ایمان قرین یک دگرند

ہر کہ را کفر نیست ایمان نیست

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک کتاب میں لکھا گیا ہے۔

"پس ازیں معنی اسلام در کفر ست و کفر در اسلام، یعنی "تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" مراد از لیل کفر ست و مراد از نہار اسلام"[2]۔

دوسری جگہ یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

عشق را با کافری خویشی بود

کافری درعین درویشی بود

[1] تیرھویں صدی ہجری کے اردو کے مشہور و مقبول شاعر مرزا غالب نے انہی لوگوں کی ترجمانی اپنے شعر میں کی ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان ہو گئیں

[2] رسالہ عشقیہ ص ۷۱

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"العلم حجاب اکبر گشت، مراد ازیں علم عبودیت کہ حجاب اکبر ست، ایں حجاب اکبر اگر از میاں مرتفع شود کفر بہ اسلام و اسلام بہ کفر آمیزد و عبارت خدائی و بندگی برخیزد"[1]

مجدد صاحب کے لئے جن کو اللہ تعالیٰ نے حمیت دینی اور غیرت فاروقی کا حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور جن کی ذات سے حدیث مشہور کی پیش گوئی کا ظہور ہونا مقدر ہو چکا تھا جس میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف	اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل و متقی حامل
عدولہ ینفون عنہ تحریف	و وارث ہوں گے جو اس دین سے غلو پسند
الغالین و انتحال المبطلین	لوگوں کی تحریف، اہل باطل کے غلط انتسابات
و تاویل الجاھلین[2]۔	اور دعوے اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات
	کو دور کرتے رہیں گے۔

یہی چیز اس عقیدہ اور دعوت کی علمی و دینی احتساب کا باعث ہوئی جس کی تبلیغ و اشاعت میں اس عصر میں اور خاص طور پر ہندوستان میں پورے جوش و خروش اور عمومیت اور اطلاقیت سے کام لیا جا رہا تھا، اور مجدد صاحبؒ مشاہدہ فرما رہے تھے کہ اس کے اثر سے شریعت کی گرفت طبیعتوں پر سے ڈھیلی اور اس کا تقدس و احترام نگاہوں میں کم ہوتا جا رہا تھا، مجدد صاحب خود اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

اکثر ابنائے ایں وقت بعضے بہ تقلید و	اکثر ابنائے زمانہ بعض تقلید کی
بعضے بمجرد علم و بعضے دیگر بعلم ممتزج	بنا پر بعض محض اپنے علم کے زور پر

[1] رسالہ عشقیہ ص ۷۳ [2] مشکوۃ فصل ثانی۔ (کتاب العلم)

بذوق ولونی الجملہ وبعضے بالحاد و
زندقہ دست بدامن ایں توحید وجودی
زدہ اند وہمہ را از حق میدانند بلکہ
حق میدانند وگردنہائے خود را
از ربقۂ تکلیف شرعی بالحیلہ میکشانید
ومداہنات در احکام شرعیہ مینمایند
وباین معاملہ خوشوقت وخورسند اند
واتیان اوامر شرعیہ را اگر اعتراف
دارند طفیلے میدانند مقصود اصلی
ورائے شریعت خیال می کنند حاشا و
کلا ثم حاشا وکلا، نعوذ باللہ سبحانہ
من هذا الاعتقاد السوء۔[1]

اور بعض ایسے علم کی بنا پر جس میں ذوق
کی شمولیت ہے (خواہ کسی محدود مقدار
میں) اور بعض نے الحاد و زندقہ کی
بنا پر اس توحید وجودی کا دامن تھام
لیا ہے، اور وہ ہر چیز کو حق کی طرف سے
جانتے ہیں بلکہ حق ہی جانتے ہیں اور
وہ اپنی گردنوں کو کسی نہ کسی ترکیب سے
تکلیف شرعی کے طوق سے آزاد کر لیتے
ہیں، اور احکام شرعیہ کے بارے میں
تساہل و مداہنت سے کام لیتے ہیں
اور اس معاملہ میں بڑے مسرور اور
مطمئن نظر آتے ہیں، یہ لوگ اوامر شرعیہ
پر عمل کرنے کی ضرورت کا اگر اعتراف
بھی کرتے ہیں تو اس کو ضمنی اور تبعی بات
سمجھتے ہیں، وہ مقصود اصلی شریعت
کے ماوراء خیال کرتے ہیں، حاشا وکلا
ثم حاشا وکلا ہم اللہ تعالیٰ سے ایسے
اعتقاد فاسد سے پناہ مانگتے ہیں۔

[1] مکتوبات دفتر اول مکتوب ۴۳ بنام شیخ فرید بخاری۔

اسی مکتوب میں ایک دوسرے موقع پر تحریر فرمایا ہے:-

دریں زمان بسیارے ازیں طائفہ کہ
بزی صوفیاں خود را وامی نمایند
توحید وجودی را شائع ساختہ اند
کمال را جز آں نمی دانند وبعلم ازعین
باز ماندہ اند وآں اقوال مشائخ را
بمعانی متخیلہ خود فرود آوردہ مقتدائے
روزگار خود ساختہ اند وبازار کاسد
خود را باین تخیلات رائج داشتہ
اند۔[1]

اس زمانہ میں اس گروہ کے بہت سے
ایسے لوگ جو صوفیوں کے لباس میں اپنے
کو ظاہر کرتے ہیں توحید وجودی کا برسر عام
اعلان کرنے لگے ہیں، اور اس کے سوا
وہ کسی چیز کو کمال نہیں جانتے، علم کے
ذریعہ حقیقت سے دور رہ گئے ہیں،
مشائخ کے اقوال کو اپنے ذہن کے
پیدا کئے ہوئے مضامین پر اتار لائے
ہیں، اور ان کو اپنا مقتدیٰ بنا رکھا
ہے، اور ان تخیلات سے اپنے بازار
کاسد کو گرم کر رکھا ہے۔

مجدد صاحب کی انفرادیت وامتیاز

مجدد صاحب کا تجدیدی کارنامہ محض یہ نہیں ہے کہ انھوں نے وحدۃ الوجود کے مقبول عام نظریہ اور سکۂ رائج الوقت کے متعلق ثابت کر دیا کہ وہ "نقد کامل عیار" اور سلوک ومعرفت کی منزل آخری نہیں ہے، بلکہ اس باب میں ان کی انفرادیت وامتیاز کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اس پر اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں تنقید کی اور

[1] ایضاً۔

یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر اور اس کی تہہ تک پہونچ کر ابھرے ہیں، اور
تائید الٰہی سے انھوں نے اپنے زورق معرفت و تحقیق کو ساحل مراد تک پہونچایا ہے،
اور اس باب میں مشکل سے ان کا کوئی ہمسر اور ہمسفر ملے گا، مغربی مصنف پیٹر ہارڈی
(PETER HARDY) نے جو ان مسائل میں سند کا درجہ نہیں رکھتا بہر حال یہ صحیح لکھا
ہے کہ:۔

"شیخ احمد سرہندی کی بڑی کامیابی یہی ہے کہ انھوں نے ہندی اسلام کو
متصوفانہ انتہا پسندی سے خود تصوف کے ذریعہ نجات دلائی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ
جس نظریہ کی انھوں نے تردید کی اس کے مطلب و مفہوم اور قدر و قیمت کا ان کو ذاتی
طور پر عمیق ادراک تھا۔"[1]

مجدد صاحب کے بعد توحید وجودی کے بارے میں مشائخ و علماء کا "مصالحانہ" رویہ

قبل اس کے کہ اس باب کو ختم کیا جائے ایک غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے
اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے بعد (ان کے اس
خاص سلسلہ کو چھوڑ کر جو حضرت خواجہ محمد معصوم کے ذریعہ ہندوستان اور ہندوستان
کے باہر پھیلا) وحدۃ الوجود کے بارے میں وہ واضح قطعی اور فیصلہ کن رجحان اور
وحدۃ الشہود پر وہ یقین و اذعان باقی نہیں رہا، جس کا مجدد صاحب نے علم بلند
کیا تھا، اور جس پر وہ علی وجہ البصیرۃ قائم اور اس کے داعی تھے، ان کی رحلت کے
بعد ہی سے تصوف و معرفت کے حلقوں میں اور بعض ان حلقوں میں بھی جو اپنا

[1] SOURCES OF INDIAN TRADITION, N.Y. P-449

ان کی طرف انتساب کرتے تھے، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان مفاہمت
و مطابقت کا رجحان نمایاں ہوگیا، اور بعض بلند پایہ علماء اور محققین نے یہاں تک
لکھ دیا کہ "یہ اختلاف محض نزاع لفظی تھا" بعض حضرات نے یہاں تک لکھا کہ مجدد صاحب
سے اس بارہ میں تسامح ہوا اور شیخ اکبر کی تمام تصنیفات ان کی نظر سے نہیں گذریں"
اسی بنا پر سلسلۂ مجددیہ کے نامور شیخ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے
ایماء پر ان کے مرید رشید مولانا غلام یحییٰ بہاری (م ۱۱۸۰ھ) نے کلمۃ الحق کے نام سے
ایک کتاب لکھی جس میں مجدد صاحب کی تحقیق اور مسلک کو واشگاف طریقہ پر
بیان کیا، اور اس تطبیقی رجحان کی تردید کی جو خود سلسلۂ مجددیہ کے بعض حلقوں میں
نظر آنے لگا تھا۔

حضرت سید احمد شہید مجدد صاحب کے نقش قدم پر

اس سلسلۂ عالیہ میں مجدد صاحب کے بعد اگر کسی شیخ طریقت اور عارف و محقق
کے یہاں وحدۃ الشہود کا واضح اور بے آمیز نظریہ اور تلقین پائی جاتی ہے اور وہ
اس بارے میں حضرت مجدد کے نقش قدم پر نظر آتے ہیں، تو وہ سلسلہ مجددیہ[1] احسنیہ
کے مشہور شیخ طریقت داعی الی اللہ اور مجاہد فی سبیل اللہ حضرت سید احمد شہیدؒ
رائے بریلوی (ش ۱۲۴۶ھ) ہیں[2]، جن کے یہاں وحدۃ الوجود کی کوئی پرچھائیں اور

[1] حضرت سید آدم بنوری خلیفہ حضرت مجدد کا مخصوص سلسلہ جو سلسلۂ آدمیہ اور سلسلۂ احسنیہ کہلایا
جاتا ہے۔

[2] یہ ان کے خاندانی ذوق کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے جد رابع حضرت شاہ سید علم اللہ (باقی صفحہ ۲۹ پر)

تاویل واعتذار کا کوئی عکس نظر نہیں آتا۔[1]

(باقی ص۲۸۹ کا) حضرت سید آدم بنوری کے خلیفۂ ارشد ہیں اور خود ان کے مقام تحقیق واجتہاد کا بھی نتیجہ ہو سکتا ہے جس پر وہ فائز تھے۔

[1] ملاحظہ ہو "صراط مستقیم" ہدایت رابعہ در بیان ثمرات حب عشقی افادہ ۱ ص۱۲ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور۔

باب ہفتم

اکبر سے جہانگیر تک

سلطنت کو راہ راست پر لانے کے لئے آپ کی خاموش جدّ وجہد

عہد اکبری وجہانگیری کے جرأتمند اور حق گو علماء ومشائخ

قبل اس کے کہ ہم حضرت مجدد کی ان مساعی جمیلہ کا تذکرہ کریں جنھوں نے سلطنت کا رخ موڑ دیا، اس حقیقت کا اظہار ضروری اور قرین قیاس سمجھتے ہیں کہ دور اکبری کے متعلق یہ تخیل صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سناٹا تھا، اور اکبر کو اس کے طرز عمل پر ٹوکنے والا اور حدیث:۔

من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔[1]	تم میں سے جو کوئی خلاف شرع کام یا امر منکر دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دینا چاہئے اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے (اس کا انکار وتردید کرنی چاہئے) اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو دل سے اس کو بُرا سمجھنا چاہئے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

---

[1] صحیحین

کے دوسرے اور تیسرے درجہ پر بھی کسی نے عمل نہیں کیا۔

عہد اکبری کے حسب ذیل حضرات کے متعلق تاریخ اور تذکروں میں شہادت ملتی ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر اور اپنے امکان بھر اس صورت حال پر اپنی ناگواری اور اپنے اسلامی جذبات کا اظہار کیا۔

شیخ ابراہیم محدث اکبرآبادی (م ۱۰۰۱ھ) ایک مرتبہ اکبر کے عبادت خانہ میں اس کی دعوت پر آئے اور بادشاہ کے لئے غیر شرعی آداب و تعظیم بجا نہیں لائے، انھوں نے اپنی تقریر میں ترغیب و ترہیب سے کام لیا اور جلال شاہی سے ذرا مرعوب نہیں ہوئے، شیخ حسین اجمیری جنھوں نے ۱۰۰۹ھ کے بعد وفات پائی، اکبر کے اجمیر آنے پر ناراض ہو کر وہاں سے چلے گئے، اکبر نے ان کو خانقاہ اور درگاہ کی تولیت سے معزول کیا اور حجاز چلے جانے کا حکم دیا، ہندوستان واپسی پر بھی انھوں نے سجدۂ تعظیمی نہیں کیا، بادشاہ ناراض ہو گیا اور ان کو بکھر کے قلعہ میں قید کر دیا، جہاں وہ کئی سال تک رہے، رہائی پر بھی وہ آداب شاہی سے محترز رہے، اور انھوں نے عطیہ سلطانی قبول کرنے سے انکار کیا، شیخ سلطان تھانیسری جو مقربین دربار میں سے تھے، اور جنھوں نے بادشاہ کے حکم سے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، ذبح گاؤ کے الزام میں بادشاہ کے معتوب بنے اور ان کو بکھر جلاوطن کر دیا گیا، پھر عبدالرحیم خان خاناں کی سفارش پر ان کو تھانیسر قیام کی اجازت دی گئی اور کروڑگیری (تحصیل وصول) پر مامور کیا گیا، کچھ عرصہ بعد بادشاہ کو پھر ان کی شکایات پہونچیں جو ان کے اسلامی طرز عمل پر مبنی تھیں، اور اس نے سزائے موت کا حکم دیا یہ واقعہ ۱۰۰۷ھ[۱] کا ہے۔

[۱] منتخب التواریخ، آپ حضرت مجدد کے خسر تھے۔

اس سلسلہ میں سب سے جرأتمندانہ اور مردانہ اقدام شہباز خاں کنبوہ (م ۱۰۰۸ھ) کا ہے، جو اکبر کے امرائے کبار میں تھے، اور آخر میں میر بخشی کے عہدہ سے سرفراز ہوئے، وہ بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہے، نہ انھوں نے داڑھی کترائی، نہ شراب کے قریب گئے نہ اکبر کے ایجاد کردہ دین الٰہی کی طرف میلان ظاہر کیا، شاہ نواز خاں مصنف "مآثر الامراء" کی روایت ہے کہ بادشاہ ایک دن عصر و مغرب کے درمیان فتح پور سیکری میں ایک تالاب کے کنارے سیر کر رہا تھا، شہباز خاں حاضر تھے، بادشاہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چہل قدمی اور ان سے گفتگو میں مصروف ہو گیا، لوگوں کا خیال تھا کہ شہباز خاں بادشاہ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکتے، اور آج ان کی مغرب کی نماز ضرور قضا ہو گی، ان کا یہ بھی معمول تھا کہ عصر کے بعد مغرب تک کسی سے بات نہیں کرتے تھے، شہباز خاں نے جب دیکھا کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے تو انھوں نے بادشاہ سے نماز کی اجازت مانگی، بادشاہ نے ازراہ بے تکلفی کہا، مجھے تنہا نہ چھوڑو نماز قضا کر لینا، شہباز خاں نے اپنا ہاتھ چھوڑا لیا اور اپنی چادر زمین پر بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی، نماز سے فارغ ہو کر اپنے روزمرہ کے اوراد میں مشغول ہو گئے بادشاہ ان کے سامنے کھڑا رہا اور سخت الفاظ کہتا رہا، امیر ابو الفتح اور حکیم علی گیلانی اس موقع پر موجود تھے، انھوں نے موقع کی نزاکت محسوس کی، وہ آگے بڑھے اور بادشاہ کو متوجہ کرنے کے لئے کہا کہ "آخر ہم بھی تو توجہات شاہانہ کے مستحق ہیں"، بادشاہ کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا اور وہ شہباز خاں کو چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو گیا۔

شیخ عبدالقادر اچی بھی انہی جری لوگوں میں تھے، جنھوں نے خلاف شرع امور میں بادشاہ کی موافقت نہیں کی، ایک دن بادشاہ نے افیون ان کو پیش کی انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا، اس سے بادشاہ کو ناگواری ہوئی، ایک دن وہ عبادت خانہ میں نماز فرض کے بعد

نوافل میں مشغول تھے کہ بادشاہ محل سے برآمد ہوا اس نے کہا کہ آپ کو نفلیں اپنے گھر میں پڑھنی چاہئیں، مولانا عبد القادر نے جواب دیا کہ حضور والا! (یہاں عبادت خانہ میں) آپ کی سلطنت نہیں ہے، بادشاہ کو بہت غصہ آیا اور کہا کہ آپ کو میری سلطنت گوارہ نہیں تو یہاں سے چلے جائیے وہ اسی وقت شہر اُچ کی طرف روانہ ہو گئے اور عبادت اور افادۂ خلائق میں مشغول ہو گئے، انہی کے ہم نام شیخ عبد القادر لاہوری (م ۱۰۲۲ھ) کو بھی اکبر کے حکم سے جو ان سے ان کی دینی صلابت کی بنا پر ناراض تھا حجاز کا سفر کرنا پڑا، مرزا عزیز الدین دہلوی کوکہ (م ۱۰۳۳ھ) جو اکبر کے ہم عمر اور دودھ شریک بھائی تھے اور جن سے اکبر کو بڑی محبت تھی، شرع اور دینی مسائل میں اکبر کا بالکل لحاظ نہیں کرتے تھے، اور صاف گوئی سے کام لیتے تھے، اسی بنا پر اکبر نے ان کو گجرات کی صوبیداری سے معزول کیا پھر بنگالہ اور بہار کی صوبیداری دی، اور خان اعظم کا خطاب دیا، لیکن اس تقرب کے باوجود انھوں نے سجدۂ تعظیمی، ریش تراشی وغیرہ میں بادشاہ کی موافقت نہیں کی، انہی لوگوں میں شیخ منور عبد الحمید لاہوری (م ۱۰۱۵ھ) بھی تھے، جن کو اکبر نے ۹۸۵ھ میں صدارت کے عہدہ پر مقرر کیا، لیکن وہ بھی اپنی دینی استقامت کی وجہ سے بادشاہ کے معتوب اور موردِ غضب بنے، بادشاہ نے ان کے مال و املاک یہاں تک کہ کتابوں تک کے لوٹ لینے کا حکم دیا، پھر آگرہ طلب کر کے ان کو سخت قید میں رکھا، اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔[1]

جہانگیر کی جانشینی عمل میں آئی تو عرصہ تک عہد اکبری کے رسوم و آئین جاری رہے، اسلام کی علانیہ مخالفت چھوڑ کر باقی وہی طور طریقے سلطنت میں رائج تھے، اور اس وقت تک رائج رہے، جب تک کہ جہانگیر کا خود میلان شرع محمدی کی تعظیم اور شعائر اسلام کے احترام کی طرف

[1] یہ سب نام اور اکبر کی مخالفت کے واقعات "نزہۃ الخواطر" ج ۵ سے اخذ کئے گئے ہیں۔

نہیں ہوا، اس دور میں بھی متعدد علماء و مشائخ نے خطرہ مول لے کر ان خلاف شرع بلکہ منافی دین و شریعت، آداب و رسوم کے ادا کرنے سے انکار کیا، شریعت کے حدود سے تجاوز کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے، اور کلمۂ حق کہنے سے دریغ نہیں کیا، انہی میں ہندوستان کے شمال مغربی حدود کے ایک صاحب طریقت بزرگ احمد بن محمد بن الیاس حسینی غزغشتی تھے، جن کو جہانگیر نے دربار میں طلب کیا، انھوں نے آداب رسوم کے مطابق سلام و آداب بجالانے سے انکار کر دیا، جہانگیر نے ان کو قلعۂ گوالیار میں قید کر دیا، جہاں وہ تین سال تک رہے، پھر ۱۰۲۰ھ میں ان کو آزادی کا پروانہ ملا، اور جہانگیر ان کو اپنے ساتھ آگرہ لایا۔[1]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ سلطنت کی بے راہ روی کی منظم مخالفت اور اس کو راہ راست پر لانے کی مکمل اور حکیمانہ کوشش کا سہرا حضرت مجدد کے سر ہے، اور حفاظت دین اور نصرت اسلام و مسلمین کا کارنامہ انہی کے لئے مقدر تھا، اور انہی نے اس کو تکمیل تک پہونچا کر ہندوستان میں وہ خاموش انقلاب برپا کیا، جس کی نظیر دوسرے اسلامی ملکوں اور سلطنتوں کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، اور جس کے نتیجہ میں اکبر کے بعد سلطنت مغلیہ کے تخت پر جو فرمانروا آیا وہ اپنے پیشرو سے بہتر، اسلام کی مخالفت کے جراثیم سے محفوظ اور دین کے احترام اور حمیتِ اسلام میں فائق و ممتاز تھا، یہاں تک کہ اس سلسلۂ زریں کی تکمیل محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی ذات پر ہوئی۔

جہانگیر کی تخت نشینی اور مجدد صاحب کے اصلاح سلطنت کے کام کا آغاز

جلال الدین اکبر بادشاہ کا انتقال (۱۰۱۴ھ کو) ہوا، اس وقت حضرت مجدد کی عمر

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵۔

تینتالیس[۴۳] سال کی تھی، اکبر کی سلطنت کا آخری دور جس میں ہندوستان میں اسلام کی باعزت زندگی، آزادی اور اس ملک میں غالب و با اقتدار رہنے کے لئے کھلا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، مجدد صاحب کے روحانی تکمیل و ارتقاء کا زمانہ تھا، ارکان سلطنت سے ان کے کوئی مراسم و تعلقات نہیں تھے، اور نہ ابھی وہ وقت آیا تھا کہ وہ ان کے علوِ مرتبہ، اخلاص و للّٰہیت اور باطنی کمالات سے واقف ہوں، اس لئے حقیقت میں وہ سرا ہاتھ میں نہیں آیا تھا، جس سے وہ دربار شاہی تک اپنے احساسات و تاثرات پہونچا سکتے، یا دین و آئین کے بارے میں حکومت کی عام پالیسی پر اثر انداز ہو سکتے، اس وقت فرمانروائے سلطنت کے مزاج و مذاق سرکار دربار اور نظم و نسق پر وہ لوگ حاوی تھے، جو کسی مخلص و دیندار کو بادشاہ کے قریب آنے نہیں دیتے تھے، اور انھوں نے اس کے گرد ایک ایسا آہنی حصار قائم کر رکھا تھا جس سے باہر کی تازہ اور بے آمیز ہوا کا کوئی جھونکا اور اہل ملک کی پسند و ناپسند کا کوئی اندازہ اندر نہیں آسکتا تھا، اس وقت اسلام اور مسلمانوں کا اس وسیع ملک میں جہاں ان کی آزاد سلطنتیں تسلسل کے ساتھ قائم رہ چکی تھیں، وہی حال تھا جس کا قرآن مجید نے ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ	زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی، اور
وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْآ	وہ خود اپنی جان سے تنگ آگئے، اور انھوں نے
اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۝	سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں
(التوبہ - ۱۱۸)	مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جاوے

لیکن جہانگیر کی تخت نشینی (۱۰۱۴ھ) پر یہ صورت باقی نہیں رہی، جہانگیر کے اندر اگر (اس مخصوص تعلیم و تربیت کی بنا پر جو اس نے باپ کے زیر سایہ پائی تھی) کوئی نمایاں دینی صلاح،

تشرع، فرائض اسلام کی پابندی اور کھلا ہوا دینی رجحان نہیں پایا جاتا تھا تو اس کے اندر اسلام سے کوئی بُعد و وحشت، کسی دوسرے مذہبی فلسفہ یا قومی تہذیب سے مرعوبیت اور شیفتگی اور کسی نئے دین و آئین کے اجراء کا شوق بھی نہیں پایا جاتا تھا، دوسرے لفظوں میں اگر وہ حامیِ اسلام نہیں تھا تو ماحیِ اسلام بھی نہیں تھا، عام طور پر جو صاحب تخت و تاج فرمانروا عیش و عشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں، وہ کسی مقبول عام نظام کے ازالہ اور تنسیخ اور کسی نئے نظام کے اجراء کا دردِ سر مول نہیں لیتے، وہ صرف کام و دہن کی لذت اور حکومت و اقتدار کی عزت سے سروکار رکھتے ہیں، عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے لوگوں کے اندر ان ہستیوں کے ساتھ ایک مخفی عقیدت اور احترام پایا جاتا ہے، جو اس مادی سطح سے بلند اور ان دنیاوی مظاہر و مناصب سے مستغنی ہوتے ہیں، اور ان لوگوں کے مقابلہ میں جو کسی منصب کے مدعی یا کسی نئی تحریک و فلسفہ کے داعی ہوتے ہیں، ان میں قبول حق کی زیادہ استعداد و صلاحیت پائی جاتی ہے۔

جہانگیر فرمانروایانِ سلطنت کی اسی قسم سے تعلق رکھتا تھا، اور وہ جب تخت سلطنت پر تمکن ہوا تو اہل نظر نے سمجھ لیا کہ اب سلطنت کا رخ بدلنے اور تدریجی طور پر اس کو راہ راست پر لانے کا وقت آگیا ہے۔

صحیح طریق کار

اس وقت حضرت مجدد اور ان سب حضرات کے لئے جو علم دین اور کمال باطن سے آراستہ، خود مشغول اور سیر فی اللہ کی دولت سے مالا مال اور دینی حمیت و غیرت کے نشہ سے سرشار تھے، اس صورت حال کے سامنے جو اس وقت قلمرو سلطنت پر سایہ فگن تھی، تین[۳] راستے تھے:۔

۱۔ سلطنت اور ملک کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے لئے کسی ایسے گوشہ کا انتخاب، جہاں اطمینان کے ساتھ یادِ خدا میں مشغولی، طالبین کی تربیت اور ذکر و عبادت کی یکسوئی اور سرگرمی میسر آسکتی تھی، یہ وہ طرز عمل تھا، جو حضرت مجدد کے عہد میں بیسیوں بلکہ صدہا علماء ومشائخ نے اختیار کیا، ملک کے چپہ چپہ پر ان کی خانقاہیں تھیں، اور وہ پوری یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ کام کر رہے تھے، اور خلق خدا کو ان سے بیش بہا روحانی وایمانی فوائد پہونچ رہے تھے۔

۲۔ ہندوستان کی برائے نام مسلم سلطنت اور اس کے فرمانروا کو (جس کو صرف مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کا شرف حاصل تھا) اسلام کا مخالف اور معاند سمجھ کر (جس کے ثبوت کے لئے بہت سے آئین وضوابط اور ذاتی اعمال واخلاق مل سکتے تھے) اس کی اصلاح سے یکسر مایوس ہو جانا، اس کے خلاف ایک دینی محاذ قائم کر لینا، اور اسلام کا اس کو مستقل حریف اور مقابل سمجھ کر اس کی مستقل مخالفت اور اس کے خلاف صف آرائی۔

اور اگر اس سے کام نہ چلے تو دینی حمیت، جہاد و سرفروشی کا جذبہ رکھنے والے اور موجودہ صورت حال سے بیزار معتقدین ومریدین ورفقاء کو مجتمع کرنا اور کسی فوجی وسیاسی کارروائی کے ذریعہ سلطنت میں انقلاب لانا اور تخت سلطنت پر کسی زیادہ صالح اور دیندار شخص کو (خواہ وہ خاندان مغلیہ ہی سے تعلق رکھتا ہو اور بابر کی اولاد میں ہو) بٹھانے کی کوشش کرنا جو پوری سلطنت کا رخ موڑ دے اور حالات میں یکسر تبدیلی ہو جائے۔

۳۔ ارکان سلطنت وامرائے دربار سے تعلقات پیدا کرکے اور جن سے پہلے سے تعلق ہے، اور وہ آپ کی ذات سے عقیدت اور آپ کے خلوص اور دلسوزی پر پورا اعتماد رکھتے ہیں، ان میں دینی جذبہ اور حمیت ابھار کر اور ان کے دلوں کے خاکستر میں جو ایمانی چنگاریاں

دبی ہوئی ہیں ان کو فروزاں کرکے بادشاہ کو نیک مشورہ دینے پر آمادہ کرنا، اس کی رگ اسلامیت کو جو اپنے باایمان اسلاف واجداد سے اس کو ورثہ میں ملی ہے جنبش میں لانا، اس کو اسلام کی حمایت، مسلمانوں کے مجروح دلوں کی چارہ سازی اور گزشتہ دور کی تلافی پر آمادہ کرنا، خود ہر طرح کے جاہ ومنصب سے بلکہ اس کے سایہ سے بھی دور رہنا، مکمل زہد واستغناء کا ثبوت دینا، سلطنت کو اہل سلطنت اور مناصب ومراتب کو اہل مناصب ومراتب کے حوالہ کرنا، ایسی عالی نظری اور بے لوثی کا اظہار کہ کوئی شدید سے شدید مخالف اور حاسد بھی جاہ طلبی یا حصول اقتدار کی تہمت نہ لگا سکے اور کوئی مخالفانہ سازش بھی اس سلسلہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جہاں تک پہلے نمبر کا تعلق ہے وہ حضرت مجدد کی افتاد طبع، ان کی شان عزیمت اور اس رفیع منصب سے جس سے اللہ نے ان کو سرفراز کیا تھا، کوئی مناسبت نہیں رکھتا، حضرت مجدد کو اپنی باطنی تکمیل وتربیت کے بعد ہی اس بات کا اذعان پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی دوسرا ہی کام لینا منظور ہے، اور وہ محض لازمی وانفرادی عبادات وترقیات اور پیری ومریدی کے لئے پیدا نہیں کئے گئے، انھوں نے اپنے سلسلہ ہی کے ایک رفیع المرتبت شیخ اور امام سلسلہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار (م ۸۹۵ھ) کا یہ مقولہ نقل کرکے "حدیث دیگراں" میں "سر دلبراں" کہہ دیا ہے کہ حضرت خواجہ احرار فرماتے تھے:۔

اگر من شیخی کنم ہیچ در عالم مرید نیابد اما مرا کار دیگر فرمودہ اند، وآں ترویج شریعت وتائید ملت است۔

اگر میں خالی پیری مریدی کرنے پر آجاؤں تو دنیا میں کسی پیر کو کوئی مرید نہ ملے لیکن خدا نے مجھے کچھ اور ہی کام سپرد کیا ہے، اور وہ ترویج شریعت اور تائید ملت ہے۔

پھر اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

لاجرم بصحبت سلاطین می رفتند و بتصرف خود ایشاں را منقاد می ساختند و بتوسل ایشاں ترویج شریعت می فرمودند[1]

آپ بادشاہوں کی مجلسوں میں تشریف لے جاتے تھے، اور اپنی قوت باطنی اور تاثیر روحانی سے ان کو اپنا مطیع و منقاد بنا لیتے تھے، پھر ان کے ذریعہ شریعت کو رواج دیتے تھے۔

جہاں تک نمبر ۲ کا تعلق ہے، یہ ایک سیاسی ذہنیت رکھنے والے کوتاہ نظر داعی یا قائد کا طرز عمل ہو سکتا ہے، جو اپنا کام شک و بدگمانی سے شروع کرتا ہے، اور اپنی عجلت پسندی، حکمت دعوت اور جذبۂ خیر خواہی و نصیحت پر محاذ آرائی کو ترجیح دینے کے نتیجہ میں حکومت و اقتدار کو اپنا حریف اور مدمقابل بنا لیتا ہے، اور دین کے غلبہ کے امکانات اور میدان کو اور زیادہ تنگ کر لیتا ہے، ایک داعی الی اللہ اور مؤید من اللہ کا طریق کار نہیں ہوتا جس کا مقصد اپنی ذات یا جماعت کے لئے حصول اقتدار نہیں صرف دین کا غلبہ اور احکام شریعت کا نفاذ و اجراء ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کے ہاتھ سے ہو۔

جہاں تک علمی اقدام کا تعلق ہے، وہ سخت خطرات سے بھرا ہوا تھا، اور ہندوستان کے اس وقت کے سیاسی نقشہ اور ماحول میں اسلام کے بارے میں ایک طرح سے خودکشی کا اقدام تھا، سلطنت مغلیہ میں جس کو بابر نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے قائم کیا تھا، ہمایوں نے اس کے لئے ایران کا ہفت خواں طے کیا تھا، اور اکبر نے اپنی پے در پے فتوحات اور تسخیر ملک سے اس کو مستحکم کیا تھا، ابھی تک ضعف کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے،

[1] مکتوبات دفتر اول مکتوب ۶۵ بنام خان اعظم

شیر شاہ سوری جیسے اولوالعزم بادشاہ کا جانشین سلیم شاہ اس کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا مختلف وقتوں میں ملک میں رونما ہونے والی بغاوتیں سب ناکام ہو چکی تھیں، پھر اگر مغل فرمانروا کو تخت سلطنت سے اتارنے کی کوشش کامیاب بھی ہو جاتی تو اس کا قوی اندیشہ تھا کہ راجپوت جنھوں نے اکبر کے زمانہ میں خاص طور پر اعلیٰ مناصب حاصل کر لئے تھے، اور جن کی فوجی طاقت خود فرمانروائے سلطنت کے لئے سب سے زیادہ قابل اعتماد سرمایہ تھا، حکومت پر حاوی ہو جاتے اور اس ملک میں مسلم اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا تھا۔

پھر یہ تجربہ اس سے پہلے ناکام ہو چکا تھا اکبر کے زمانہ میں شیخ بایزید کی جو پیر روشن اور پیر تاریک کے متضاد ناموں سے مشہور ہیں، قیادت میں ایک بڑی دینی تحریک اور تنظیم فرقۂ روشنائیہ کے نام سے شروع ہوئی تھی، اس نے سالہاسال سلطنت مغلیہ کی افواج قاہرہ کا پامردی سے مقابلہ کیا اس نے کوہ سلیمان کو مستقر بنا کر درۂ خیبر پر بھی قبضہ جمالیا اور قرب و جوار کے علاقوں پر بھی حملہ آور ہوئی اکبر نے ان کے مقابلہ کے لئے راجہ مان سنگھ اور راجہ بیربل اور زین خاں کو بھیجا لیکن وہ سب ناکام رہے، بیربل ایک مقابلہ میں مارا گیا، روشنائیوں نے ایک بڑے لشکر کی مدد سے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا، یہ فتنہ جہانگیر کے عہد ہی میں فرو ہو سکا اور اس کا پورا خاتمہ شاہجہاں کے زمانہ میں ہوا، لیکن اس سب کے باوجود اس بغاوت کا سوائے انتشار کے کوئی نتیجہ نہ نکلا اور بالآخر اس کو منظم و مستحکم مغل سلطنت کے سامنے سپر ڈالنی پڑی اور تاریخ میں صرف اس کا نام رہ گیا۔

اس طرح کے فوجی اقدامات جو کسی اصلاح کے نام سے کئے جاتے ہیں سلطنتوں اور اصحاب اقتدار کی مختلف بدگمانیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں، اور وہ دین کو اپنا حریف و رقیب سمجھ کر اس کے استئصال اور اس کے ہم خیالوں اور پیروؤں کی تلاش و جستجو کر کے

ان کا قلع قمع کرنے کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں، ایک روایت کے مطابق اسی بنا پر گوالیار کی اسیری اور لشکر کی ہمراہی سے رہائی پانے کے چار پانچ سال بعد ۱۰۳۵ھ میں عہدِ جہانگیری کے مشہور امیر و وزیر مہابت خاں نے بغاوت کی تو اہلِ بصیرت نے اس کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی[1] مجدد صاحب کی فراستِ ایمانی کی بہت بڑی دلیل اور توفیقِ الٰہی کا یہ روشن ثبوت تھا کہ انھوں نے حالات میں انقلاب لانے کے لئے پُرخطر اور مشتبہ راستہ اختیار نہیں کیا، اور تخریب کے بجائے تعمیر، نفی کے بجائے اثبات و ایجاب، اور ازالہ کے بجائے امالہ کا راستہ اختیار کیا جو ہر طرح کے خطرات سے محفوظ اور ایک بے ضرر راستہ تھا۔

اب مجدد صاحب کے سامنے ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا، اور وہ یہی کہ ان ارکانِ سلطنت سے رابطہ قائم کریں جو بہر حال مسلمان تھے حضرت مجدد صاحب کو اپنی گہری واقفیت اور خداداد ذہانت سے معلوم تھا کہ دور اکبری کے مخالفِ اسلام منصوبہ میں وہ شریک نہیں تھے، وہ اکبر کے بہت سے اقدامات کو ناپسند کرتے تھے، لیکن مجبور تھے، ان میں متعدد اسلام کی محبت اور دین کی حمیت سے بھی خالی نہ تھے، ان میں سے کئی ان کے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ اور خود ان سے اگر ارادت کا نہیں تو محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے تھے، وہ حضرت مجدد کے اخلاص و بے غرضی اور اسلام کے لئے دلسوزی اور دردمندی سے واقف تھے، ان میں حسب ذیل حضرات ممتاز تھے، نواب سید مرتضیٰ عرف شیخ فرید (م ۱۰۲۵ھ) خان اعظم مرزا کوکہ (م ۱۰۳۳ھ) خان جہاں لودھی (م ۱۰۴۰ھ) صدر جہاں پہانوی (م ۱۰۲۷ھ) لالہ بیگ جہانگیری۔

ہرچہ از دل برخیزد بر دل ریزد

مجدد صاحب نے انھیں امرائے کبار اور ارکان سلطنت کو اپنا مخاطب بنایا،

[1] لیکن یہ روایت اس لئے قابل قبول نہیں کہ حضرت مجدد کی ۱۰۳۴ھ میں وفات ہوئی۔

ان سے مراسلت کا سلسلہ شروع کیا اور صفحۂ قرطاس پر اپنے دل کے ٹکڑے اتار کر رکھ دیئے، یہ خطوط اپنے درد و اخلاص، جوش و تاثیر، زورِ قلم اور قوت انشاء کے لحاظ سے ان خطوط و مکاتیب کے مجموعہ میں جو دنیا کی کسی زبان میں اور کسی دینی اصلاح و تحریک کی تاریخ میں سپردِ قلم کئے گئے ہیں، خاص امتیاز رکھتے ہیں، اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی آج بھی ان میں اثر و دلآویزی پائی جاتی ہے[1]، اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مکتوب الیہم کے دلوں پر کیا اثر ڈالا ہوگا، حقیقت میں یہی خطوط مجدد صاحب کی دعوت و تبلیغ کے قاصد، ان کے زخمی دل کے صحیح ترجمان، ان کے قطرات اشک اور ان کے لختہائے جگر ہیں، اور دسویں صدی میں ہندوستان کی عظیم سلطنت مغلیہ میں جو عظیم انقلاب رونما ہوا اس میں ان کا بنیادی حصہ اور سب سے بڑا دخل ہے۔

امرائے سلطنت کے نام تحریضی و دعوتی خطوط

ان تحریضی و دعوتی خطوط کی ایک بڑی تعداد نواب سید فرید[2] کے نام ہے جو ارکانِ سلطنت

[1] مکتوبات کے ادبی پایہ اور حیثیت کے متعلق مصنف کا وہ تبصرہ دوبارہ پڑھ لیا جائے جو اس نے "تاریخ دعوت و عزیمت" کے حصہ سوم میں حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات صدی اور مکتوبات امام ربانی کے ذیل میں لکھا ہے، ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ سوم ص ۲۴۰-۲۴۵

[2] امیر کبیر نواب مرتضیٰ ابن احمد بخاری معروف بسید فرید کی شخصیت عجیب جامع کمالات و مختلف الجہات تھی، سیاست و انتظام، سخاوت و کرم، تواضع و اخلاق، دین و اہل دین سے محبت اور عالی ہمتی اور بلند نظری کا عجیب نمونہ، عہد اکبری ہی میں میر بخشی گری کے عہدہ تک پہونچ گئے تھے، جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو ان کے منصب میں اضافہ کیا اور صاحب سیف و قلم اور مرتضیٰ خاں کا لقب دیا اور پہلے گجرات کا پھر پنجاب کا صوبیدار بنایا (باقی صفحہ ۳۱۶ پر)

اور صوبیداران مملکت میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اور اکبر کے عہد سلطنت سے سلطنت کے مقرب و معتمد علیہ تھے حضرت خواجہ باقی باللہ سے عقیدت و تعلق رکھتے تھے، ان کی سیادت اور دینی حمیت سے حضرت مجدد نے فائدہ اٹھا کر اور اس کا واسطہ دے کر ان کو اپنا فرض دینی و خاندانی ادا کرنے پر آمادہ کیا اور یہ کہ وہ جہانگیر کو نیک مشورہ دے کر سلطنت کا رخ اکبر کے ڈالے ہوئے راستے پر چلتے رہنے اور اسلام کے تقاضوں سے چشم پوشی اور بے تعلقی، اسلام اور مسلمانوں کی کسمپرسی سے حمایت دین اور شعائر و احکام اسلام کے احترام کی طرف موڑنے کی کوشش کریں۔

افسوس ہے کہ ان مکاتیب پر تاریخ کا اندراج نہیں ہے، ورنہ حکمت دعوت اور تدریجی ارتقاء کے کئی اہم گوشے سامنے آتے اور معلوم ہوتا کہ آپ نے کس طرح اپنے مکتوب الیہ اور مکتوب الیہ نے کس طرح بادشاہ کو پھر بادشاہ نے کس طرح سلطنت کے رخ کو حمایت اسلام کے راستہ پر ڈالا، اور پچھلی حکومت کے اثرات کس طرح بتدریج مضمحل ہونے اور ان کی جگہ اسلام دوستی اور اسلام شناسی نے لینا شروع کیا، ہم اپنے اندازہ کے مطابق ان خطوط کے اقتباسات کو کسی قدر ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

نواب سید فرید بخاری کے ایک مکتوب میں جو غالباً جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد جلد ہی

(باقی صفحہ ۳۰ کا) جس پر وہ مدۃ العمر فائز رہے، جود و سخا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، کبھی اپنے کپڑے تک اتار کر سائلوں کو دے دیتے تھے، بیواؤں متوکلین اور اہل حاجت کے روزینہ اور سالانہ مقرر کر رکھے تھے، یتیم بچوں پر ماں باپ کی طرح شفقت کرتے، شادی کے قابل غریب لڑکیوں کی شادی اور جہیز کا انتظام کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، ان کے دسترخوان پر ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے قریب روزانہ کھانا کھاتے، شہر فریدآباد انہی کے نام سے منسوب ہے، ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر ج ۵، مختصراً)۔

لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

اپنے آباء کرام اور خاص طور پر سید الکونین صلے اللہ علیہ وسلم کے جادۂ مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی دعا دینے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے، اگر دل صحیح و صالح ہے تو بدن بھی صحیح و صالح ہوگا، اور اگر وہ فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہوگا، بادشاہ کا صلاح عالم کا صلاح ہے اور اس کا فساد عالم کا فساد ہے۔

آپ کو خوب معلوم ہے کہ قرن ماضی (عہد اکبری) میں اہل اسلام کے سر پر سے کیا مصیبت گذر گئی، اس سے پہلے کی صدیوں میں غربت اسلام کے باوجود اہل اسلام کی ذلت و خواری اس سے زیادہ نہ ہوئی تھی، اس زمانہ میں زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے دین پر رہیں اور اہل کفر اپنے طریق پر "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" لیکن قرن ماضی میں اہل کفر غالب آکر برملا دار الاسلام میں احکام کفر کا اجراء کرتے تھے، اور مسلمان اسلام کے احکام کے اظہار سے بھی مجبور تھے، اگر کوئی ہمت بھی کرتا تھا تو موت کی سزا پاتا تھا" واویلاہ، وامصیبتاہ، واحزناہ، واحسرتاہ" محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے (جو محبوب رب العالمین ہیں) ماننے والے ذلیل و خوار تھے، اور آپ کے نبوت کا انکار کرنے والے باعزت و باعتبار مسلمان اپنے زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی نوحہ خوانی میں مصروف تھے، اور معاندین تمسخر و استہزاء کے ساتھ ان کے زخموں پر نمک پاشی کر رہے تھے، آفتاب ہدایت گمراہی کے پردہ میں مستور اور نور حق باطل کے حجابات میں مخفی اور روپوش تھا۔

آج جبکہ اسلام کے غلبہ و اقبال سے جو چیز مانع تھی، اس کے دور ہو جانے اور بادشاہ اسلام کے سریر آرائے سلطنت ہونے کا مژدہ خاص و عام کے کانوں تک پہونچا ہے اہل اسلام

نے اپنی ذمہ ضروری سمجھا کہ وہ بادشاہ کے مدد و معاون بنیں اور شریعت کی ترویج اور ملت کی تقویت کا راستہ دکھائیں، یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے میسر آئے خواہ ہاتھ سے۔"

پھر چند سطروں کے بعد گذشتہ عہد کے مرض کی صحیح تشخیص کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"قرن ماضی میں جو مصیبت بھی سر پر آئی وہ علماء سوء کی جماعت کی نحوست سے پیش آئی، بادشاہوں کو یہی لوگ راہ راست سے ہٹا دیتے ہیں، ملت میں جو بہتّر فرقے بنے اور انھوں نے جو راہ ضلالت اختیار کی ان کے مقتدی یہی علماء سوء تھے، علماء میں سے کم ایسے گمراہ ہوں گے جن کی ضلالت دوسروں پر اثر کرے، اس زمانہ کے اکثر جہلائے صوفی نما بھی علمائے سوء کا اثر رکھتے ہیں، ان کا فساد بھی متعدی فساد ہے، اگر کوئی شخص اس کارِ خیر (اعانت دین) میں اعانت دین کی استطاعت رکھتا ہے، اگر اس میں کوتاہی سے کام لیتا ہے، اور کارخانۂ اسلام میں فتور واقع ہوتا ہے وہ کوتاہی کرنے والا بھی قابل شکایت ہوگا، اس بنا پر یہ حقیر قلیل البضاعت بھی چاہتا ہے کہ وہ سلطنت اسلام کی مدد کرنے والوں کے جرگہ میں شامل ہو اور اپنی بساط بھر ہاتھ پاؤں مارے کہ "من کثّر سواد قوم فهو منهم" کیا عجب ہے کہ اس بے استطاعت کو اس عالی جماعت میں شامل کرلے، وہ اپنی مثال اس ضعیفہ کی طرح سمجھتا ہے جس نے کچھ رسّیاں بٹ کر اپنے کو خریداران یوسف کے سلک میں منسلک کرنا چاہا تھا، امید ہے کہ جلد ہی یہ فقیر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا، آپ سے اس کی توقع ہے کہ چونکہ آپ کو بادشاہ کا قرب خاص حاصل ہے، اور ان باتوں کے گوش گذار کرنے کے مواقع میسر ہیں، خلوت و جلوت میں شریعت محمدی کی ترویج کی کوشش کریں گے اور مسلمانوں کو اس غربت و بیکسی سے نکالیں گے۔"[1]

[1] مکتوب ۴۷ دفتر اول۔

سید فرید کے نام ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس وقت غریب اہل اسلام جو اس گرداب میں گرفتار ہیں، نجات کی امید اہل بیت ہی کے سفینہ سے لگائے ہوئے ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، "مثل اهل بيتي كمثل سفينة نوح من ركبها نجا ومن تخلف عنها هلك"[1] ہمت عالی کو اس مقصد عالی پر مرکوز کردیں کہ یہ سعادت عظمیٰ ہاتھ آئے، اللہ کی عنایت سے ہر طرح کا جاہ و جلال اور عظمت و شوکت آپ کو میسّر ہے، اس شرف ذاتی (سیادت خاندانی) کے ساتھ اگر یہ سعادت بھی شامل ہوجائے تو سب سعادتمندوں سے بازی لے جائیں، یہ حقیر اسی طرح کی باتوں کے عرض معروض کے لئے جن کا مقصد تائید و ترویج شریعت ہے آپ کی خدمت میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"[2]

ایک تیسرے مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"سیادت پناہا مکرما! آج کے دن اسلام بڑا بیکس اور غریب الوطن ہے، ایک پیسہ بھی جو اس وقت اسلام کی تقویت میں صرف کیا جائیگا، کروڑوں میں خریدا جائے گا، دیکھنا چاہیئے کہ کون شہباز ہے، جس کو اس دولت عظمیٰ سے مشرف فرمائیں گے، ترویج دین و تقویتِ ملّت کا کام جس زمانہ میں جس شخص سے بھی وقوع میں آئے مستحسن ہے اور خوشنما، لیکن اس وقت ... اسلام غریب الوطن ہے، اور آپ جیسے سادات سے زیبا تر و رعنا تر ہے کہ یہ دولت آپ کے خاندان کے لئے خانہ زاد ہے، آپ کے لئے وہ بالذات ہے، اور دوسروں کے لئے بالواسطہ، اس سعادت کے حصول میں اپنے جد امجد کا وارث ہونا بڑی قیمت رکھتا ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے ایک مرتبہ فرمایا کہ تم ایسے زمانہ

[1] مشکوٰۃ عن ابی ذرؓ از مسند احمد [2] مکتوب ۵۱ دفتر اول۔

میں ہو کہ اوامر و نواہی کا دسواں حصہ چھوڑ دو تو ہلاک ہو جاؤ، تمہارے بعد ایک گروہ ایسا آئے گا کہ اگر اوامر و نواہی کے دسویں حصہ پر عمل کریں گے تو نجات پائیں گے، یہ وقت وہی وقت ہے اور یہ گروہ وہی گروہ ہے

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند

کس بہ میداں درنمی آید سواراں راچہ شد"

سید فرید کے بعد حضرت مجدد کی نظر انتخاب سلطنت مغلیہ کے دوسرے رکن رکین خان اعظم[1] پر پڑی جو شاہی خاندان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے، جہانگیر کو بھی ان کی اہمیت وقدر و منزلت کا احساس تھا، مشائخ نقشبندیہ سے بھی ان کو عقیدت و محبت تھی، جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ہی غالباً حضرت مجدد نے ان کو مکتوب ذیل تحریر فرمایا ہے:۔

"أيدكم الله سبحانه ونصركم على أعداء الإسلام في إعلاء الإسلام" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث "الاسلام بدأ غريبًا وسيعود كما بدأ فطوبى للغرباء" (اسلام کا آغاز مسافرانہ بیکسی سے ہوا، اور پھر وہ اسی مسافرانہ بیکسی کو پہونچ جائے گا تو مبارک ہو

---

[1] مرزا عزیز الدین نام اکبر کے رضاعی بھائی ہونے کی وجہ سے کوکا خطاب تھا، غزنی پھر دہلی وطن تھا، ۹۸۰ھ میں گجرات کے صوبیدار تھے ان کو محمد حسین مرزا کے محاصرہ سے چھڑانے کے لئے اکبر نے آگرہ سے احمد آباد ایک ہزار چار سو میل کا سفر نو دن میں کیا، گجرات کے بعد بنگال و بہار کے صوبیدار ہوئے خان اعظم خطاب ملا، دوبارہ ۹۹۷ھ میں گجرات کی صوبیداری ملی، اس قرب و اختصاص کے باوجود اکبر کے غیر شرعی امور پر صاف صاف نکیر کرتے تھے، اس کے باوجود مہر شاہی مہر اوزک ان کے سپرد کی گئی، اور ان کو وکیل مطلق کا عہدہ دیا گیا، جہانگیر نے بھی اہم مناصب حکومت سپرد کئے اور گجرات کی صوبیداری عطا کی، ۱۰۳۳ھ میں انتقال کیا (نزہۃ الخواطر مختصراً)۔

ان لوگوں کو جو اس کے شریک حال ہوں) اسلام کی بیکسی اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ کفار برملا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں، اور بے تکلف احکام کفر کے اجراء اور کوچہ و بازار میں اس کی مدح وثنا سے نہیں شرماتے اس کے مقابلہ میں مسلمان احکام اسلام کے اجراء سے مجبور اور اگر ان پر عمل کر لیتے ہیں تو مذموم و مطعون ہوتے ہیں ے

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"آج کے دن جناب کی ہستی کو ہم مغتنم سمجھتے ہیں اور ہاری ہوئی بازی میں آپ کے سوا کسی کو مرد میدان نہیں پاتے، اللہ آپ کا مؤید و ناصر ہو "بحرمة النبي وآله الأمجاد عليه وعليهم الصلوات والتحيات والتسليمات والبركات" حدیث میں آتا ہے "لن يؤمن احدكم حتى يقال انه مجنون" اس وقت وہ جنون جس کا مبنیٰ فرط غیرت اسلام ہے آپ ہی کی طبیعت میں محسوس ہوتا ہے "الحمد لله سبحانه على ذلك" آج کا دن وہ دن ہے کہ عمل قلیل کو اجر جزیل کے بدلہ میں بڑی قدر کے ساتھ قبول فرماتے ہیں، اصحاب کہف سے سوائے عمل ہجرت کے کوئی اور نمایاں عمل ثابت نہیں، جس کو اتنی اہمیت دی جائے، دشمنوں کے غلبہ کے وقت اگر وفادار سپاہی تھوڑی سی مستعدی دکھائیں تو بڑی عزت پاتے ہیں، بخلاف اس وقت کہ جب امن کا زمانہ ہوتا ہے اور دشمن اپنی جگہ پر ہوتے ہیں، جہاد قولی کا یہ موقع جو آج آپ کو میسر ہے، جہاد اکبر ہے، اس کو غنیمت سمجھئے اور "هل من مزيد" کہئے، اس جہادِ لسان کو جہاد سیف و سنان سے بھی اس وقت افضل سمجھیں، ہم فقیر لوگ بے دست و پا اس دولت سے محروم ہیں۔

هنیئاً لأرباب النعیم نعیمها — وللعاشق المسکین ما یتجرع

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں — گر ما نہ رسیدیم تو شاید برسی"

پھر چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"سلطنت سابقہ میں دین مصطفوی کے ساتھ جو عناد نظر آتا تھا، ظاہراً اس سلطنت میں وہ عناد نہیں ہے، اگر ہے بھی تو لاعلمی کی وجہ سے ہے، اندیشہ ہے کہ کہیں یہاں بھی معاملہ اس عناد تک پہونچ جائے اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے۔ ع

جو بید بر سر ایمان خویش می لرزم"[1]

دربار جہانگیری کے ایک دوسرے اعلیٰ عہدہ دار خانِ جہاں[2] کے نام یہی مضمون مختصراً لکھتے ہیں:۔

"آپ جس خدمت پر فائز ہیں، اگر اس کو شریعت مصطفوی پر عمل کرنے کے ساتھ جمع کرلیں تو انبیاء علیہم السلام والاکام کریں گے علیہم الصلوات والتسلیمات، اور دین متین کو منور و معمور کر دیں گے ہم فقیر اگر سالہا سال جان کھپائیں تو اس عمل میں آپ جیسے شہبازوں کے گرد کو نہیں پہونچ سکتے ؎

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند

کس بمیداں در نمی آید سواراں را چہ شد"[3]

---

[1] مکتوب ۶۵ دفتر اول [2] امیر کبیر خانِ جہاں ابن دولت خاں لودھی، جہانگیر کو ان پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان سے بڑی محبت کرتا تھا، بڑے علم دوست اور علماء پرور تھے، عام لوگوں سے بھی اچھا سلوک تھا، شاہجہاں کے عہد میں بغاوت کی اور ۱۰۴۰ھ میں قتل کرا دیئے گئے (نزہۃ الخواطر ج ۵)۔

[3] مکتوب ۵۴ دفتر سوم۔

ایک دوسرے مفصل مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"وہ دولت جس سے حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے آپ کو سرفراز فرمایا ہے، اور لوگ اس کی قدر و قیمت سے ناواقف (اور اندیشہ ہے کہ آپ بھی اس سے پورے طور پر آگاہ نہ ہوں) ہیں یہ ہے کہ بادشاہ وقت سات پشت سے مسلمان چلا آرہا ہے، وہ اہل سنت میں سے ہے، اور حنفی المذہب ہے، اگرچہ چند سال سے اس زمانہ میں کہ قرب قیامت ہے، اور عہد نبوت سے بُعد ہو چکا ہے، بعض لکھے پڑھے لوگوں نے طمع کی نحوست سے جو خرابیٔ باطن کا نتیجہ ہے، حکام و سلاطین سے تقرب حاصل کر کے ان کی خوشامد میں آکر دین متین میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں، اور سادہ لوح لوگوں کو راستہ سے ہٹا دیا ہے، جہانگیر جیسا بادشاہ عظیم الشان جب آپ کی بات غور و التفات کے ساتھ سنتا ہے، اور اس کو وقعت دیتا ہے تو کیسا نادر موقع ہے کہ آپ صراحتاً یا اشارۃً کلمۂ حق (کلمۂ اسلام) کو جو اہل سنت والجماعت کے اعتقاد کے مطابق ہے (شکر اللہ تعالیٰ سعیھم) گوش گذار کر دیں، اور جس قدر گنجائش سمجھیں اہل حق کی باتوں کو پیش کرتے رہیں بلکہ برابر اس بات کے جویا اور نگراں رہیں کہ کوئی ایسی تقریب پیدا ہو کہ مذہب و ملت کی بات درمیان میں آئے تاکہ اسلام کی حقانیت اور کفر کے بطلان و شناعت کے اظہار کا موقع ملے"[1]

ان ارکان سلطنت کے علاوہ آپ نے ایک دوسرے عہدہ دار سلطنت لالہ بیگ کو بھی اسی مضمون کے خط لکھے جو اکبر بادشاہ کے لڑکے سلطان مراد کے بخشی تھے، اور بہار کے گورنر بھی رہے تھے، تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] مکتوب ۴۷ دفتر دوم۔

اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ بلاد اسلام میں اہل کفر محض احکام کفر کے اجراء پر راضی نہیں ہوتے، چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکلیہ زائل ہوجائیں، اور مسلمانوں اور مسلمانی کا کوئی اثر باقی نہ رہے، معاملہ کو اس سرحد تک پہونچا دیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی اسلامی شعار (مثلاً ذبح بقر) کا اظہار کرتا ہے تو قتل کی سزا کو پہونچ جاتا ہے۔"[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"ابتدائے بادشاہت میں اگر مسلمانی رواج پا جائے اور مسلمان کچھ عزت پیدا کرلیں فبہا، اور اگر عیاذاً باللہ سبحانہ اس معاملہ میں توقف ہوا تو معاملہ مسلمانوں کے لئے بہت مشکل ہوجائے گا "الغیاث الغیاث ثم الغیاث الغیاث" دیکھئے کون صاحبِ اقبال اس سعادت سے سرفراز ہوتا ہے، اور کون ساشہباز اس دولت کو حاصل کرتا ہے" ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔"[1]

سلطنت جہانگیری کے ایک اور امیر صدر جہاں تھے[2] ان کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے :۔

"یقین ہے کہ مقتدائے اسلام، سادات عظام، علمائے کرام ..... خفیہ و علانیہ دین متین کی ترقی و تقویت اور اس صراط مستقیم کی تکمیل میں مشغول ہوں گے، یہ بے سروسامان اس معاملہ میں کیا درازنفسی سے کام لے۔"[3]

---

[1] مکتوب ۸۱ دفتر اول [2] مفتی صدرجہاں پیہانی (حال ضلع ہردوئی) کے رہنے والے تھے، علوم عربیت میں خاص امتیاز رکھتے تھے، پہلے لشکر شاہی میں مفتی مقرر ہوئے، پھر صدارت کے عہدہ پر ان کا انتخاب ہوا، جہانگیر کو ان سے تلمذ حاصل تھا، اور اس نے چہل حدیث ان سے حفظ کی تھی، جہانگیر نے چارہزاری (۴۰۰۰) منصب اور وسیع جاگیر عطا کی تھی، ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر پائی اخیر تک باوجود ہوش و حواس سلامت تھے، ۱۰۲۷ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر ج ۵) [3] مکتوب ۱۹۴ دفتر اول۔

گذشتہ غلطی کا اعادہ نہ کیا جائے

آخر وہ مبارک وقت آگیا کہ جہانگیر کو غلطی کا احساس ہوا اور اس نے (اپنی حکومت وانتظام کے عام اصول کے مطابق) یہ چاہا کہ علماء کی ایک جماعت دینی امور میں مشورہ دینے اور غلطیوں سے بچانے کے لئے دربار میں موجود رہے اس نے دیندار ارکان سلطنت سے فرمائش کی کہ چار دیندار علماء کو تلاش کرکے دربار میں ہروقت حاضر رہنے پر آمادہ کردیں، جو مسائل شرعیہ کی وضاحت کریں، اور ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی رہے، مجدد صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے فراستِ صادقہ اور اعلیٰ دینی بصیرت عطا فرمائی تھی، اور سابق سلطنت کے انحراف کی تاریخ اور اس کے اسباب پر ان کی گہری نظر تھی، یہ اطلاع سن کر بجائے مسرور ہونے کے فکرمند اور پریشان ہوگئے، اور انھوں نے ایک خط شیخ فرید کو اور ایک خط نواب صدر جہاں کو اس مضمون کا لکھا کہ :۔

"خدارا ... ایسی غلطی نہ کریں، بجائے متعدد علمائے ظاہر کے ایک مخلص، بے لوث عالم ربانی کا انتخاب کریں۔"

شیخ فرید کے نام مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ثبتکم اللہ سبحانہ علی جادۃ آباء کم الکرام۔ سنا گیا ہے کہ بادشاہ اسلام نے اپنے حسن فطرت اور اسلامیت کی بنا پر جو اس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے آپ سے فرمایا ہے کہ چار علمائے دیندار کی خدمات حاصل کریں جو دربار میں رہیں، اور مسائل شرعیہ کو بیان کریں تاکہ بادشاہ کا کوئی حکم یا عمل خلاف شرع واقع نہ ہو" الحمد للہ سبحانہ علی ذٰلک" مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر کیا خوشخبری اور ماتم زدوں کے لئے اس سے

بہتر کیا نوید مسرت ہوسکتی ہے، لیکن یہ فقیر ضرورتاً اور مجبوراً اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنا
چاہتا ہے امید ہے کہ معذور قرار دیں گے کہ صاحب الغرض مجنون۔

عرض یہ ہے کہ ایسے علماء دیندار اول تو خود ہی اقل قلیل ہیں، جو حب جاہ وحُبِّ
اقتدار سے بلند ہو چکے ہوں اور ترویج شریعت اور تائید ملت کے سوا کوئی غرض نہ رکھتے
ہوں، اگر حُبِّ جاہ کی بنا پر ان علماء میں سے کوئی ایک پہلو اختیار کرے گا اور اپنی فضیلت
وبرتری کا اظہار کریگا، اختلافی مسائل درمیان میں لائے گا اور اس کے ذریعہ سے بادشاہ
کا قرب اور اس کے یہاں امتیاز واعزاز حاصل کرنا چاہے گا، لامحالہ دین کا کام ابتر ہوگا،
قرن سابق میں علماء کے اختلافات ہی نے عالم کو مصیبت میں ڈال دیا تھا، اور اب پھر وہی
خطرہ درپیش ہے، ترویج دین کا کیا ذکر یہ امر تخریب دین کا باعث ہوگا،" العیاذ باللہ
سبحانہ من ذلک ومن فتنۃ العلماء السوء" (اگر بجائے ان چار کے) ایک عالم کا اس
مقصد کے لئے انتخاب کیا جائے تو بہتر ہوگا، اگر وہ علمائے آخرت میں سے ہوگا تو کیا کہنا
کہ اس کی صحبت کبریتِ احمر ہے، اور اگر علمائے آخرت میں سے کوئی نہ ملے تو اس طبقہ علماء
میں سے بہتر سے بہتر آدمی کا انتخاب کیا جائے کہ "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھا جائے، جیسے کہ خلائق کی خلاصی علماء کے ساتھ وابستہ
ہے، عالم کا نقصان بھی انہی کے ساتھ مربوط ہے، علماء میں جو بہترین ہیں، وہ عالم میں بہترین
ہیں اور جو ان میں بدترین ہیں وہ مخلوقات میں بدترین ہیں، ہدایت واضلال کو اسی گروہ
کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے، کسی بزرگ نے ابلیس لعین کو دیکھا کہ فارغ وبیکار بیٹھا ہوا
ہے، انھوں نے اس کا سبب پوچھا کہنے لگا کہ اس وقت کے علماء ہمارا کام کر رہے ہیں،

اور اغواء واضلال کا کام کر رہے ہیں ؎

عالم کہ کامرانی وتن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

عرض کہ اس معاملہ میں پورے غور وتأمل اور فکر صحیح سے کام لے کر قدم اٹھائیں جب معاملہ
ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا مجھے شرم آتی ہے کہ ایسی باتیں زیرک و
دانا (جیسے کہ آپ ہیں) حضرات کے سامنے کی جائیں، لیکن اس کو اپنے لئے وسیلۂ سعادت
سمجھ کر باعث تصدیع ہوا۔[1]

عقیدتمند ارکان سلطنت اور ان سے خط وکتابت

ان مکتوب الیہم کے علاوہ جن کے نام کے مکاتیب میں حضرت مجددؒ اسلام کی غربت
وبیکسی، احکام وشعائر اسلام کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی مجبوری پر خون کے آنسو روئے ہیں
اور ان کو اپنے قرب واعتماد، خدمات جلیلہ اور منصب وعہدہ کے اثر سے کام لیتے ہوئے،
بادشاہ کو صورت حال کی طرف متوجہ کرنے اور اس کی موروثی وخاندانی رگ اسلامیت
کو حرکت میں لانے کی کوشش کی طرف توجہ دلائی ہے کچھ امرائے کبار اور ارکین سلطنت
کے نام آپ کے مکاتیب کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اصلاحی وتربیتی ہیں، اور جن میں سلوک و
تصوف کے بعض غوامض کو حل فرمایا گیا ہے، دنیائے دنی کی طرف سے بے رغبتی اور
نعیم اخروی اور ترقیات باطنی کے حصول کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، یہ خطوط امیر الامراء
عبدالرحیم خانِ خاناں (م ۱۰۳۶ھ) قلیج خاں اندجانی اکبری (م ۱۰۲۳ھ) خواجہ جہاں

[1] مکتوب ۵۳ دفتر اول، صدر جہاں کے نام مکتوب ۱۹۴ دفتر اول میں بھی اسی مضمون کو مختصراً تحریر فرمایا ہے۔

(م ۱۰۲۹ھ)، مرزا داراب ابن خان خاناں جہانگیری (م ۱۰۳۴ھ) اور شرف الدین حسین بدخشی کے نام ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان امراء کبار کو حضرت سے گہری عقیدت و محبت تھی، یہ خطوط ایسے ہی ہیں جیسے ایک شیخ اپنے زیرِ تربیت مریدین کو لکھتا ہے' ان کی لغزشوں پر متنبہ بھی کرتا ہے' ان کو وعظ و نصیحت بھی کرتا ہے' اور ان کی دینی ترقی اور روحانی استعداد و مناسبت پر خوشی کا اظہار بھی کرتا ہے' اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوی تعلق اور گہری عقیدت کے بعد ان امرائے کبار نے حضرت مجدد کے اصلاح سلطنت کے منشاء کے مطابق بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنے اور اسلام کی خیر خواہی اور ہمدردی میں کوئی کوتاہی نہ کی ہوگی اور انھوں نے اس کام میں اپنے مخدوم و شیخ کی تمنا پوری کرنے اور دوسرے امراء سلطنت کے ساتھ (جن کو آپ نے اس مقصد عظیم کے لئے خطوط لکھے تھے) تعاون کرنے سے دریغ نہ کیا ہوگا۔

اصلاح حال میں حضرت مجدد کا ذاتی اثر اور فیض

ابھی تک جو کچھ تفصیل بیان کی گئی اس کا تعلق حضرت مجدد کی بالواسطہ کوششوں سے تھا، یعنی انھوں نے امرائے کبار اور ارکان سلطنت کو دین کی نصرت و حمایت' بادشاہ کو احترام دین و شریعت اور اصلاح حال پر اپنے مکاتیب کے ذریعہ جن میں حمیت اسلامی کی بجلیاں کوندتی نظر آتی ہیں، کس طرح پے در پے خطوط لکھے اور ان سے اس مقصد کی تکمیل میں کس طرح کام لیا، یہ سعی یقیناً رائیگاں نہیں گئی' اور ان مکتوب الیہم نے اور خاص طور پر نواب سید فرید نے حکومت کا رخ بدلنے میں بنیادی و مرکزی کردار ادا کیا۔

لیکن ابھی فرمانروائے سلطنت جہانگیر کے مزاج و طبیعت میں وہ تبدیلی نہیں پیدا

ہوئی تھی جس کی اس عظیم الشان اور دشوار کام کے لئے ضرورت تھی' شخصی و موروثی سلطنتوں میں بادشاہ کی ذات وہ مرکزی نقطہ ہوتی ہے جس کے گرد حکومت کا سارا نظام گردش کرتا ہے' اس کا کسی بات کے لئے ارادہ کر لینا اور اس کے ذہن کا کسی امر کو قبول کر لینا خدا کے کسی مخلص اور بے لوث بندے سے اس کے دل میں عقیدت و محبت کا پیدا ہو جانا اور اس کے اخلاص پر اعتماد کر لینا ہزاروں میل کے فاصلہ کو گھنٹوں اور منٹوں میں طے کرا دیتا ہے، اور بعض اوقات بظاہر ناممکن العمل چیز کو نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بنا دیتا ہے' ابھی تک جہانگیر حضرت مجدد کے روحانی و علمی مقام سے ناآشنا تھا' وہ ان اہل علم و اہل مشیخت میں نہیں تھے' جو درباروں میں آتے جاتے ہیں، اب اس کی کیا صورت تھی کہ جہانگیر کو براہ راست ان سے واسطہ پڑے' وہ ان کے علو مقام سے (اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق) واقف ہو، حکمت الٰہی نے اس کا بھی عجیب و غریب طریقہ پر انتظام کیا' جو عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو) کی تفسیر ہے۔

جہانگیر کا تأثر

باب سوم میں قارئین قلعہ گوالیار کی اسیری اور لشکر شاہی کی نظر بندی کی داستان پڑھ چکے ہیں، لشکر شاہی کے ساتھ حضرت مجدد ۳½ سال تک رہے[1]، بادشاہ سے صحبتیں رہیں، مسائل دینیہ پر مذاکرہ و گفتگو رہی' بادشاہ نے حضرت مجدد کی دینی صلابت اور

[1] قلعہ گوالیار سے رہائی جمادی الثانی ۱۰۲۹ھ میں ہوئی تھی' اور لشکر شاہی سے رخصتی ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ میں ہوئی اس طرح ساڑھے تین سال بنتے ہیں۔

استقامت کا نمونہ سجدۂ تعظیمی اور آداب شاہی سے انکار اور گوالیار کی اسیری میں پوری خودداری اور عزت نفس کے ساتھ رہنے اور معافی نہ مانگنے کی شکل میں دیکھا حضرت مجدد کے روحانی فیوض و برکات اور ان کی صحبت کی تاثیر کو سیکڑوں غیر مسلموں کے قبول اسلام کی شکل میں دیکھا، پھر لشکر شاہی کی طویل رفاقت میں ان کے زہد و استغناء اور ان کی عبادت و معمولات کی پابندی کو بھی دیکھا، مجلس کی گفتگو میں ان کے رسوخ فی العلم کا بھی تجربہ کیا اور یقیناً وہ ایک سلیم الطبع، ذہین اور ہوشمند فرمانروائے سلطنت کی حیثیت سے جس کو امراء و علماء و مشائخ، دنیاداروں اور دینداروں کی ایک بڑی تعداد کے حالات کا اپنے والد اکبر کے دور سے اس وقت تک مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا، اور اس سے اس میں مردم شناسی کی وہ صلاحیت پیدا ہوگئی تھی جو ان لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتی جن کو کھرے اور کھوٹے کے پرکھنے کا اتنا طویل موقع نہیں ملتا، مجدد صاحب کے متعلق ضرور سمجھ گیا ہوگا کہ وہ ان لوگوں سے بہت مختلف ہیں جو ابھی تک دربار کی زینت یا بوریائے فقر کے مسند نشین تھے۔

واقعہ ذیل میں جو جہانگیر نے خود تفصیل اور ایک حد تک شکر و فخر کے اظہار کے ساتھ لکھا ہے حضرت مجدد کی صحبت و جذبات کا اثر صاف جھلکتا ہے جہانگیر کے اس اقدام کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اگر یہ واقعہ سامنے رکھا جائے کہ یہ قلعہ آزمودہ کار مسلمان سپہ سالاروں کے بجائے راجہ بکرماجیت کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔

جہانگیر لکھتا ہے:۔

بتاریخ بست و چہارم ماہ مذکور متوجہ سیر قلعہ کانگڑہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علماء اسلام در رکاب بودہ آنچہ شعار اسلام و شرائط دین محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آرند بالجملہ قریب یک کروہ

ماہ مذکور (دی ماہ) کی ۲۴ تاریخ[1] کو قلعہ کانگڑہ کی سیر کے ارادہ سے نکلا، میں نے حکم دیا کہ قاضی و میر عدل اور دیگر علمائے اسلام ہمرکاب ہوں جو اسلامی شعائر اور دین محمدی کے شرائط ہیں وہ اس قلعہ مذکور میں عمل میں لائیں مختصراً

[1] مطابق یکم ربیع الاول ۱۰۳۰ھ

طی نمودہ بر فراز قلعہ بر آمدہ شد بتوفیق ایزد سبحان بانگ نماز و خواندن خطبہ و کشتن گاؤ وغیرہ کہ از ابتدائے بناء ایں قلعہ تا حال نشدہ بود ہمہ را در حضور خود بعمل آوردم سجدات شکر ایں موہبت عظمی کہ ہیچ بادشاہی توفیق بر آں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ حکم فرمودم کہ مسجد عالی درون قلعہ بنا نہند۔[1]

ایک کوس کی مسافت طے کر کے قلعہ کی بلندی پر پہونچا توفیق الٰہی سے اپنی موجودگی میں اذان دلوائی خطبہ پڑھا گیا اور ذبیحہ گاؤ جس پر اس قلعہ کی تعمیر کے وقت سے کبھی عمل نہیں ہوا تھا اپنے سامنے عمل کرایا اس انعام الٰہی پر کہ کسی بادشاہ کو بھی اس کی توفیق نہیں ہوئی تھی شکر کے سجدے بجا لایا میں نے حکم دیا کہ ایک بلند و بالا مسجد قلعہ کے اندر تعمیر کی جائے۔

اس بالواسطہ اور بلاواسطہ کوشش سے اولاً سلطنت کا رخ اسلام کی طرف سے تغافل بلکہ تجاہل (اور اس سے آگے بڑھ کر مخالفت) سے ہٹ کر اسلام کے احترام اور شعائر اسلام کی بلندی اور بادشاہ اسلام کی اسلام سے دلچسپی کی طرف تبدیل ہوا، جس کا سلسلہ جہانگیر کے آخری دور سے شروع ہو کر صاحبقران ثانی شاہجہاں کے عہد سلطنت پر سایہ فگن ہوا۔

شاہجہاں کا دور

صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی (۱۰۳۷ھ ۱۰۶۸ھ) کا دور جس کا عہد سلطنت ۱۰۳۶ھ سے شروع ہو کر بڑی شان و شوکت کے ساتھ ۳۱ سال رہا اور جو حضرت مجدد کی وفات کے دو سال بعد تخت سلطنت پر بیٹھا ایک غیر محسوس تدریجی اصلاح و بہتری کا دور تھا، شاہجہاں کے متعلق اس بات کا کوئی قابل اعتماد تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ وہ حضرت مجدد یا ان کے فرزند ارجمند خواجہ محمد معصوم سے باقاعدہ بیعت و ارادت کا تعلق رکھتا تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے دل میں ہمیشہ حضرت مجدد کے لئے نرم گوشہ اور احترام و اخلاص رہا چنانچہ جب حضرت مجدد نے بادشاہ کی طلبی پر دربار میں آنے کا ارادہ کیا، اور یہ معلوم تھا کہ حضرت مجدد سجدۂ تعظیمی اور دربار کے آداب قبول نہیں کریں گے،

[1] تزک جہانگیری جشن شانزدھمیں نوروز، صفحہ ۳۴۲

تو شاہجہاں نے افضل خاں اور مفتی عبدالرحمٰن کو (جو شاہزادہ کے مصاحبین و متوسلین میں تھے) بعض کتب فقہیہ کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ "سجدۂ تعظیمی سلاطین کے لئے جائز ہے، اور فقہاء نے خاص حالات میں اس کی اجازت دی ہے، اگر آپ ملاقات کے وقت بادشاہ کے لئے یہ آداب بجالائیں تو میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا" حضرت مجدد نے اس کو قبول نہیں کیا، اور فرمایا کہ یہ رخصت ہے، عزیمت یہی ہے کہ غیر اللہ کو کسی حال میں سجدہ نہ کیا جائے[1]۔

شاہجہاں کے متعلق مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ ایک نیک دل بادشاہ شریعت کا احترام کرنے والا، عظیم مساجد کی تعمیر کا خاص شوق رکھنے والا، اور اپنی ذات سے فرائض شرعی کا پابند تھا، علماء اور صلحاء کو اپنے قریب رکھتا تھا، اور ان پر اعتماد کرتا تھا، اس کے وزیر باتدبیر جملۃ الملک سعد اللہ خاں علامی (م ۱۰۶۶ھ) اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم اور صاحبِ درس تھے[2]، اس ذاتی دینداری و خداترسی کے ساتھ (جو ایک وسیع سلطنت رکھنے والے خود مختار بادشاہ کی زندگی میں غنیمت سمجھی جانی چاہئے) شاہجہاں نے عہد پیشیں کی بعض خلاف شرع رسوم و آداب کو بھی بند کیا، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب فارسی کی معاصر تاریخوں بادشاہ نامہ وغیرہ کے بیانات کی بنا پر لکھتے ہیں:۔

"جب شاہجہاں نے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو اس کو مراسم ملت مصطفوی اور شریعت محمدی کا جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا، ایسا پاس و لحاظ تھا کہ اول اس نے حکم دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا معبود حقیقی سزاوار ہے اب آئندہ کوئی دوسرے کے لئے اپنی پیشانی کو خاک مذلت پر نہ رکھے، مہابت خاں کے کہنے سے اس کی جگہ پر زمیں بوس مقرر کیا، مگر اس میں بھی سجدہ کے ساتھ مشابہت

---

[1] تفصیل کے لئے کتاب کا باب سوم ملاحظہ ہو۔ [2] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" جلد ۵

ہوتی تھی، اس کو بھی موقوف کر کے تسلیم چہارم مقرر کی[1]۔"

سر رچرڈ برن (SIR RICHARD BURN) لکھتا ہے کہ:۔

"شاہجہاں اسلامی عقائد کو سختی سے دوبارہ نافذ کرنا چاہتا تھا، لیکن دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے متعرض بھی نہیں ہونا چاہتا تھا، اس نے جلد ہی تخت شاہی کو سجدہ کرنے کی رسم دربار سے اٹھا دی ...... الٰہی سنہ بھی جسے اکبر نے رائج کیا تھا، اس کا سرکاری کاغذات اور سکوں پر استعمال شاہجہاں کی تخت نشینی کے چند سال بعد ختم ہوگیا، ...... ۱۶۳۴ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مناکحت جو پنجاب و کشمیر میں عام تھی، ممنوع قرار دے دی گئی[2]۔"

مولوی ذکاء اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

"سرکار خاصہ سے قاضی و معلم مقرر ہوئے کہ احکام شریعت و آداب عبادت کی تعلیم کریں...... شیخ محمود گجراتی مقرر ہوا کہ تحقیق و ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہنود کے تصرف سے نکالے اور ان کی عمارات و مساجد کو جدا کرے، اس نے حکم مذکور کے مطابق عمل کیا، کئی ایک مسجدوں کو جو ہنود کے زیر تصرف تھیں، ان کو جدا کیا اور ہنود سے جرمانہ لے کر ان کو تعمیر کرایا، جن ہنود نے قرآن شریف کی بے ادبی کی تھی، ان کو بعد ثبوت ...... عبرتناک سزا دی، پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام ولایت پنجاب میں جس جگہ یہ صورت ہوئی ہو اس کو مہمات شرعی کے متکفل تحقیق کریں[3]۔"

لیکن اس احترام شریعت اور قدرے دینی حمیت کے ساتھ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہجہاں اپنے متشرع، صاحبِ علم اور صاحبِ صلاحیت فرزند اورنگ زیب کے مقابلہ میں اپنے صلح کل، آزاد مشرب بڑے بیٹے داراشکوہ کو ترجیح دیتا تھا، اور اسی کو تخت و تاج کا وارث اور اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا، اور یہی شخصی و موروثی سلطنتوں اور "دین و سیاست کی تفریق"

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد ۷، صفحہ ۵۵-۵۶ باختصار [2] CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA VOL. IV P. 217
[3] تاریخ ہندوستان جلد ۷، صفحہ ۱۷۵-۱۷۶ باختصار۔

کے اصول پر کاربند فرمانروایانِ سلطنت کی وہ خصوصیت ہے، جہاں ان کی ذاتی دینداری امورِ سلطنت پر اثرانداز اور کسی غلط یا مضر جانشیں کے انتخاب میں مانع نہیں بنتی۔

شاہزادہ دارا شکوہ

عہد عالمگیری میں جو تاریخیں مرتب کی گئیں ہیں محض ان کے اعتماد پر ہم دارا شکوہ کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے نہ اس کے قطعی طور پر بے دین و بدعقیدہ ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں، اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تخت و تاج کے لئے بھائیوں کی یہ جنگ خالصتہً دو فلسفوں، دو طرق فکر اور دین و لادینیت کی جنگ تھی، لیکن غیر مسلم اور غیر جانبدار مؤرخوں کے بیانات سے بھی اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پردادا اکبر کے رنگ سے قریب تر اور وحدت ادیان کے نظریہ سے متاثر اور شریعت و ویدانت میں مطابقت ثابت کرنے کے لئے کوشاں تھا، فرانسیسی ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے کہ "یوزی صاحب فلیمش پادری کے مواعظ دینیہ کو بہت رغبت سے سنتا تھا، ہندو و مسلمان کو ایک مذہب کرنا چاہتا تھا" دائرۂ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول:۔

"وہ تصوف سے خاصی دلچسپی رکھتا تھا، اور ہندو فلسفہ کے زیر اثر تھا، اس نے مسلمان صوفیا اور ہندو سنیاسیوں سے گہرے تعلقات قائم کر لئے تھے ان میں (مسلمان صوفیوں ورعلماء کے ساتھ) سرمد، مشہور آزاد مشرب وجودی" اور بابا لال داس بیراگی، کبیر کا پیرو بھی تھا"

"دارا کی بعض متاخر تصانیف سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ نظریہ وحدۃ الوجود کا پیرو تھا، وہ ہندو فلسفہ اور صنمیات سے متاثر تھا جس کی وجہ سے وہ متعدد ایسے ملحدانہ خیالات کی طرف مائل ہو گیا جن کے واضح مماثل ہندو فلسفہ میں پائے جاتے ہیں، اور جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں .... دارا اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ویدانت اور تصوف جن کے ذریعہ "حق"

کا ادراک کرنا چاہئے، وہ باہم مخالف نہیں، فرق صرف لفظوں کا ہے" اوپنشدوں" کے ترجمہ میں جسے وہ "وحدت" کا سرچشمہ بیان کرتا تھا، دارا نے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندو مت کے پیروؤں کے مشترکہ نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی نیز اس نے یہ چاہا کہ ہندوؤں کے اعتقادات سے مسلمانوں کو شناسا کرائے"[1]

دارا کے ان افکار و خیالات، رجحانات و جذبات کی بنا پر جو اس وقت کے ہندوستانی مسلم معاشرے سے مخفی نہیں رہ سکتے تھے اور جس کا بیدار مغز شہزادے اورنگ زیب نے پورا فائدہ اٹھایا ہو گا، ذرا بھی محل استعجاب نہیں کہ ہندوستان کے دیندار حلقے علماء دین اور متبع شریعت شیوخ طریقت اور ان کے متبعین نے جو اکبر کے دور میں اسلام کی بے بسی و بے دخلی کا منظر دیکھ چکے تھے یا انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا، اس جنگ برادران میں دارا شکوہ کے مقابلہ میں حامئ اسلام، پابند مذہب و شریعت شاہزادہ اورنگ زیب کی نصرت و حمایت اور اپنی دعاؤں اور ترغیب و تحریض سے اس کی پوری مدد کی ہو۔[2]

اس کشمکش کا نتیجہ سب کو معلوم ہے کہ اورنگ زیب نے دارا شکوہ پر فتح پائی اور ۱۰۶۸ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوا اور پوری نصف صدی بڑے کروفر کے ساتھ حکومت کی۔

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر اور اس کی دینی حمیت و حمایت

اورنگ زیب عالمگیر نے (جس کو حضرت مجدد کے خاندان سے عقیدت اور ان کی

---

[1] مقالہ دارا شکوہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۹ مقالہ نگار (ستیش چندر [وادارہ]) نیز ملاحظہ ہو "AURANGZEB" از ظہیرالدین فاروقی ص۳۸-۴۷

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر محمد اسلم کا مقالہ "اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علماء و شائخ کا کردار" مشمولہ "تاریخی مقالات" از پروفیسر محمد اسلم ص۲۳۶-۲۴۳

دعوت و مسلک سے شروع سے مناسبت تھی) حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کرلیا تھا۔[1] اس بات کے متعدد شواہد و قرائن ہیں کہ بادشاہ کا تعلق حضرت خواجہ سے محض غائبانہ عقیدت اور عام نیازمندی کا نہ تھا، بلکہ اس نے باضابطہ اصلاح و تربیت کا تعلق بھی حضرت سے قائم کرلیا تھا، حضرت خواجہ محمد معصوم کی اورنگ زیب کی شہزادگی کے وقت سے اُس پر نظر خاص تھی، اور وہ اس کو شہزادۂ دین پناہ (جو ایک پیشین گوئی اور فال نیک تھی) کے لقب سے یاد فرماتے ہیں، حضرت خواجہ سیف الدین اپنے والد ماجد حضرت خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ (اورنگ زیب) دین پناہ را درخدمت حضرت اخلاص بہ نوع دیگر است، از ذکر لطائف و ذکر سلطانی گزشتہ بذکر نفی و اثبات مقید است، و ظاہر می سازد کہ بعضے اوقات خطرہ مطلقاً نمی آید و گاہے کہ می آید استقرار نمی کند ازیں راہ خیلے محفوظ است و می گوید کہ پیش ازیں من از ہجوم خواطر دلِ تنگ بودم و شکر ایں نعمت بجا می آرد"[2]

بادشاہ دین پناہ کا حضرت کے ساتھ اخلاص اور ہی طرح کا ہے، لطائف ستہ اور سلطان الاذکار کے ذکر سے گذر کر اس وقت نفی و اثبات کے ذکر کی منزل پر ہیں، ان کا بیان ہے کہ بعض اوقات وسوسہ مطلق نہیں آتا اور کبھی آتا بھی ہے تو اس کو استقرار نہیں ہوتا، وہ اِس چیز سے بہت محفوظ ہیں، فرماتے ہیں کہ اِس سے پہلے میں وساوس و خطرات کے ہجوم سے پریشان ہوجاتا تھا، وہ اس نعمت کا شکر بجالاتے ہیں۔

---

[1] مکتوبات سیفیہ مکتوب ۱۳ بنام صوفی سعد اللہ افغانی [2] ایضاً مکتوب ۲

خواجہ سیف الدین کے اس خط کے جواب میں حضرت خواجہ محمد معصوم نے جو مکتوب تحریر فرمایا، اس میں آپ نے خدا کا شکر ادا کیا ہے جس نے بادشاہ کو روحانی مراتب عطا فرمائے اِس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو فنائے قلبی کا مقام حاصل ہوچکا تھا، جو سلوک میں ایک بلند مقام ہے۔[1]

ابو الفتح "آداب عالمگیری" میں لکھتا ہے کہ:۔

"اورنگ زیب کی تخت نشینی کے فوراً بعد خواجہ محمد معصوم اور ان کے برادر بزرگ خواجہ محمد سعید دربار شاہی میں تشریف لائے اورنگ زیب نے اس موقعہ پر تین سو طلائی مہریں نذر کیں۔"[2]

پروفیسر محمد اسلم صاحب نے اپنے مضمون "اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار" میں "مرآت العالم" اور "فتوحات عالمگیری"[3] کے حوالہ سے متعدد واقعات نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے اِس خاندان اور حضرت مجدد کے فرزندوں سے گہرے روابط تھے،[4] یہ حضرات بادشاہ سے ملاقات کرتے تھے، اور بادشاہ ان کی خدمت میں

---

[1] مکتوبات خواجہ محمد معصوم مکتوب ۲۲۰ [2] ابو الفتح آداب عالمگیری، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن تیھے ۲۱ ورق ب۲۳، محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء ص ۲۹۳ (منقول از تاریخی مقالات از پروفیسر محمد اسلم)

[3] یہ دونوں کتابیں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم لندن کے کتب خانہ میں ہیں۔ [4] حضرت خواجہ سیف الدین کے مکتوبات کا جو بادشاہ عالمگیر کے نام ہیں، اور مکتوبات سیفیہ کے نام سے شائع ہوئے ہیں، اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ بادشاہ کا تعلق حضرت خواجہ سیف الدین سے علی الخصوص اور خاندان مجددی سے علی العموم محض احترام و عقیدت کا نہیں تھا جیسا کہ دیندار اور خوش اعتقاد بادشاہوں کا اپنے عہد اور مملکت کے علماء و مشائخ سے رہا ہے، بلکہ یہ تعلق ضابطے سے زیادہ رابطہ عقیدت سے زیادہ تربیت و استفادہ کا تھا، حضرت خواجہ سیف الدین اپنے والد ماجد کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں، جو ترتیب میں تیسرا مکتوب ہے:۔

حضرت سلامت دریں روزہا صحبتہائے طولانی واقع می شود حضرت سلامت ان دنوں طویل طویل صحبتیں اور مجلسیں ہوتی ہیں،

(باقی ص۳۲۶ پر)

قیمتی تحائف پیش کرتا تھا، دہلی سے لاہور جاتے اور واپس آتے وقت وہ کئی بار سرہند میں حضرت خواجہ محمد معصوم اور خاندان مجددی کے دوسرے افراد سے ملا۔

مفتی غلام سرور صاحب "خزینۃ الاصفیاء" کی روایت کے مطابق بادشاہ نے حضرت خواجہ محمد معصوم سے متعدد بار استدعا کی کہ وہ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہا کریں، لیکن انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی نصیحت کے مطابق بادشاہ کے ساتھ رہنا پسند نہیں فرمایا، اور اپنی جگہ اپنے فرزند گرامی قدر خواجہ سیف الدین کو دہلی بھیج دیا۔ "مکتوبات معصومیہ" میں دو مکتوب ایک ۲۲۱ دوسرا ۲۴۷ بادشاہ کے نام ہیں، اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا حضرت خواجہ سے ارادت و تربیت کا تعلق ہے، ان کے اور بادشاہ کے روابط اور بادشاہ کے ان سے اثر پذیر

(باقی ص ۳۲۵ کا)

وبعضے مکاتب غامضہ مذکور می گردد و باخلاص تمام می شنود۔	بعض دقیق مکاتیب کا مذاکرہ بھی ہوتا ہے اور بادشاہ پورے اخلاص کے ساتھ سماعت فرماتے ہیں۔

مکتوب نمبر ۱۴۲ میں جو شیخ محمد باقر لاہوری کے نام ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

بادشاہ دیں پناہ شب شنبہ کہ شب سوم ایں ماہ باشد بمنزل فقرا آمدند و از قسم اطعمہ بے تکلف ازاں چہ حاضر بود تناول فرمودند و صحبت طولانی گشت و مجلس سکوت نیز درمیان آمد ..... بالجملہ ترویج طریقۂ عالیہ امید است کہ موافق خواہش مخلصانہ بظہور آید۔ ص ۱۶۸-۱۶۹	بادشاہ دیں پناہ شنبہ کی رات کو جو اس مہینہ کی تیسری رات تھی غریب خانہ پر تشریف لائے، جو بے تکلف کھانے حاضر تھے ان کو تناول فرمایا، صحبت نے طول کھینچا، درمیان میں سکوت کی مجلس بھی پیش آئی، مختصر یہ کہ امید ہے کہ مخلصین کی خواہش کے مطابق طریقۂ عالیہ کی ترویج بھی ظہور میں آئے گی۔

تعلقات و اثرات کا یہ سلسلہ عالمگیر کی وفات کے بعد تک جاری رہا، چشتی نظامی سلسلہ کے مشہور شیخ جن سے اس طریقہ کو حیات نو حاصل ہوئی شاہ کلیم اللہ جہان آبادی (م ۱۱۴۳ھ) نے اپنے خلیفۂ خاص حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بعض خطوط میں ہدایت کی ہے کہ چونکہ اس وقت بادشاہ کے ساتھ اورنگ آباد میں مجددی خاندان کے صاحبزادے بھی ہیں اس لئے سماع و قوالی کی مجلسیں منعقد کرنے میں احتیاط برتی جائے کہ مبادا ان حضرات کو گرانی اور تکدر ہو[1]، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دکن کی مہمات اور وہاں کے طویل قیام میں اس خاندان کے عالی مرتبہ افراد وقتاً فوقتاً بادشاہ کے شریک صحبت اور دعا و توجہات سے معاون و شریک حال رہا کرتے تھے۔

[1] تاریخ مشائخ چشت، از پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص ۴۱۸-۴۱۹

ہونے اور ان کی ہدایتوں پر عمل کرنے کا تذکرہ باب ہشتم میں خواجہ سیف الدین کے تذکرہ میں آئے گا، خواجہ سیف الدین بادشاہ کے ساتھ رہ کر ترویج شریعت و احیاء سنت کے کام میں برابر ساعی و سرگرم رہے، ان کے خطوط کے مجموعہ "مکتوبات سیفیہ" میں بادشاہ کے نام اٹھارہ[1] مکتوبات ہیں، جن میں بادشاہ کی توجہ ازالۂ بدعات، احیائے سنت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔

کسی فرمانروائے سلطنت اور خود مختار بادشاہ کے پورے اعمال و اخلاق، اس کے فیصلوں اور اقدامات کی ذمہ داری لینی مشکل ہے، اور ان سب کو اسلامی تعلیمات اور احکام شریعت کے مطابق ثابت کرنا ممکن نہیں، یہ بات تو صرف خلفائے راشدین اور ایسے چند حکمرانوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے، جو اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی طرح خلافت علی منہاج النبوۃ کے قائل و عامل تھے، پھر یہ متنازع فیہ اقدامات اور سیاسی و انتظامی کارروائیاں کن مجبوریوں اور مصلحتوں کے پیش نظر عمل میں آئیں، اور مؤرخین نے ان کی جو تصویر پیش کی ہے وہ کس حد تک واقفیت پر مبنی تھی، طویل زمانہ گذر جانے کے بعد اور صحیح شہادتوں کی غیر موجودگی میں ان کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان نہیں، پھر بھی عالمگیر کے متعلق جو مستند تاریخی مواد موجود ہے، اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ حضرت مجدد صاحب کی اصلاحی و تجدیدی تحریک، سلطنت کو "ہادم اسلام" کے بجائے "خادم اسلام" بنانے کی انقلاب انگیز مگر خاموش کوششوں اور ان کے فرزندوں اور خاندان کی گہری و بے لوث روحانیت اور دلآویز شخصیتوں سے پورے طور پر متاثر تھا، اور اس نے حضرت مجدد کی دعوت و مقاصد سے ہم آہنگی پیدا کر لی تھی، وہ نظام سلطنت اور معاشرہ میں جرأت مندانہ

[1] مکتوب نمبر ۲۰-۲۲-۲۳-۲۶-۳۵-۳۹-۵۶-۵۷-۵۹-۶۰-۶۷-۷۲-۷۴-۷۶-۸۰-۱۶۱-۱۶۴-۱۶۵- (مکتوبات سیفیہ)

اور دور رس تبدیلیاں لانا چاہتا تھا، اور اس نے پہلی مرتبہ بعض ایسی اصلاحات نافذ کی تھیں، جن سے اگرچہ حکومت کا مالیہ متاثر ہوتا تھا، لیکن شریعت کے بعض صریح احکام کا نفاذ ہوتا تھا جادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں :-

"سال جلوس کے دوسرے سال (جون ۱۶۵۹ء) کے شروع میں حسب ذیل احکام جاری کئے جن کا مقصد انتظامیہ میں اسلامی قوانین کا نفاذ اور لوگوں کی زندگی کو قرآن کی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنا تھا، شعائر دین کے خلاف ہر عمل کو بدعت اور کفر تصوّر کرکے اس کی مذمت کی گئی۔

(۱) اُس سے پہلے مغل بادشاہ مسلمانوں کے کلمۂ شہادت کو اپنے سکّوں پر کندہ کراتے تھے، اورنگ زیب نے اس کی اس لئے ممانعت کردی کہ کہیں غیر مسلموں کے پیروں کے نیچے پڑکر یا کسی اور طریقے سے اس کی بے حُرمتی نہ ہونے پائے۔

(۲) ایران کے قدیم بادشاہ اور ان کی پیروی میں اُس ملک کے مسلمان حکمراں و نیز ہندوستان کے مغل بادشاہ برج حمل میں سورج کے داخلہ کے وقت یعنی پہلی فروردین کو جشن مناتے تھے، کیونکہ زرتشتی سال کا یہ پہلا دن تھا، اور روایت یہ تھی کہ نوشیرواں اسی دن تخت نشین ہوا تھا، دربار شاہی اور پوری مملکت میں کھیل تماشے ہوا کرتے، لیکن عوام اسے مذہبی اہمیّت دینے اور عیدین کی طرح مقدس تصور کرنے لگے تھے، اسلام کی نظر میں یہ ایک بدعت تھی، اس لئے اورنگ زیب نے اس کی ممانعت کرکے اس جشن کو رمضان میں اپنے تخت نشینی کے دن منتقل کردیا۔

(۳) عوام کی زندگی کو شعائر اسلام کے نزدیک لانے کے لئے محتسب مقرر کئے گئے عاقل خاں لکھتا ہے کہ بدعتی، لامذہب اور کفار جو اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹ گئے تھے،

اور وہ بے دین و منافقین جو سارے ہندوستان میں پھیل گئے تھے، انھیں سزا دی گئی انھیں اعمال فاسقہ چھوڑ کر علما کی پیروی کرنے اور نماز و روزہ پابندی سے ادا کرنے پر مجبور کیا گیا..... اپنی حکومت کے آخری زمانے میں اورنگ زیب اِن حکّام کو امر و نواہی کے متعلق قوانین پر عمل کرانے کی ضرورت پر برابر زور دیتا رہتا تھا۔

(۴) ایک شاہی حکمنامہ مورخہ ۱۳ مئی ۱۶۵۹ء تمام صوبجات کو بھیجا گیا جس میں مملکت کے ہر حصہ میں بھنگ کی کاشت پر پابندی عائد کرتے ہوئے حکام سے کہا گیا کہ وہ کاشتکاروں کو اس حکم کی تعمیل پر آمادہ کریں اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دیں۔

(۵) سبھی قدیم مساجد و خانقاہوں کی مرمت کرکے انھیں مثل نئی عمارت کے تعمیر کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ پچھلے بادشاہوں کی لاپرواہی اور زمانے کے ہاتھوں شکستہ ہو چکی تھیں، ان میں امام، مؤذن، خطیب اور خدّام سرکاری خرچ پر مقرر کئے گئے، دہلی اور اس کے اطراف میں دینی علوم کے طلباء کو ان کی صلاحیت کے بموجب وظائف مقرر کئے گئے۔

(۶) سال جلوس کے گیارہویں سال دربار کے گویّوں کو بادشاہ کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی ممانعت کردی گئی، اسی طرح کشمیری بھانڈوں کے متعلق اورنگ زیب نے اپنے آخری ایام میں کشمیر کے گورنر کو نقّالی کا پیشہ بند کرانے اور ان کے آلاتِ طرب ضبط کرنے کا حکم دیتے ہوئے لکھا کہ "خدا کے حکم سے ہم پر یہ فرض ہے کہ حلال کا حکم دیں اور حرام پر پابندی لگائیں"۔

(۷) بادشاہ کو اس کی دونوں سالگرہوں (شمشی و قمری تاریخ پیدائش) کے

مواقع پر سونے اور چاندی میں تولنے کی رسم اسی سال بند کردی گئی تھی، البتہ بعد میں شاہزادوں
اور بیماری کے صحتیاب ہونے پر اس کی اجازت اس لئے دے دی گئی کہ غربا و مساکین
جنھیں یہ مال تقسیم کیا جاتا تھا، ان کی دعاؤں سے نفع ہوگا۔

(۸) اکتوبر ۱۶۷۸ء میں پوری مملکت کے اندر منجموں کو اس کا پابند کیا گیا کہ وہ پیدائش
کے مواقع پر کسی کا زائچہ نہیں بنائیں گے۔

(۹) بادشاہوں کا دستور تھا کہ راجہ کا خطاب عطا کرتے وقت ماتھے پر اپنے ہاتھ
سے ٹیکہ لگاتے تھے، اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے شروع میں یہ رسم وزیر اعظم کو
انجام دینے کا حکم دیا مگر مئی ۱۶۷۹ء میں اسے بالکل بند کرکے راجہ کا خطاب پانے
والوں کو صرف تسلیم بجالانے کا حکم دیا۔

(۱۰) اورنگ زیب کے پیشرو تمام حکمراں اور سال جلوس کے گیارہویں سال تک
اورنگ زیب بھی صبح کے وقت محل کے جھروکے میں آکر رعیت کو درشن دیتے تھے، ہندوؤں
کے عقیدہ کے مطابق دن کا کام شروع کرنے سے پہلے دیوتا کے درشن کرنا ضروری
خیال کیا جاتا تھا چنانچہ ہندوؤں کا ایک طبقہ جنھیں درشنیہ کہتے تھے، بادشاہ کو اوتار
تصور کرتا تھا، اور اس وقت تک کچھ نہیں کھاتا پیتا تھا جب تک کہ بادشاہ کے درشن
نہ ہوجائیں، اورنگ زیب نے اس عمل کو غیر اسلامی قرار دے کر اسے بند کردیا۔

(۱۱) اورنگ زیب نے قبروں کے اوپر بنی ہوئی عمارتوں کی چھت بنانے، قبروں پر
سفیدی کرنے اور قبرستان میں عورتوں کے جانے کی ممانعت کردی تھی۔[1]

۱؎ جادوناتھ سرکار، ہسٹری آف اورنگ زیب - SARKAR JADU NATH. HISTORY OF
AURANGZIB. VOL. III (CALCUTTA. 1928). pp. 81-90. جلد سوم کلکتہ ۱۹۲۸ء
صفحہ ۹۰-۸۱

ہم اس کی ذاتی زندگی کو اس وقت چھوڑتے ہوئے جس کے متعلق تمام مؤرخین کا
اتفاق ہے کہ وہ ایک متشرع، پابند مذہب بلکہ متقی مسلمان کی زندگی تھی، اور جس کے لئے
بطور مثال کے چند نمونے کافی ہیں:-

"رمضان کا مہینہ تھا، لوئیں چلتی تھیں، دن بڑے ہوتے تھے، بادشاہ دن کو روزہ
رکھتا، وظائف پڑھتا، تلاوت و کتابت اور حفظ کلام مجید کرتا، اور اپنی عدالت
و سلطنت کے کاموں کو انجام دیتا، شام کو افطار کرکے "مسجد غسلخانہ" (موتی مسجد)
میں نماز و تراویح اور نفل پڑھتا، آدھی رات کو کچھ قلیل غذا کھاتا، رات کو بہت کم
سوتا، اکثر عبادت کرتا، بعض متبرک راتوں کو ساری رات عبادت ہی میں گذارتا،
اسی طرح سارا مہینہ گذارا۔"[1]

انتقال کا حال بیان کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:-

"سال پنجاہ و یک (جلوس) ۱۱۱۸ھ تپ بڑی شدت سے چڑھی چار روز تک
باوجود اشتداد مرض بسبب کمال تقویٰ کے پانچ وقت کی نماز جماعت کے
ساتھ پڑھی ایک وصیت نامہ تھا کہ جس میں اس نے اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق
لکھا تھا کہ ساڑھے چار روپیہ جو میرے ہاتھ کی محنت کی ٹوپیوں کی سلائی سے بچے ہیں،
اس میں تجہیز و تکفین ہو، اور آٹھ سو پانچ (۸۰۵) روپئے جو قرآن نویسی کی اجرت سے حاصل
ہوئے ہیں، مساکین میں تقسیم ہوں، روز جمعہ ۲۸ ذی قعدہ ۵۱ سنہ جلوس
مطابق ۱۱۱۸ھ کو بادشاہ نے صبح کی نماز پڑھ کے کلمۂ توحید کا ذکر شروع کیا،

۱؎ "تاریخ ہندوستان" جلد ہشتم، از شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی مرحوم ص ۲۱۴
(ماخوذ از مآثر عالمگیری وغیرہ)

ایک پہر دن چڑھے اس دار فنا سے روضۂ جناں کو تشریف فرما ہوا۔[1]

ہم یہاں پر عالمگیر کے صرف ان احکام و فرامین کا ذکر کریں گے جن کا تعلق شعائر اسلام کے احترام اور احکام شریعت کے نفاذ و اجراء سے ہے۔

۱۰۶۹ھ اور جلوس کے سال دوم کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:۔

"جلال الدین محمد اکبر شاہ کے عہد سے دفتر و جلوس کے سال و ماہ کی بنا غرۂ فروردی پر رکھی گئی تھی، اس تاریخ میں آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے، بہار کا موسم ہوتا ہے، اس بادشاہ کے جلوس کی تاریخ بھی اس تاریخ کے قریب تھی، تو اس نے سارا حساب فروردی سے لے کر اسفندار[2] کے مہینوں تک مقرر کیا تھا، اور مہینہ کا نام ماہ الٰہی رکھا تھا، چونکہ یہ طریقہ آتش پرست بادشاہوں اور مجوسیوں کے مشابہ تھا اس لئے بادشاہ نے شریعت کا پاس کر کے جلوس و جشن اور دفتر کے حسابوں کے لئے سال و ماہ قمری عربی کا حساب مقرر کیا، اور حکم دیا کہ سال شمسی پر عربی سال و ماہ مقدم ہوں، اور جشن نوروز بالکل موقوف ہو ....

سب جانتے ہیں کہ ہمیشہ موسموں میں قمری ماہ بدلتے رہتے ہیں، قمری سال و ماہ کے حساب رکھنے میں بڑی دقتیں پیش آتی ہیں لیکن اس دیندار بادشاہ نے کچھ حساب کی آسانی پر خیال نہیں کیا، فقط آتش پرستوں اور مجوسیوں کی مشابہت کی وجہ سے نوروز کے جشن کو موقوف کیا اور جلوس ثانی کی تاریخ غرۂ رمضان مقرر کر کے اس نے جلوس کا نیا سال مقرر کیا، اور جشن نوروز کی جگہ جشن عید الفطر مقرر کیا۔"[3]

ایک بڑی سرکاری آمدنی کے ذریعہ کی جو نامشروع تھی، موقوفی کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:۔

۱ ایضاً ص۴۶۵ ۲ فروردی، اسفندار قدیم ایرانی تقویم کے مہینے ہیں۔ ۳ ایضاً ص۸۳-۸۴

"بادشاہ نے راہداری کی معافی کا حکم کیا، یہ راہداری ہر سر گذر و سرحد معتبر پر لی جاتی تھی، اور... اس آمدنی کا سب روپیہ خزانہ میں داخل ہوتا تھا، پاندری جس کو تہ بازاری کہتے ہیں...... اور یہ آمدنی لاکھوں روپئے سے زیادہ خزانۂ شاہی میں داخل ہوتی تھی اور ابواب مشروع و نامشروع مسکرات و خرابات خانہ و جرمانہ و شکرانہ وغیرہ وغیرہ جن کی آمدنی کا کروڑوں روپیہ خزانۂ سرکار میں داخل ہوتا تھا، ان سب کو قلمرو ہندوستان سے معاف کرایا۔"[1]

محتسب کا عہدہ شرعی حکومتوں کا ایک اہم عہدہ اور خلافت اسلامی کا ایک شعار تھا، بہت سے علماء نے اس عہدہ کی نوعیت، اس کے فرائض پر "الحسبۃ فی الاسلام" کے نام سے کتابیں لکھی ہیں، ہندوستان کی مسلم سلطنتوں میں عرصہ سے یہ عہدہ موقوف اور یہ کام معطل تھا، بادشاہ نے اس سنت کو بھی زندہ کیا، مؤرخ لکھتا ہے:۔

"بادشاہ نے ایک عالم عوض وجیہ کو محتسب مقرر کیا، اس کو حکم تھا کہ وہ خلق کو منہیات و محرمات سے خصوصاً شرب خمر اور بنگ بوزہ اور تمام مسکرات و فواحش سے منع کرے، اور حتی المقدور برے کاموں سے خلق کو روکے۔"[2]

سال یازدہم لغایۃ بیست و یکم ۱۰۸۰ھ کے واقعات درج کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:۔

"روز بروز امور شرعی کے اجراء اور اوامر و نواہی الٰہی کی پاسداری میں بادشاہ کی تقیید بڑھتی جاتی تھی مفصل احکام جاری ہوتے تھے کہ راہداری و پاندری وغیرہ موقوف کی جائے جس سے لاکھوں روپئے کی آمدنی ہر سال سرکار کو حاصل ہوتی تھی،[3] وہ مسکرات کے رواج و خرابات خانوں کو موقوف کرتا تھا۔"

۱ ایضاً ص۹۱ ۲ ایضاً ص۹۲ ۳ صاحب "نزہۃ الخواطر" نے فارسی تاریخوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عالمگیر نے ۱۰۶۹ھ میں ۸۰ قسم کے ناجائز محاصل (ٹیکس) موقوف کر دیئے جس سے خزانۂ شاہی کو تیس لاکھ سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"بادشاہ نے سرود و رقاصی کے منع کا حکم صادر کیا...... جھروکہ درشن کو بھی نامشروع جان کر جھروکہ میں خود بیٹھنا اور جھروکہ کے نیچے آدمیوں کے جمع ہونے کو موقوف کر دیا"۔[1]

اہل ہند کے قدیم دستور و اعتقاد کے مطابق مسلمان بادشاہ بھی علم نجوم اور منجموں پر بہت زیادہ اعتبار کرتے تھے، اور انھیں کے حسابات اور فیصلوں کے مطابق کاموں کے لئے دن مقرر کرتے تھے، عالمگیر نے اس کو بھی موقوف کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عدالتی فیصلوں کا تمام تر انحصار امراء و حکام کی عدالتوں اور ان کے فیصلوں پر تھا، عالمگیر نے شرعی قاضی مقرر کئے، اور ان کو اعلیٰ اختیارات دیئے۔

"شاعر و منجم جو بہت زیادہ اعتبار رکھتے تھے، خصوصاً شاہجہاں کے عہد میں موقوف ہوئے، امور ملکی و مقدمات جزئی و کلی میں قضاۃ مقرر ہوئے، اور وہ ایسے مستقل ہوئے کہ امیران عہدہ صاحب مدار سلطنت کو ان پر رشک و حسد ہوا"۔[2]

پوری سلطنت میں شرعی قانون و آئین جاری کرنے کے لئے اور قضاۃ کی آسانی کے لئے مسائل فقہیہ کی تدوین و ترتیب کا نیا بیڑہ اٹھایا، اور مستند علماء کی ایک جماعت کو اس کے لئے مامور کیا کہ وہ آسان عبارت میں مسائل جزئیہ کو ایک جگہ جمع کر دیں، اور ظاہر الروایہ پر اکتفا کریں، اور سوائے خاص حالات کے "نوادر" کی طرف توجہ نہ دیں، اور جو عبارت جہاں سے لی جائے اس کا حوالہ دیں، اس کے لئے اوائل سلطنت ہی میں مولانا نظام الدین برہانپوری کو ذمہ دار بنایا، انھوں نے ان علمائے کبار سے مدد لی جو فقہ حنفی میں

---

[1] ایضاً صـ ۲۷۵-۲۷۶ باختصار [2] ایضاً صـ ۲۷۷ نیز ملاحظہ ہو ظہیر الدین فاروقی صاحب کی کتاب "اورنگ زیب" کا باب A REFORMER صـ ۵۵۹-۵۶۲

امتیاز رکھتے تھے[1]، یہ کام ۶ جلدوں میں مکمل ہوا اور اس پر شاہی خزانے کے دو لاکھ روپئے (جو اس زمانے کے لحاظ سے خطیر رقم ہے) صرف ہوئے، یہ ہندوستان میں "فتاویٰ عالمگیری" کے نام سے اور مصر و شام و ترکی میں "الفتاوی الهندیه" کے نام سے مشہور ہے اور اس کو بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اس سے زیادہ جرأت مندانہ اقدام یہ تھا کہ بادشاہ نے اپنے خلاف بھی رعیت کو استغاثہ کرنے اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرانے کی اجازت دی اور اس کام کے لئے وکیل شرعی مقرر کئے، مؤرخ ہندوستان لکھتا ہے:۔

"۱۰۸۲ھ میں بادشاہ نے حکم فرمایا کہ حضور میں اور شہروں میں منادی کریں کہ جس کسی کا دعویٰ شرعی بادشاہ پر ہو وہ حاضر ہو کر وکیل بادشاہ سے رجوع کرے، اور اثبات کے بعد اپنا حق لے لے، اور حکم دیا کہ بادشاہ کی طرف سے وکیل شرعی حضور میں اور بلاد نزدیک و دور میں مقرر ہو تاکہ جو حضور میں آنے کی دسترس نہیں رکھتے وہ ان کے ذریعہ سے اپنی حق رسی کا دعویٰ کریں"۔[2]

مغل دربار میں اور شاہان مغلیہ کے لئے عام طور پر کورنش و آداب کے طریقے رائج تھے، جن میں مبالغہ آمیز تعظیم اور خلاف شریعت اعمال شامل تھے، سلام مسنون کا تو درباروں کا کیا ذکر امراء و رؤساء بلکہ بہت سے علماء و مشائخ کی مجلسوں میں بھی رواج نہیں رہا تھا، بادشاہ نے اس کی بھی اصلاح فرمائی، اور سلام مسنون پر اکتفا کرنے کی تاکید کی، مؤرخ لکھتا ہے:۔

---

[1] مولانا حکیم سید عبدالحی مصنف "نزہۃ الخواطر" نے اپنی گرانقدر کتاب "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" میں بڑی تحقیق و تلاش سے ان لوگوں کے نام جمع کئے ہیں جو علماء کے اس بورڈ میں شامل تھے، انھوں نے بیس ایسے نام لکھے ہیں جو پورے ہندوستان کے علمی حلقے کی نمائندگی کرتے تھے، ملاحظہ ہو "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" مطبوعہ دمشق اکیڈمی صـ ۱۱۰-۱۱۱ [2] ایضاً صـ ۳۰۰

"انھیں دنوں میں حکم ہوا کہ جب مسلمان بادشاہ سے ملاقات کریں تو سلام شرعی سلام علیک پر اکتفا کریں کفار کی طرح سر پر ہاتھ نہ رکھیں احکام بھی خاص و عام کے ساتھ یہی طریقہ برتیں[1]"

انھیں جذبات و اقدامات کی بنا پر ہندوستان کے دینی حلقوں نے بادشاہ عالمگیر کو "محی الدین" کا لقب دیا، علامہ اقبال کے نزدیک بھی (جن کی ہندوستان کے رجحانات اور فلسفوں اور دیانت اور شریعت کی صف آرائی، اور ہندوستان کے مستقبل کی صورت گری میں قسمت آزمائی پر گہری نظر تھی) عالمگیر کا شمار ان چند شخصیتوں میں تھا جن کے سر اس ملک میں اسلام کی حفاظت کا سہرا ہے، راقم سطور نے اپنی ایک طویل ملاقات کی (جو ۲۲ نومبر ۱۹۳۷ء کو لاہور میں ان کے دولت خانہ پر ہوئی تھی) روداد قلمبند کرتے ہوئے اپنے مضمون "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" میں لکھا تھا:۔

"ہندوستان میں اسلام کے تجدید و احیاء کی بات نکلی تو علامہ نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، اور سلطان محی الدین عالمگیر کی بڑی تعریف کی، اور فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جد و جہد نہ ہوتی تو ہندو تہذیب و فلسفہ اسلام کو اپنے اندر تحلیل کر لیتے"

انھوں نے اسی یقین و تحقیق کی بنا پر عالمگیر کی شان میں حسب ذیل پر جوش اور فکر انگیز شعر کہے۔

شاہ عالمگیر گردوں آستاں　　اعتبار دودمان گورگاں
پایۂ اسلامیاں برتر ازو　　احترام شرع پیغمبر ازو
درمیان کارزار کفر و دیں　　ترکش مارا خدنگ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید　　باز اندر فطرت دارا دمید

[1] عالمگیر کے کھلے ہوئے دینی رجحان اور مملکت میں دور رس تبدیلیوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جادو ناتھ سرکار کی کتاب AURANGZIB (OXFORD) P. 64-66 - نیز اسٹینلی لین پول کی کتاب HISTORY OF AURANGZIB VOL III PP. 81-90

شمع دل در سینہ ہا روشن نبود　　ملت ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را　　آں فقیرِ صاحب شمشیر را
از پئے احیائے دیں مامور کرد　　بہر تجدید یقیں مامور کرد
برق تیغش خرمن الحاد سوخت　　شمع دیں در محفل ما بر فروخت
کور ذوقاں داستانہا ساختند　　وسعت ادراک او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود　　چوں براہیم اندریں بتخانہ بود

در صفِ شاہنشہاں یکتاستے
فقر او از تربتش پیداستے[1]

بالآخر حضرت مجدد کے دو خلیفۂ اجل اور جانشین برحق حضرت خواجہ محمد معصوم اور حضرت سید آدم بنوری اور ان کے مخلص و باعظمت خلفاء اور جانشینوں کی کوششیں اس ملک میں بار آور ہوئیں اور رفتہ رفتہ بارہویں صدی ہجری میں یہ ملک پوری دنیائے اسلام (جس پر فکری و علمی اضمحلال کے بادل چھائے ہوئے تھے) کا روحانی و علمی مرکز بن گیا، اور دنیائے اسلام کے دور دراز گوشوں سے لوگ یہاں اپنی روحانی و علمی پیاس بجھانے، تزکیہ و احسان کی منزلیں طے کرنے اور حدیث کا درس لینے کے لئے آنے لگے، یہاں جا بجا مجددی خانقاہیں اور کتاب و سنت کی تعلیم اور درس حدیث کے مرکز قائم ہو گئے، اور ایک عالم نے ان سے فیض اٹھایا۔

[1] رموز بیخودی کلیات فارسی ص ۹۸

حضرت مجددؒ کی مخالفت و تضلیل کی تحریک
اور اس کے نمایاں افراد

یہ باب نامکمل رہے گا اور ناظرین کے سامنے صرف ایک ہی پہلو آئے گا (جو اگرچہ بہت درخشاں اور روشن ہے اور مجدد صاحب کی سیرت و تاریخ میں یہی پہلو غالب اور نمایاں ہو کر رہا) اگر ہم اس مخالفانہ تحریک اور مہم کا ذکر نہ کریں، جو مجدد صاحب کی زندگی کے آخری دور ہی میں شروع ہو گئی تھی، اور جو ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہو کر حرمین شریفین تک پہونچی، اور جس کی بنیاد مجدد صاحب کی بعض تحریرات، اور مکتوبات کی بعض عبارتوں اور مضامین پر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد صاحب کو ان کی زندگی میں جو قبول عام اور مرجعیت تام عطا فرمائی، اور ان کا اہل ذکر و علم سے لے کر اہل حکومت تک پر جو اثر قائم ہوا، اور چند سال کے عرصہ میں سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کو ہندوستان اور بیرون ہند میں جو فروغ نصیب ہوا، نیز انھوں نے جن نئے علوم و تحقیقات کا اپنے مکتوبات اور مجالس کے ذریعہ افاضہ فرمایا جن میں سے بہت سے عوام تو عوام خواص کے لئے بھی نامانوس اور ایک حد تک (اگر موجب وحشت نہیں تو) موجب حیرت ضرور تھے، اور ان میں بہت سے ان حلقوں کے مسلّمات کے خلاف

تھے، جو نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آرہے تھے، اور یہ معاملہ اکثر ان نادرۂ روزگار شخصیتوں کے ساتھ پیش آیا ہے، جو کسی علم و فن کی مجتہد، اور کسی سلسلۂ و طریق کی بانی، اور اپنے زمانہ کی عام علمی ذہنی و باطنی سطح سے بلند ہوتی ہیں، اور جن کو اللہ تعالیٰ علوم و کمالاتِ وہبی سے نوازتا ہے، اور وہ عام اصطلاحات اور قدیم تعبیرات کے دائرہ سے باہر قدم نکالتی ہیں، پھر آپ نے بدعتِ حسنہ کے خلاف جو قلمی جہاد شروع فرمایا، مشائخ کے لئے سجدۂ تعظیمی، وجد و سماع، لفظی طور پر نماز کی نیت کرنے، جماعت کے ساتھ نماز تہجد ادا کرنے اور محفل میلاد کی مخالفت کی، اور مکاشفات کے حجت نہ ہونے اور مشائخ طرق و اولیائے کبار کے بجائے ائمۂ مجتہدین کے قول کے حجت ہونے کو ثابت کیا، اور کشف کی صحت و قطعیت میں کلام کیا، اور اپنے عہد و دیار کے بہت سے سلسلوں اور خانقاہوں کے مروجہ اور متعارف معمولات کے مخالف سنت ہونے کو ظاہر کیا، پھر اس سب سے بڑھ کر وحدۃ الوجود سے (جس کو ایک بدیہی حقیقت اور محققین صوفیہ کا ایک اجماعی مسئلہ سمجھا جاتا تھا) اور شیخ اکبر کے علوم و تحقیقات سے جن کو علم و معرفت کا "سدرۃ المنتہیٰ" قرار دیا گیا تھا، قدم آگے بڑھایا، اور اس کے متوازی وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا، اس کے بعد آپ کے بارے میں زبانوں اور قلموں کا یکسر خاموش رہنا، اور کسی مخالفانہ اور تردیدی بلکہ تضلیلی تحریک و مہم کا آپ کے آخر زمانہ میں یا آپ کے ارتحال کے فوراً بعد پیدا نہ ہونا، نہ صرف تاریخ اصلاح و تجدید بلکہ تاریخ علم و تدوین کا بھی ایک نادر واقعہ ہوتا۔

ان اختلافات یا مخالفتوں کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ مخالفت جو مخالفین کی کسی غلط بیانی کی بنیاد پر یا کسی غلط فہمی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی، اور اس غلط بیانی اور سازش کا پردہ چاک ہونے، یا اس غلط فہمی کے دور ہو جانے کے بعد رفع ہو گئی، دوسری وہ مخالفت جو اختلافِ عقیدہ و مسلک، یا کسی عصبیت یا ذاتی عناد پر مبنی تھی۔

پہلی قسم میں ہم حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کے اختلاف کو لیتے ہیں جن کا علمی و دینی پایہ، خلوص و للّٰہیت اور دینی حمیت مسلّم ہے، اور جو حضرت مجدد کے پیر بھائی بھی تھے، اور اپنے پیر کے خلیفہ و مجاز بھی، انھوں نے حضرت مجدد سے اختلاف کیا، ان کے بعض اقوال و تحقیقات پر سخت حیرت اور وحشت کا اظہار کیا، اور ایک مکتوب میں جو حضرت مجدد کے نام ہے اس کا برملا اظہار بھی کر دیا[1]۔ حضرت شیخ عبد الحق کے اس طویل مکتوب میں حضرت مجدد کی جو باتیں نقل کی گئی ہیں ان کے بارے میں مجددی سلسلہ کے بہت سے اہل علم و اہل نظر کی تحقیق ہے کہ وہ محرّف اور غلط ہیں، یہ ایک نجی مکتوب تھا حضرت شیخ نے اس کو اپنی کتاب "المکاتیب والرسائل" میں درج نہیں کیا، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے ارشاد کے مطابق شیخ نے اس مکتوب کو ضائع کرنے کی وصیت کی۔

اس مکتوب کی تحریر میں اصلاً جو جذبہ کام کر رہا ہے (اور وہ فی ذاتہٖ محمود ہے) وہ شیخ کا یہ خیال ہے کہ مجدد صاحب کے بعض اقوال و تحقیقات سے بعض ایسے بزرگوں کی تنقیص اور تخطیہ کا پہلو نکلتا ہے، جن کی جلالت قدر پر امت کا اتفاق ہے، لیکن اس کا مکتوبات کے خواص و شارح اور حضرت مجدد صاحب کے مقاصد کے رمز آشنا بارہا جواب دے چکے ہیں، اور خود مکتوبات کا مطالعہ اور حضرت مجدد کی زندگی اس کی تردید کرتی ہے، اس مکتوب کا

---

[1] یہ مکتوب پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب "حیات شیخ عبد الحق" کے آخر میں مکمل طریقہ پر درج ہے، ملاحظہ ہو ص ۳۱۰ تا ۳۳۴ اس مکتوب کے جواب بہ کثرت رسالے لکھے گئے جن میں شیخ بدر الدین سرہندیؒ، شیخ محمد یحییٰؒ (فرزند اصغر حضرت مجدد) شیخ محمد فرخؒ، شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اور حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کا نام لیا جا سکتا ہے، مولانا وکیل احمد سکندر پوری نے "ہدیۂ مجددیہ" کے نام سے ایک مستقل کتاب اسی کے رد میں لکھی ہے جو ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ایک بڑا محرک حضرت شیخ کی سیدنا عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ کے ساتھ وہ یگانہ عقیدت بھی ہے، جو عشق و فنائیت کے درجہ تک پہونچی ہوئی تھی، اور وہ ہر طرح سے نہ صرف قابلِ تحسین بلکہ قابلِ رشک ہے، اور اس میں امت کا ایک بڑا طبقہ ہر عہد و ملک میں ان کا شریک ہے، حضرت شیخ کا خیال ہے کہ حضرت مجدد صاحب کے کلام سے ان پر —— اپنی ترجیح ثابت ہوتی ہے، اس کا بھی ان تردیدی رسائل میں تشفی بخش جواب دیا جا چکا ہے، یہاں اس مکتوب کے مختلف اجزا اور مشتملات کا تفصیلی جائزہ لینا مقصود نہیں، اس کے لئے ان رسائل کی طرف مراجعت کرنے کی ضرورت ہے، جن کا اوپر تذکرہ ہوا، اس مکتوب میں حضرت مجدد کی طرف بعض ایسے اقوال منسوب کئے گئے ہیں، جو بداہۃً بے اصل ہیں، اور معاندین کی افترا پردازی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ حضرت شیخ نے ان کو کیسے باور کیا اور مکتوب میں درج فرمایا، حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے قلم سے جو مجسم وقار و سکینت تھے اسی بنا پر اس طرح کی عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد بے اختیار نکل گیا ہے۔

"العیاذ باللہ این چہ خلاف نویسی است، و این چہ بے تحقیق گوئی است، در ہیچ مکتوب ایشاں این چنیں عبارت نیست یا شیخ عفا اللہ عنک" (پناہ بخدا! یہ کیا بے اصل و بے تحقیق کلام ہے، (حضرت مجدد کے) کسی مکتوب میں اس طرح کی عبارت نہیں، حضرت شیخ! اللہ آپ کو معاف کرے!)۔

لیکن چونکہ حضرت شیخ مخلص تھے، اور ان کے قلم سے ان اقوال و بیانات پر جو حضرت مجدد کی طرف منسوب کئے گئے تھے، جس تحیّر و تاثر کا اظہار ہوا، اس کی محرک ان کی دینی حمیت اور علمی مقام تھا، اس لئے جب ان کو اس غلط بیانی کا علم ہوا حضرت مجدد کے بارے میں غلط فہمی رفع ہوئی، اور آپ کا علوئے مقام اُن پر منکشف ہوا تو انھوں نے اس کی

تلافی کرنے میں قطعاً تقصیر و تاخیر سے کام نہیں لیا، اور بڑے بلند الفاظ میں حضرت مجدد کے ساتھ خلوص و محبت کا اظہار کیا، جو ان کے جیسے عالم ربّانی ہی کے شایانِ شان ہے، انھوں نے حضرت خواجہ حسام الدین احمد دہلوی کو حسب ذیل مکتوب تحریر فرمایا:-

فارسی	اردو
سلمکم اللہ و أبقاکم علی رؤس المحبین	اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت اور چاہنے
الطالبین المخلصین دریں دو سہ روزہ	والے مخلص طالبوں کے سروں پر باقی
کہ از احوال شریف خبر نہ گرفت یا	رکھے اس دو تین دن کے عرصہ میں آپ کے
بہ جہت تقصیرے کہ در جبلت بشر است	احوال شریفہ کی خبر نہ معلوم کرنے کی وجہ
یا بہ قصد آں کہ مطلقاً از آلائش ضعف	یا تو وہ کوتاہی ہوسکتی ہے جو انسان کی
و فترت پاک شدہ باشند تا خبر مسرت	فطرت میں ہے یا پھر وہ ارادہ ہوسکتا
اثر صحت کلی و عافیت تام شرف	ہے کہ کامل صحت ہوجائے اور پھر
و مسرور گرددو امید کہ بہ اعلام	خبر مسرت سننے میں آئے، امید ہے کہ
آں مشرف گردانند۔	صحت کی خبر سے آگاہ کریں گے۔
دیدۂ محبت در راہ انتظار وصول	بندگی حضرت میاں شیخ احمد کے اخبار
اخبار مسرت آثار بندگی حضرت میاں	مسرت آثار پر چشم شوق لگی ہوئی ہے،
شیخ احمد دوچار است، امید وار است کہ	امید ہے چاہنے والوں کی دعا قبول ہو،
دعائے محبان بہ اجابت رسید اثر عظیم	بڑا اثر پیدا کرے گی، آج کل ان سے
آرد، نسبت ایں فقیر در ایں ایام و	فقیر کا قلبی تعلق بے حد زیادہ ہے،
صفائے باطن بہ خدمت ایشاں از	بشریت کا کوئی پردہ یا افتادِ طبع کا
حد متجاوز است و اصلاً پردۂ بشریت	کوئی اثر بالکل حائل نہیں رہا ہیں خود

فارسی	اردو
وغشاوۂ جبلت درمیان نماندہ نمی	نہیں جانتا کہ یہ کس بناء پر ہے۔
داند کہ از کجا است با قطع نظر از رعایت	اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ طریقہ
طریقۂ انصاف و حکم عقل کہ بہ ایں چنیں	انصاف کی رعایت اور حکم عقل کا
عزیزان و بزرگان بدنہ باید بود و در	تقاضا ہے کہ ایسے عزیزوں اور
باطن بہ طریق ذوق و وجدان و غلبہ	بزرگوں کے ساتھ بُرا گمان نہ ہونا چاہئے،
چیزے افتادہ است کہ زبان	میرے دل میں ذوق و وجدان اور
از تقریر آں لال است سبحان اللہ	غلبہ کی بناء پر کچھ ایسی کیفیت پیدا
مقلب القلوب، و مبدل الاحوال شاید	ہوگئی ہے کہ اس کے بیان سے زبان
کہ ظاہر بیناں دریں جا استبعاد کنند	قاصر ہے، پاک ہے اللہ دلوں کا پلٹنے
من نمی دانم کہ حال چیست و بہ چہ	اور احوال کا بدلنے والا، ظاہر بین شاید
منوال است، زیادہ چہ گوید و چہ	اس پر یقین نہ کریں، میں خود بھی نہیں
نویسد "واللہ اعلم بحقیقۃ الحال"[1]	جانتا کہ کیا حال ہے، اور کیوں ہے،
	زیادہ کیا کہوں، اور کیا لکھوں،
	حقیقت حال کا پورا علم اللہ کو ہے۔

دوسری قسم میں سے ہم سب سے پہلے بارہویں صدی کے ایک حجازی عالم شیخ حسن عجیمی ثم المکی (جو مدینہ منورہ میں حدیث کا درس دیتے تھے، اور اس عہد کے مشہور حنفی عالم تھے، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے استاد حدیث شیخ ابو طاہر کُردی کے اُستاد تھے[2]) کی کتاب

---

[1] بشارات مظہریہ از شاہ نعیم اللہ بہرائچی، مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلماء ۱۲۸۱ھ [2] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" میں ان کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ وہ حدیث میں شیخ کا درجہ رکھتے تھے، مختلف علوم اور دقائق میں دخل

(باقی صفحہ ۳۴۱ پر)

"الصارم الهندی فی جواب سؤال عن کلمات السرهندی"[1] پر ایک نظر ڈالتے ہیں، اس کتاب کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان سے حرمین شریفین میں ١٠٩٣ھ میں شیخ احمد سرہندی اور ان کے ان بعض نامناسب کلمات کے بارے میں جو ان کے مکتوبات سے نقل کئے گئے ہیں، ایک سوال آیا، اور علمائے حرمین شریفین سے استفتاء کیا گیا کہ جو ایسے کلمات کو اپنی زبان سے نکالے، یا ان پر اس کا اعتقاد ہو، یا وہ ان کی ترویج و اشاعت میں حصہ لے، اس کا حکم شرعی کیا ہے؟ اس کے بعد جامع کتاب نے لکھا ہے کہ میرے قابلِ احترام استاد و شیخ مولانا الشیخ ملا ابراہیم بن حسن کورانی نے مجھے ہدایت کی کہ میں اس کا جواب دوں، اور علمائے حرمین کی اِس بارے میں رائے اور فتوے نقل کروں، مؤلف کتاب نے اس مجموعہ میں دو عالموں ایک مذکور الصدر ملا ابراہیم کورانی مدنی، دوسرے علامہ جمال الدین محمد ابن عبد الرسول البرزنجی کے

(باقی ص٣٤٠ کا) رکھتے، فصیح اللسان اور قوی الحافظ تھے، ان کی زیادہ تر صحبت و استفادہ شیخ عیسیٰ مغربی سے ہے، شیخ احمد قشاشی، شیخ محمد بن العلاء بابلی، اور شیخ زین العابدین ابن عبد القادر طبری مفتی شافعیہ کی بھی صحبت اٹھائے ہوئے تھے، شاہ نعمت اللہ قادری جیسے اہل طرق سے بھی ملاقات کی تھی، اور دعوت اسماء کا بھی شغل رہا تھا، ان کے درس حدیث میں شاہ ولی اللہ صاحب کے استاد شیخ ابوطاہر کردی مدنی عام طور سے قاری ہوتے تھے، آخر عمر میں مکہ کی سکونت موقوف کر کے طائف میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، وہیں ١١١٣ھ میں وفات پائی، اور سیدنا عبد اللہ بن عباس کے قریب جگہ پائی (انفاس العارفین ص١٨٦-١٨٧) خیر الدین الزرکلی نے "الاعلام" میں ان کو العجیمی لکھا ہے، والد کا نام علی بن یحییٰ تھا، ابو البقاء کنیت تھی، یا نی الاصل ہیں ١٠٤٩ھ میں ولادت ہوئی۔ (جلد ٢۔ ص٢٢٣)

[1] عربی مخطوطہ خدا بخش خاں لائبریری بانکی پور پٹنہ نمبر ٢٧٥٣۔ یہ کتاب ١٠٩٤ھ میں مکمل ہوئی خدا بخش خاں لائبریری کا مخطوطہ نسخہ مصنف کے نسخہ سے شیخ سلیمان جیتو نے نقل کیا اس لئے وہ ہر طرح قابل اعتبار ہے

یہ کتاب کتب خانۂ آصفیہ کے مخطوطات میں بھی موجود ہے (شامل کتاب قدح الزند نمبر ٢٢٤ فن کلام ورق ٨) لیکن (باقی ص٣٤٢ پر)

فتاوی نقل کئے ہیں۔

سب سے پہلے اس استفتاء کے دو مجیب ملا ابراہیم کورانی مدنی، اور جمال الدین محمد ابن عبد الرسول برزنجی کی شخصیت سے واقفیت کی ضرورت ہے، اول الذکر کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" (صفحہ ١٨٤-١٨٦) پر کیا ہے، یہ شاہ ولی اللہ صاحب کے اصل استادِ حدیث شیخ ابوطاہر کردی کے والد اور شیخ ہیں، اس زمانہ کے ایک شیخ اور بزرگ شیخ یحییٰ شاوی کے بارے میں ان کی اس رائے سے جو شاہ ولی اللہ صاحب نے ذکر کی ہے، اور جس میں شیخ نے ان پر تجسیم کا فتویٰ صادر کیا، اور جس کی وجہ سے وزیر سلطنتِ ترکی نے جو ان کا معتقد تھا، ان کو اہانت کے ساتھ مجلس سے نکال دیا، اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے مزاج میں کسی قدر خشونت اور رائے قائم کرنے میں عجلت تھی، سید محمد برزنجی[1] جو اس مجموعہ کے دوسرے مفتی ہیں، کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ "فی الجملہ یُبس مزاج داشت" (ص١٨٤)، (مزاج میں کسی قدر خشکی تھی)۔

(باقی ص٣٤١ کا) اس کا نام صرف "العصب الہندی" سرورق پر درج ہے مصنف کے قلم سے کتاب کے نام کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

کتب خانۂ آصفیہ کے مخطوطات میں اس موضوع (حضرت مجددؒ کے اقوال و تحقیقات کی تردید) پر دو اور کتابیں پائی جاتی ہیں:۔

١۔ قدح الزند وقدح الرند فی رد ضلالات أهل سرهند للسید محمد البرزنجی (نمبر کتاب ٢٢٤ فن کلام ورق ٣٤)

٢۔ الناشرة الناجرة للفرقة الناصرة للکلمات الفاجرة للسید محمد البرزنجی (نمبر ٢٢٣ فن کلام ورق ٢٦ کتابت ١٠٩٥ھ)

[1] سید محمد برزنجی ان کا پورا نام محمد بن عبد الرسول ابن عبد السید الحسنی البرزنجی ہے ١٠٤٠ھ میں ولادت اور ١١٠٣ھ میں وفات پائی، شہر زور میں ولادت ہوئی، آخر میں مدینہ طیبہ میں قیام اختیار کر لیا تھا، ان کی ایک کتاب "حل مشکلات ابن العربی" بھی ہے، یہ وہ برزنجی نہیں ہیں، جن کا مولود دیار عرب میں مشہور ہے، (الأعلام للزرکلی جلد ٧، ص٧٥) مجدد صاحب کی تردید میں ان کی مستقل کتاب "قدح الزند" بھی ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "المختصر من کتاب نشر النور والزہر" جزء اول تالیف الشیخ عبد اللہ مرداد ابو الخیر۔

اس سب کے بعد فتاویٰ اور علماء کے آراء، اور حکم شرعی کے بیان و اعلان کی تاریخ میں اس تاریخی حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ علماء اور اہل افتاء کے سامنے واقعہ کی جیسی صورت بیان کی جاتی ہے اور جس طرح کے منقولات و اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، انھیں کو سامنے رکھ کر اور انھیں کے پیش نظر فتویٰ صادر کیا جاتا اور حکم شرعی بیان کیا جاتا ہے، مثل مشہور ہے "تنہا پیش قاضی روی راضی بیائی" (اکیلے قاضی صاحب کے پاس چلے جاؤ، اور اپنے مطلب کا فتویٰ لکھوا کر آجاؤ) یہ علماء و اہل افتاء نہ اس بات کے مکلف ہوتے ہیں، اور نہ ان کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ ان اقوال و بیانات کے سیاق و سباق کو دیکھیں، اور اس کی تصدیق کریں کہ یہ نقول صحیح ہیں، اور ان کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے "لا تقربوا الصلوٰۃ" کے مشہور عوام لطیفہ کے مطابق اپنی تائید میں نہیں پیش کیا گیا ہے، اس بات کے پورے قرائن موجود ہیں کہ جواب تحریر کرنے والے حضرات نے مکتوبات کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا ہوگا، اور نہ ان کو درس و افتاء سے اتنی فرصت ملی ہوگی، کہ وہ مزید اس کی تحقیق کرتے، نیز اس وقت حرمین شریفین میں اس سلسلہ کے ایسے اہل علم حضرات بھی موجود نہیں رہے ہوں گے، جو حقیقت حال سے آگاہ کرسکتے۔

جہاں تک مستفتی کے فہم و امانت اور احساس ذمہ داری کا تعلق ہے، اس کے لئے صرف ایک ہی مثال کافی ہے کہ حضرت مجدد نے حقیقت کعبہ کے بارے میں جو دقیق عارفانہ کلام کیا ہے، اس کو اس بات پر محمول کیا گیا ہے کہ آپ اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ معروف عمارت کعبہ نہیں ہے، اور یہ بات کفر کو مستلزم ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:۔

ومنها انكاره مماتواتر أن الكعبة هي البنية المعروفة وذلك كفر.	اور انھیں کفریات میں سے ان کا اس بات سے انکار کرنا ہے کہ کعبہ یہی موجودہ معروف عمارت ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں اس مکتوب کو پڑھئے، جو شیخ تاج الدین سنبھلی کے نام ہے جو تازہ تازہ حج بیت اللہ سے واپس آئے تھے، مجدد صاحب بیت اللہ شریف کے حالات سننے کے اشتیاق و بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"فقیر کے نزدیک جس طرح صورت کعبۂ ربانی خلائق کے صور و اجسام کے لئے (کیا بشر اور کیا ملک) مسجود الیہا ہے، اس کی حقیقت ان صور و اجسام کے حقائق کا بھی مسجود الیہا ہے، اس طرح یہ حقیقت تمام حقائق کے اوپر اور اس سے جو کمالات متعلق ہیں ان تمام کمالات پر جو دوسرے حقائق سے متعلق ہیں، فوقیت رکھتی ہے، گویا یہ حقیقت حقائق کونی، اور حقائق الٰہی کے درمیان برزخ ہے"[1]

اس ایک مثال سے ان دانستہ یا نادانستہ فتویٰ تکفیر کی حقیقت و ماہیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، جو ان نقول و اقتباسات پر جاری کیا گیا ہے، اس کے باوجود بھی مصنف نے آخر میں یہ احتیاط کی ہے کہ لکھا ہے:۔

"یہ بھی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان اقوال کے قائل اور ان تحریرات کے لکھنے والے پر فضل فرمایا ہو، اور ان کا خاتمہ بالخیر ہوا ہو، جیسا کہ اس کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ رہا ہے، اور اس کی شان کریمی کا بارہا اظہار ہوا ہے اور اس کا ایک یہی قرینہ ہے کہ ان کی صلبی اولاد میں سے بعض حضرات جب حرمین شریفین حاضر ہوئے، تو انھوں نے حدیث کی سند لینے کا شوق ظاہر کیا، اور انھوں نے بتایا کہ ان کے طریقہ کی بنیاد اتباع سنت محمدی، اور نقش قدم نبوی پر چلنے پر ہے، انھوں نے مشائخ حدیث مثلاً امام زین العابدین طبری سے حدیث کی سند لی، اور ہمارے شیخ عیسیٰ محمد بن المغربی جعفری کو ایسا مطمئن و مانوس کیا کہ انھوں نے

[1] مکتوب نمبر ۲۶۳ دفتر اول۔

شیخ محمد معصوم سے طریقۂ نقشبندیہ کی تحصیل کی تاکہ ان کو اس کے عالی مرتبہ مشائخ کی برکت حاصل ہو۔[1]"

مصنف کے اس بیان سے جو انھوں نے ازراہ دیانت درج کیا ہے، صاف طریقہ پر اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ فتاویٰ محض ان نقول کے اعتماد پر لکھے گئے تھے، جو پیش کی گئیں اور مفتی صاحبان خود ان کے بارے میں متردد تھے، مجددی خاندان کے عالی مرتبہ افراد کے حرمین شریفین میں حاضر ہونے اور خاص طور پر حضرت خواجہ محمد معصوم کی سیرت و اخلاق اور احوال رفیعہ دیکھنے کے بعد نہ صرف یہ غلط فہمی رفع ہو گئی ہو گی، بلکہ خود مصنف کے ایک جلیل القدر شیخ عیسیٰ مغربی نے حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت کی اور طریقۂ مجددیہ نقشبندیہ کی نسبت پیدا کی، شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" میں ان کی تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ:۔

"بالجملہ یکے از علمائے متسنین بود و وے استاد جمہور اہل حرمین است و یکے از اوعیۂ حدیث و قراءت سید عمر با حسن بر حق وے القو ..... أراد أن ینظر إلی شخص لا یشك فی ولایته فلینظر إلی هذا۔[2]"

ترکستان کے ایک مجددی فاضل محمد بیگ الازبکی ان فتاویٰ کے بعد حجاز آئے، انھوں نے اپنی کتاب "عطیۃ الوهّاب، الفاصلة بین الخطأ والصواب" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ یہ فتاویٰ مکتوبات کی عبارتوں کے غلط تراجم پر مبنی ہیں، اور دانستہ ایسی تحریف کی گئی ہے، انھوں نے غلط ترجمہ کی متعدد مثالیں دیں، اس توضیح سے متاثر ہو کر بہت سے علماء نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا، اور بعض نے امام ربانی کی تائید و دفاع میں کتاب لکھی،

---

[1] الصارم الهندی (مخطوطہ) ص۲
[2] انفاس العارفین ص۱۸۳

ان میں حسن بن محمد مراد اللہ التونسی المکی بھی ہیں جنھوں نے "العرف الندی فی نصرۃ الشیخ أحمد السرهندی" لکھی جس میں انھوں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ حضرت مجدد کے خلاف جو مہم شروع کی گئی تھی، اس کی بنیاد غلط و محرف تراجم پر تھی، دوسرے صاحب احمد البشیشی المصری الشافعی الازہری ہیں، انھوں نے اس بات کا صفائی سے اظہار کیا ہے کہ حضرت مجدد کی تکفیر صرف تصوّف کی اصطلاحات و نظریات کے صحیح طور پر نہ سمجھنے یا غلط سمجھنے کی بناء پر ہو سکتی ہے جو انھوں نے استعمال کئے ہیں، محمد بیگ نے علمائے حجاز کے ساتھ اس موضوع پر مباحثے بھی کئے، اور رُو در رُو گفتگو اور مذاکرات بھی، جس کی وجہ سے البرزنجی کو اپنی کتاب "الناشرۃ الناجرۃ" لکھنی پڑی جس میں محمد بیگ کا بڑے حقارت آمیز اور تجہیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا۔

ہندوستان میں حضرت مجدّد صاحب کی مخالفت اور ان پر اعتراضات کی ایک قابلِ توجہ تاریخی دستاویز جو مخالفین و معترضین کی ذہنیت اور طرز فکر کی واضح ترجمانی اور اس گروہ کی کسی درجہ میں نمائندگی کرتی ہے، وہ شیخ عبداللہ خویشگی قصوری (۱۰۴۳-۱۱۰۶ھ) کی کتاب "معارج الولایة" ہے جو ایک ضخیم تصنیف ہے[1] عبداللہ خویشگی کے (جو اختصاراً عبدی کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں) حالات سے معلوم ہوتا ہے[2] کہ وہ کثیر التصانیف بزرگ ہیں، اپنے زمانہ کے مروّجہ علوم میں دخل رکھتے ہیں، تصوف میں سلسلۂ چشتیہ سے ان کا تعلق ہے، اور ذوقاً و مشرباً وجودی ہیں، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ وحدۃ الوجود میں ان کو غلو ہے، انھیں حضرت شیخ احمد سرہندی سے طبعی بُعد اور ایک طرح کی ضد سی تھی، انھوں نے ان کی اولاد او خلفاء پر جا بجا الزامات لگائے ہیں، وہ مجدّد صاحب کے خلیفہ حضرت سید آدم بنوری کے بھی بڑے مخالف تھے،

---

[1] اس کتاب کے قلمی نسخہ کا راقم سطور نے پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کے ذاتی کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے، معلوم ہوا کہ اس کا ایک نسخہ لاہور میں بھی ہے۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "احوال و آثار عبداللہ خویشگی قصوری" تالیف محمد اقبال مجدّدی، شائع کردہ دار المؤرخین لاہور۔

ان کے اساتذہ اور معتقد فیہ اشخاص بھی زیادہ تر حضرت مجدد کے مخالفین اور وحدۃ الوجودی صوفیہ ہیں، اور ان میں سے بعض (مثلاً شیخ نعمت لاہوری اور قاضی نورالدین، قاضی قصورؒ مجدد صاحب کے فتویٰ تکفیر پر دستخط کرنے والوں میں ہیں، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سید محمد برزنجی مؤلف "قدح الزند" کے متعلقین سے بھی متاثر ہوئے ہیں، جو اورنگ آباد میں مقیم تھے[1] جہاں ۱۰۹۶ھ میں خویشگی نے اس کتاب کی تکمیل کی ہے، اس کتاب کا ایک ماخذ اس عہد کی ایک دوسری تصنیف "کاسر المخالفین" ہے، جو حضرت مجدد اور آپ کے تبعین کے رد میں لکھی گئی تھی۔

قصوری کے طرزِ فکر اور مبلغ علم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مجدد صاحب کی قابلِ اعتراض چیزوں میں نماز کی زبان سے نیت نہ کرنے کو بھی شمار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

چوں برائے تحریمۂ نماز برخاستے اغلب اوقات نیت را بدل کردے و زبان را ساکت گردانیدے و گفتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نیت بدل کردہ نہ بزبان، زیرا کہ نیت فعل قلب است نہ فعل لسان۔

جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے اکثر اوقات دل سے نیت کرتے زبان کو حرکت نہ دیتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی معمول تھا، کیونکہ نیت دل کا فعل ہے نہ کہ زبان کا۔

خویشگی نے مکتوبات کا مطالعہ کس نظرِ غائر سے کیا تھا، اور ان کے اندر کس درجہ میں ذمہ داری کا احساس اور کسی کی طرف اقوال و خیالات کی نسبت کرنے میں کتنی احتیاط تھی، اس کا اندازہ ان کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے:۔

[1] اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ آباد گیارہویں صدی کے آخر میں اس تحریک مخالفت کا مرکز تھا اور وہیں سے یہ مسئلہ حجاز پہونچا۔

بعض مشائخ متقدمین ہر کہ قائل بہ وحدۃ وجود شدہ چنانچہ حسین منصور، و شیخ محی الدین عربی و امثال آں اور الملحد زندیق گفتے، در مکتوبات خود کہ مجلد بسہ مجلد است، در اکثر مواضع شیخ محی الدین عربی را تکفیر نمودہ و در بعضے محال نسبتِ مذاہب اعتزال بہ وے ثابت نمودہ، و باایں ہمہ او را از جملہ مقبولان شمردہ۔

مشائخ متقدمین میں سے جو لوگ وحدۃ الوجود کے قائل تھے، مثلاً حسین منصور، اور شیخ محی الدین عربی وغیرہ (شیخ احمد سرہندی) ان کو ملحد و زندیق کہتے تھے، اپنے مکتوبات میں جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، اکثر مقامات پر شیخ محی الدین عربی کی تکفیر کی ہے، اور بعض مقامات پر مذاہب اعتزال کی ان سے نسبت کی ہے، اور اس سب کے باوجود ان کو مقبولین الٰہی میں شمار کیا ہے۔

ان اعتراضات کے ساتھ حضرت مجدد کی تعریف بھی کرتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

بہ دعوت طالبان حق ارشاد کردہ پس وے اکثر طالبان (را) ہدایت نمودے، و بہ جانب حق دلالت فرمودے، و بر اجرائے شرائع تقید فرمودے، و تارک شرائع را توبیخ و زجر کردے، و مرتکب شرائع را

(حضرت خواجہ باقی باللہ نے) آپ کو دعوت طالبان حق کی اجازت دی، چنانچہ طلبگاران حق کو آپ ہدایت کرتے، اللہ کی طرف رہبری فرماتے احکام شرعیہ کی پیروی کی تاکید فرماتے، تارکِ شریعت کو زجر و توبیخ

دوست داشتے۔

کرتے، شریعت پر عمل کرنے والے سے خوش ہوتے۔

مجدد صاحب کی طرف سے تاویل بھی کرتے ہیں، اور حسن ظن بھی ظاہر کرتے ہیں، مخالفین نے جن عبارتوں اور الفاظ پر اعتراض کیا ہے، ان کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

وقتے لازم آید کہ مراد ازیں الفاظ معنی ظاہری بود فاما اگر مراد از معنی باطنی بود چناں کہ گزشت ہیچ تکفیر وے وتشنیع لازم نیاید۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ ان الفاظ سے معنی ظاہری ہی مراد ہوں لیکن اگر ان سے معنی باطنی مراد ہوں جیسا کہ اوپر گزرا تب... اس سے کوئی تکفیر و تشنیع لازم نہیں آتی۔

لیکن پھر وہ خیال جو صحبت و ماحول کے اثر اور افواہوں کی کثرت سے ان کے ذہن میں جاگزیں ہوگیا ہے، غالب آتا ہے، اور وہ لکھتے ہیں:۔

ولیکن حق آنست کہ ایراد کلامے کہ موہم بہ نقص بود بجناب نبوی خالی از نقص وقصور نیست کما لا یخفی۔

لیکن حق یہ ہے کہ ایسے کلام کا لانا جس سے بارگاہ نبوی میں تنقیص کا وہم پیدا ہوتا ہو نقص وقصور سے خالی نہیں۔

اس کتاب کی زیادہ تر اہمیت اور شہرت اس وجہ سے ہوئی کہ اس میں قاضی شیخ الاسلام[1] کا... مراسلہ درج کیا گیا ہے، جو انھوں نے اورنگ آباد کے قاضی قاضی ہدایت اللہ

[1] قاضی شیخ الاسلام قاضی القضاۃ عبدالوہاب گجراتی کے بیٹے، اور عہد عالمگیری کے نامور قضاۃ میں تھے، ۱۰۸۶ھ میں عالمگیر نے ان کو اقضی القضاۃ کا عہدہ دیا، ۱۰۹۴ھ میں اس عہدۂ جلیلہ سے استعفا دیا اور حج کے لئے روانہ

(باقی ص ۳۶۵ پر)

کے نام بھیجا ہے، اور اس کے متعلق مصنف کا بیان ہے کہ وہ بادشاہ اسلام (اورنگ زیب عالمگیر) کے حکم سے جاری کیا گیا، اور اس پر قاضی شیخ الاسلام کی مہر تھی، مصنف کے بیان کے مطابق اس پر ۲۷ شوال ۱۰۹۰ھ کی تاریخ درج ہے، یہ مراسلہ یا فرمان مصنف نے کتاب "کاسر المخالفین"[1] سے نقل کیا ہے، اور یہاں بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:۔

از قرار بتاریخ بست و ہفتم شہر شوال سنہ یک ہزار و نود ہجری آنکہ شریعت پناہ فضائل و کمالات دستگاہ فقاہت انتباہ، قاضی ہدایت اللہ بعافیت باشند۔ دریں ولا بعرض مقدس معلی رسید کہ بعضے مواضع مکتوبات شیخ احمد سرہندی ظاہر در مخالفت عقائد اہل سنت جماعت است، و معتقدان شیخ مذکور کہ در بلدہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد سکونت دارند و ترویج آں منتشر دہند و تدریس می نمایند اعتقاد حقیقت عقائد باطلہ مذکورہ دارند۔

۲۷ ماہ شوال ۱۰۹۰ھ...... قاضی ہدایت اللہ کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں سمع مبارک تک یہ بات پہونچی کہ مکتوبات شیخ احمد سرہندی کے بعض مقامات ظاہراً عقائد اہل سنت کے مخالف ہیں، شیخ مذکور کے معتقد جو شہر اورنگ آباد میں سکونت رکھتے ہیں، ان کی اشاعت کرتے ہیں،... اور ان کا درس دیتے ہیں، اور ان عقائد باطلہ مذکورہ کی حقیقت پر اعتقاد رکھتے ہیں، الحکم والاشرف صدور لایا کہ یہ خادم شریعت پناہ کو لکھے کہ ان کو رشد (؟) اور ان مضامین

(باقی ص ۳۴۹ کا) ہوگئے، عالمگیر کے اصرار کے باوجود انھوں نے دوبارہ یہ عہدہ قبول نہیں کیا، یادایام (تاریخ گجرات) از مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم ص ۷۸-۷۹۔ منقول از مآثر الامراء وغیرہ۔

[1] افسوس ہے کہ کتاب کے مصنف کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

حکم والاشرف صدور یافت کہ	کے درس و تدریس سے روک دیا جائے
ایں خادم شریعت باشریعت پناہ	اور جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ان
بنویسد کہ آنہارا از رشد و درس آں	عقائد باطلہ پر اعتقاد رکھتا ہے،
منع بکند، کسے کہ معلوم شود کہ معتقد	اس کو سزائے شرعی دی جائے،
عقائد باطلہ مذکورہ است، اورا	اس لئے اس کو تحریر میں لایا گیا،
بہ سزائے شرعی رسانند، لہٰذا نگارش	چاہئے کہ اس حکم واجب الاتباع
شد باید کہ برطبق حکم مطاع واجب	کے مطابق عمل کیا جائے اور حقیقت
الاتباع بعمل آرند و حقیقت بنگارند۔[1]	لکھی جائے۔

اس "فرمان شاہی" کو زمانۂ حال کی بعض تصنیفات میں بڑی اہمیت دی گئی ہے اور گویا یہ ایک عظیم تاریخی انکشاف ہے، جو عالمگیر کے مجددی تحریک سے تاثر اور حضرت مجدد اور ان کے خاندان سے عقیدتمندانہ تعلق اور روابط کی پوری عمارت کو منہدم کر دیتا ہے۔[2]

لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو وہ اتنا "سنسنی خیز" اور ہوش ربا نہیں ہے جتنا سمجھا گیا ہے، پہلی بات یہ ہے کہ اس میں جہاں مکتوبات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں "ظاہر در مخالفت عقائد اہل سنت والجماعۃ" کہا گیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جس بات پر تشویش ظاہر کی گئی ہے، وہ ان مضامین کی ترویج و تدریس ہے اور جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ یہی عمومی اشاعت

[1] معارج الولایۃ ص ۷۰۰

[2] مثلاً یہودی فاضل YOHANAN FRIEDMANN کی کتاب SHAYKH AHMAD SIRHINDI-AN OUTLINE OF HIS THOUGHT & A STUDY OF HIS IMAGE IN THE EYES OF POSTERITY, مطبوعہ (MCGILL UNIVESITY, MONTREAL & LONDON, 1971)

اور درس و تدریس ہے، ظاہر ہے کہ ان دقیق مضامین کی (جن کا فہم محققین کی اصطلاحات سے واقفیت، اور سلوک و تصوف کے عملی تجربات و ممارست پر موقوف ہے) عام اشاعت اور ان کا حلقۂ درس میں لانا، جس میں مبتدی و منتہی سب شریک ہوتے ہیں، انتشارِ خیال کا موجب اور اختلاف کا باعث ہو سکتا ہے، اور ایک حامی شریعت بادشاہ کو جس کے پیش نظر اپنے ملک کے معاشرہ کا ہر قسم کے انتشار سے محفوظ رہنا ہے، اور بزرگوں کے معاملہ میں زبان طعن دراز کرنے سے احتیاط کرنا ہے، اور جس کو اپنی اس دعوت اور اس خاندان والاشان سے قلبی و مخلصانہ روابط پر اعتماد ہے، اور جو اپنے اثر و اقتدار سے اس کو کامیاب بنانے میں ساعی و سرگرم ہے، انتظاماً ایسی پابندی عائد کرنے، اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حق ہے، اگر اس فرمان کو عالمگیر کی ذاتی زندگی، اس کے حقیقی رجحانات و جذبات، اور اس خاندان کے ساتھ اس کے ان روابط و تعلقات کے (جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے) سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اس کے چند جملوں میں اس پوری تاریخ اور عالمگیر کے اس طرز عمل کی تردید کا کوئی سامان نہیں ہے، جس نے بالآخر سلطنت مغلیہ کا رُخ ہندوستان سے اسلامی اثرات کے ختم کرنے سے ہٹا کر شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور اسلامی تہذیب کے اجراء پر ڈال دیا، اور جس میں بلا شبہ حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے خاندان، خلفاء، اور متبعین کا بنیادی حصہ ہے۔[1]

بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو، ہندوستان اور ہندوستان کے باہر حضرت مجدد کی وفات کے بعد

[1] محمد اقبال مجددی مصنف "احوال و آثار عبداللہ خویشگی قصوری" کے نزدیک یہ فرمان محض وضعی ہے اور مخالفین نے یہ اور بعض خطوط بادشاہ کی طرف سے جعلی لکھ کر لوگوں کو بھیجے جن کی بادشاہ کو مطلق خبر نہ تھی۔ (ص ۱۶۳)

ان کے مکتوبات، اور ان کی بعض تحقیقات و نکات کی بنیاد پر مخالفت و تضلیل کی جو مہم شروع کی گئی تھی، اور جس میں علماء و اہلِ افتاء کی بھی ایک تعداد شریک ہو گئی تھی، اس نے بارہویں صدی کے رُبع اوّل ہی میں دم توڑ دیا، اور اب وہ صرف تاریخ کے (اور وہ بھی بعض قلمی کتابوں کے سہارے پر) اوراق میں مدفون ہو کر رہ گئی ہے، بارہویں صدی کے نصف اول ہی میں ہندوستان سے ترکستان تک مجدّدی خانقاہیں، اور ہدایت و ارشاد کے مرکز قائم ہو چکے تھے، سلسلۂ مجددیہ کے مشائخ اور علماء نے مکتوبات کے مستند عربی ترجمے کر کے بیشتر اسلامی ممالک میں پھیلا دیئے تھے، شیخ محمد مراد مکّی قزّانی نے حضرت مجدّد اور ان کی اولاد و احفاد اور ان کے سلسلہ کے عرب و ترک مشائخ کا عربی میں تعارف کرایا، جو "ذیل الرشحات" کے نام سے شائع ہوا ہے، نیز مکتوبات کا ترجمہ بھی کیا، جو "الدرر المکنونات النفیسة" کے نام سے شائع ہوا، نیز شیخ محمد نور الدین بیگ الأوزبکی کا عربی رسالہ "عطیة الوہّاب، الفاصلة بین الخطأ والصواب" بھی شائع ہوا، اور مکتوبات کی ممالک عربیہ اور ترکی میں ایسی اشاعت ہوئی کہ تمام غلط فہمیاں رفع ہوئیں[1]، سر آمد علمائے روزگار علامہ شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی (م ۱۲۷۰ھ) اپنی شہرۂ آفاق تفسیر "روح المعانی" میں مجدّد صاحب کا بڑے احترام سے نام لیتے ہیں، اور مکتوبات کے بکثرت اقتباسات پیش کرتے ہیں، اور اب کہیں بھی علماء کے حلقہ سے مخالفت اور تضلیل کی کوئی تحریک یا مہم جاری نہیں۔

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۚ	میل کچیل کا جھاگ (جو کسی کام کا نہیں
وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ	ہوتا) رائیگاں جاتا ہے اور جس چیز میں

[1] جن حضرات نے رجوع کیا یا حضرت مجدّد اور ان کے سلسلہ کے دفاع کا فرض انجام دیا ان کے نام "نزہۃ الخواطر" ج ۵ ص ۴۳۶ پر ملاحظہ ہوں۔

فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ	انسان کے لئے نفع ہوتا ہے وہ زمین میں
الْأَمْثَالَ ۔	رہ جاتی ہے، اسی طرح اللہ (لوگوں کی
(سورۃ الرعد - ۱۷)	سمجھ بوجھ کے لئے) مثالیں بیان کرتا ہے۔

حکمت الٰہی کی یہ عجیب کار فرمائی ہے کہ مخالفت و تضلیل کی اس مہم میں سب سے بڑا حصّہ حجاز کے ان علماء نے لیا تھا، جو کردی الاصل تھے، شیخ ابراہیم الکورانی کردی ہیں، اور سید محمد برزنجی بھی شہر زور میں پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ایک کردی عالم مولانا خالد شہر زوری کا انتخاب فرمایا، جن کی مساعی جمیلہ اور قوّتِ نسبت سے یہ سلسلہ عراق، شام، کردستان اور ترکی میں اس طرح پھیلا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے[1]، "وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ"۔

***

[1] تفصیل باب ہشتم میں آئے گی۔

باب ہشتم

حضرت مجددؒ کے دو خلفائے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعہ آپ کے تجدیدی کام کی توسیع و تکمیل

مشاہیرِ خلفاء

حضرت مجددؒ کے خلفائے عظام کے ناموں اور کارناموں کا استقصاء دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان کی تعداد کئی ہزار بتائی جاتی ہے اور وہ تمام دنیا میں منتشر اور سرگرمِ عمل رہے، خلفاء میں متعدد اصحاب کے نام جن کو آپ نے بعض بیرونی ممالک میں اصلاح و تربیت کا کام تفویض کر کے روانہ فرمایا تھا، یا ہندوستان کے بعض اہم مقامات میں اس خدمت پر مامور فرمایا تھا، گذشتہ اوراق میں گذر چکے ہیں، یہاں پر حروفِ تہجی کے اعتبار سے ان میں سے مشاہیر کی فہرست درج کر دی جاتی ہے، پھر دو اہم ترین خلفاء (حضرت خواجہ محمد معصوم اور حضرت سید آدم بنوری) کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا، پھر ان کے خلفائے کبار اور ان کے سلسلوں کی اشاعت اور ان کے ذریعہ سے اصلاح و تربیت کا جو کام انجام پایا، جن اہم روحانی و تربیتی مراکز کی بنیاد پڑی اور ان سے عوام و خواص کو جو فائدہ پہنچا اس کا اجمالاً تذکرہ آئے گا، جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اللہ تعالےٰ

نے حضرت مجددؒ کے سلسلہ کو کس طرح قبولِ عام عطا فرمایا اور ان کی اصلاحی و تجدیدی مساعی کو کیسا بارآور اور پُرثمر فرمایا، اور یہ سب ارادۂ خداوندی، تائیدِ غیبی، قبولیت عند اللہ غایت اخلاص اور اتباعِ سنت کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۱) حضرت سید آدم بنوری (۲) مولانا احمد برکی (۳) مولانا احمد دیبنی (۴) مولانا امان اللہ لاہوری (۵) مولانا بدر الدین سرہندی (۶) شیخ بدیع الدین سہارنپوری (۷) شیخ حسن برکی (۸) شیخ حمید بنگالی (۹) حاجی خضر خاں افغانی (۱۰) میر صغیر احمد رومی (۱۱) شیخ طاہر بدخشی (۱۲) شیخ طاہر لاہوری (۱۳) خواجہ عبید اللہ عرف خواجہ کلاں (۱۴) خواجہ عبد اللہ عرف خواجہ خورد (۱۵) شیخ عبد الحی حصاری (۱۶) مولانا عبد الواحد لاہوری (۱۷) شیخ عبد الہادی فاروقی بدائونی (۱۸) مولانا فرخ حسین ہروی (۱۹) مولانا قاسم علی (۲۰) شیخ کریم الدین باباحسن ابدالی (۲۱) سید محب اللہ مانکپوری (۲۲) شیخ محمد صادق کابلی (۲۳) مولانا محمد صالح کولابی (۲۴) مولانا محمد صدیق کشمی (۲۷) شیخ مزمل (۲۸) حافظ محمود لاہوری (۲۹) شیخ نور محمد پٹنی (۳۰) مولانا یار محمد جدید بدخشی طالقانی (۳۱) مولانا یار محمد قدیم (۳۲) شیخ یوسف برکی (۳۳) مولانا یوسف سمرقندی۔[۱]

---

[۱] حروفِ تہجی کی رعایت سے یہ فہرست مولانا سید زوار حسین کی تالیف "حضرت مجدد الف ثانیؒ" (شائع کردہ ادارۂ مجددیہ کراچی) سے ماخوذ ہے، ان کے حالات کے لئے مذکورہ بالا کتاب از ص۲۲۴ تا ص۲۸ اور "تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ" مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی کا مقالہ "تذکرہ خلفائے مجدد الف ثانیؒ" از مولانا نسیم احمد فریدی ص۳۱۰ تا ص۳۵۱ ملاحظہ ہو۔

حضرت خواجہ محمد معصومؒ [1]

شیخ طریقت وامامِ وقت، فاضل اجل حضرت معصوم بن احمد بن عبدالاحد العدوی العمری یعنی خواجہ محمد معصوم نقشبندی سرہندی اپنے والد کی چہیتی اولاد صورۃً مشابہ، معناً قریب تر پیروی واتباع میں فائق آپ کے علوم کے حامل خصوصی، فرزندان گرامی میں سب سے زیادہ مشہور اور ان میں سب سے زیادہ بابرکت تھے۔

۱۱ر شوال ۱۰۰۷ھ میں پیدا ہوئے اور بعض کتب درسیہ اپنے بڑے بھائی خواجہ محمد صادق سے اور بیشتر کتابیں اپنے والد ماجد اور شیخ محمد طاہر لاہوری سے پڑھیں، اپنے والد ماجد کی خدمت میں رہ کر تحصیل طریقت کی اور تین ماہ میں قرآن مجید حفظ کرلیا، نسبت پدری کی تحصیل میں آپ کا حال صدر الشریعۃ صاحب شرح وقایہ جیسا تھا، جو اپنے دادا صاحب کی تحریروں کو ان کے لکھے جانے کے ساتھ ہی حفظ کرتے جاتے تھے اسی لئے اس مرتبہ کو پہنچے جہاں آپ کے والد کے اصحاب میں سے کوئی نہیں پہنچا چنانچہ آپ کے والد ماجد نے ______ بلند مقامات کی بشارت دی، والد ماجد کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے اور حرمین شریفین کا سفر کرکے حج وزیارت سے مشرف ہوئے اور خاصی مدت تک مدینہ منورہ میں مقیم رہ کر ہندوستان واپس ہوئے، اور درس وافادہ میں عمر صرف کردی، تفسیر بیضاوی، مشکوٰۃ وہدایہ، عضدی، وتلویح زیادہ تر درس میں رہی۔

شیخ مراد بن عبداللہ قزانی "ذیل رشحات" میں لکھتے ہیں کہ آپ اپنے والد ماجد کی طرح اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے، آپ نے دنیا کو روشن کردیا، اور اپنے توجہات اور

[1] حضرت خواجہ محمد معصوم کا یہ تذکرہ جس میں اکثر ضروری باتیں آگئی ہیں "نزہۃ الخواطر" ج ۵ سے ماخوذ ہے۔

بلند حالات کی برکت سے جہالت وبدعت کی تاریکیوں کو کافور کردیا، ہزاروں انسان اسرار الٰہی کے محرم ہوئے اور آپ کے شرف صحبت کے سبب بلند حالات تک پہنچے، کہا جاتا ہے کہ نو لاکھ انسانوں نے آپ سے بیعت کی جن میں آپ کے خلفاء کی تعداد سات ہزار ہے، جن میں شیخ حبیب اللہ بخاریؒ بھی تھے، جو اپنے زمانے میں خراسان وماوراء النہر کے سب سے بڑے شیخ تھے، آپ کی وجہ سے بخارا کی فضائیں بدعت کی تاریکیوں کے بعد سنت کی روشنیوں سے معمور ہوگئیں آپ نے چار ہزار مریدوں کو باکمال بنا کر خلافت واجازت سے سرفراز کیا۔

شیخ محمد معصومؒ کے مکتوبات تین جلدوں میں ہیں، اور والد ماجد (حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے مکتوبات ہی کی طرح اسرار ورموز اور لطائف واشارات پر مشتمل ہیں، اور اکثر مجدد صاحب کے دقیق علوم ومعارف کی تفسیر وتشریح کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۹ر ربیع الاول ۱۰۷۹ھ کو شہر سرہند میں انتقال فرمایا جہاں دفن ہوئے، قبر مبارک مشہور اور زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت سید آدم بنوریؒ [1]

شیخ عارف، ولی کبیر حضرت آدم بن اسماعیل بن بہوہ بن یوسف بن یعقوب بن حسین حسینی کاظمی بنوری، سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ کبار میں ہیں، آپ کے والد ماجد کو خواب میں آپ کی پیدائش کی بشارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ملی تھی، سرہند کے قریۂ بنور (بفتح باو تشدید نون) میں آپ کی ولادت ونشوونما ہوئی۔

آپ نے حضرت مجدد صاحبؒ کے ایک مرید حاجی خضر روغانی سے ملتان میں روحانی

[1] حضرت شیخ آدم بنوری کا تذکرہ "نزہۃ الخواطر" ج ۵ سے ماخوذ ہے جو اس سلسلہ میں "ماقلّ ودلّ" کا مصداق ہے۔

استفادہ کیا اور دو ماہ ان کی خدمت میں رہ کر شیخ کے حکم سے حضرت مجدد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اور ان کے پاس مدت تک مقیم رہ کر طریقت کی تحصیل کی "خلاصۃ المعارف" میں ہے کہ شیخ محمد طاہر لاہوری کی خدمت میں آپ کو ربانی کشش حاصل ہوئی جو انھیں اپنے شیخ اسکندر سے اور انھیں اپنے دادا شیخ کمال الدین کیتھلی سے حاصل ہوئی تھی، فی الجملہ آپ اس رتبے کو پہنچے جہاں آپ کے بہت سے معاصر مشائخ نہیں پہنچ سکے، آپ کا طریقہ شریعت محمدیہ اور سنت نبویہ کا اتباع تھا جس سے اپنے اقوال و افعال میں سرِ مو انحراف نہیں کرتے تھے۔

آپ سے ایک خلق نے استفادہ کیا کہا جاتا ہے کہ آپ سے چار لاکھ مسلمانوں نے بیعت کی اور ان میں سے ایک ہزار نے علم و معرفت کا وافر حصہ پایا، کہتے ہیں کہ آپ کی خانقاہ میں ایک ہزار آدمیوں سے کم تعداد شاید ہی کسی دن رہتی ہو سب لوگ آپ کے مہمان ہوتے اور آپ سے استفادہ کرتے تھے، "تذکرہ آدمیہ" میں ہے کہ حضرت سید آدم جب ۱۰۵۲ھ میں لاہور تشریف لے گئے ہیں تو آپ کے ساتھ دس ہزار اعیان و مشائخ اور ہر طبقہ کے افراد تھے، شاہجہاں بادشاہ بھی ان دنوں لاہور ہی میں تھا جسے ان کی مقبولیت سے تشویش پیدا ہوئی اور اس نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں کو شیخ کے پاس بھیجا، مگر اس ملاقات میں بدمزگی کے سبب، وزیر مذکور نے بادشاہ سے شیخ کی شکایت کی جس کے نتیجے میں بادشاہ نے انھیں حرمین شریفین کے سفر کا حکم دے دیا، چنانچہ آپ نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ حجاز کا رخ کیا اور حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

حقائق و معارف میں شیخ آدم بنوریؒ کی متعدد کتب و رسائل ہیں جن میں فارسی میں دو جلدوں میں "خلاصۃ المعارف" نامی کتاب ہے جس کی ابتداء اس طرح ہوئی ہے،

"الحمد للہ رب العالمین حمداً کثیراً بقدر کمالات اسمائہ و آلائہ" ان کی کتابوں میں "نکات الاسرار"[۱] بھی ہے۔

شیخ آدم بنوریؒ ______ نے کسی سے علمی تحصیل نہیں کی تھی، آپ نے ۲۳ شوال ۱۰۵۳ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں قبۂ سیدنا عثمانؓ کے پاس دفن ہوئے۔

سلسلۂ مجددیہ معصومیہ اور اس کے مشائخ کبار

ہم پہلے حضرت خواجہ محمد معصوم کے سلسلہ کے مشائخ کبار کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں جس سے ان کی مقبولیت اور مرجعیت ان کے افادہ و افاضہ کے دائرہ کی وسعت ان کی طرف رجوع عام اور خلق خدا کے پروانہ وار ہجوم و ازدحام اور اس وقت کے اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کی زندگی پر ان کے وسیع و عمیق اثرات کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا، ان کے مفصل حالات و سوانح کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جو مستقلاً ان کے حالات میں لکھی گئیں یا ان کتب و تراجم کی طرف جن میں ان کا اجمالاً تذکرہ آیا ہے، جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اس کے لئے مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "نزہۃ الخواطر" کی جلد پنجم، ششم اور ہفتم پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔

حضرت خواجہ سیف الدین سرہندی

حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے طریقہ کی اشاعت اور بانی سلسلہ حضرت مجدد الف ثانیؒ

[۱] مصنف نے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ان کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

کے مقاصد کی تکمیل (جن میں تعلق مع اللہ کی تجدید، اتباع سنت کا رواج اور ازالۂ بدعات و منکرات خاص اہمیت رکھتا ہے) حضرت خواجہ محمد معصوم کے خلف الرشید اور خلیفۂ راشد حضرت خواجہ سیف الدین سرہندی (۱۰۴۹-۱۰۹۶ھ) سے ہوئی جنھوں نے اپنے والد ماجد کے حکم سے دارالسلطنت دہلی میں طرح اقامت ڈالی، آپ کے ہاتھوں اس مرجع عالم خانقاہ کی بنیاد پڑی جس کو بعد میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی نے تربیت روحانی کا عالمگیر مرکز بنا دیا، اور جس کے انوار سے ایک طرف افغانستان و ترکستان، دوسری طرف عراق و شام و ترکی منور ہوئے اور شاعر کا یہ کہنا حرف بحرف صادق آیا ؎

چراغ ہفت کشور خواجہ معصوم
منور از فروغش ہند تا روم

سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے (جس نے جیسا کہ اوپر گذرا ہے حضرت خواجہ محمد معصوم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی) حضرت خواجہ سیف الدینؒ سے روحانی تربیت حاصل کی حضرت خواجہ کے محل شاہی میں جانے اور دیواروں پر کندہ تصویروں پر اعتراض کرنے اور بادشاہ کے اسی وقت ان کے ختم کرنے کا حکم دینے کا تذکرہ تاریخ میں[1] آتا ہے
خواجہ سیف الدین نے اپنے والد نامدار کو اس کی اطلاع دی اور خواجہ نے (بادشاہ کے نام ایک مکتوب میں) اس پر مسرت کا اظہار فرمایا، تحریر فرماتے ہیں:۔

چہ نعمتے ست کہ باایں ہمہ طمطراق	یہ کیسی بڑی نعمت ہے کہ شاہانہ شان
بادشاہی و دبدبۂ سلطانی کلمۂ حق	و شوکت اور بادشاہی دبدبے کے باوجود

۱؎ ذیل الرشحات۔ تالیف شیخ محمد مراد القزانی ص۴۸ المطبعۃ المیریۃ بمکۃ المحمیۃ سن ۱۳۰۷ھ۔

بہ سمع قبول افتد و گفتہ نامرادے	کلمۂ حق قبول کیا جائے اور ایک
مؤثر شود۔[1]	نامراد کا کہنا مؤثر ہو۔

خواجہ سیف الدین نے بادشاہ میں آثار ذکر ظاہر ہونے اور بادشاہ کے بعض منازل سلوک طے کرنے کی بھی اطلاع دی اور خواجہ محمد معصوم نے اس پر بھی اپنی مسرت و اطمینان کا اظہار فرمایا، ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ دین پناہ کے جو احوال تم نے ذکر کئے مثلاً لطائف میں ذکر کا سرایت کرنا اور سلطان ذکر اور رابطہ کا حاصل ہونا خطرات کی قلت کلمۂ حق قبول کرنا بعض منکرات کا رفع ہونا اور لوازم طلب کا زائل ہونا یہ سب بوضاحت معلوم ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لانا چاہئے بادشاہوں کے طبقے میں یہ باتیں عنقا کی طرح نایاب ہیں[2]"

بادشاہ نے ان سے رابطۂ روحانی قائم رکھا "مآثر عالمگیری" کے مصنف محمد ساقی مستعد خاں نے سال دوازدہم ۱۰۸۰ھ (۱۳ محرم) کے واقعات میں بادشاہ کے ایک پہر رات گئے باغ حیات بخش سے حضرت خواجہ کے دولت خانہ میں تشریف لے جانے اور ایک گھڑی بیٹھ کر ان کی صحبت بابرکت اور کلمات طیبہ سے مستفید ہونے اور ان کا اعزاز و اکرام کرنے کے بعد دولت خانہ شاہی میں مراجعت کا ذکر کیا ہے[3]۔

حضرت خواجہ کا خاص ذوق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تھا، اور اس میں وہ بڑے سرگرم تھے، "ذیل الرشحات" کے مصنف شیخ مراد بن عبداللہ القزانی کے بیان کے مطابق "ان کی اِن مساعی کا اثر یہ ہوا کہ قریب تھا کہ سرزمین ہندوستان سے بدعات کا

۱؎ مکاتیب حضرت خواجہ محمد معصوم ج ۳ مکتوب ۲۲۷   ۲؎ ایضاً ج ۳ مکتوب ۲۲۰
۳؎ مآثر عالمگیری شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۷۱ء ص ۸۴

خاتمہ ہوجائے اسی بنا پر ان کے والد ماجد نے ان کو محتسب الامۃ کا خطاب دیا۔ نہایت قوی التاثیر، صاحبِ جذب و تصرف تھے، لوگ ایک اضطراب و استغراق کی حالت میں ان کی خانقاہ میں پڑے رہتے تھے، اسی کے ساتھ بڑے دبدبہ اور عظمت کے شیخ تھے، سلاطین و اُمراء ان کی مجلس میں مؤدب کھڑے رہتے تھے اور ان کو ان کے سامنے بیٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، رجوعِ عام کا یہ حال تھا کہ روزانہ چودہ سو[۱۴۰۰] آدمی دونوں وقت ان کے مطبخ سے اپنی خواہش و ذوق کے مطابق کھانا پاتے تھے۔[۱]

خواجہ سیف الدین کے بعد ان کے خلیفہ سید نور محمد بدایونی (م ۱۱۳۵ھ) نے ان کی جگہ کو آباد اور ان کی خانقاہ کو نورِ محمدی سے منور رکھا ان کے بعد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے ان کی مسندِ ارشاد کو زینت بخشی جن کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔[۲]

خواجہ محمد زبیرؒ سے مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ تک

حضرت خواجہ محمد معصوم کے دوسرے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد نقشبند تھے (۱۰۳۴ھ-۱۱۱۴ھ) جو حجۃ اللہ نقشبند کے نام سے مشہور ہیں، حضرت خواجہ محمد معصوم نے ان کو اپنا جانشین و خلیفہ بنایا تھا، اور ان کی وفات کے بعد وہ ہمہ تن ارشاد و تلقین میں مصروف ہوگئے۔

ان کے خلفاء میں خواجہ محمد زبیر (ابن ابی العلا ابن خواجہ محمد معصوم م ۱۱۵۱ھ) تھے، جن کی طرف طالبین کا ایسا رجوع ہوا جو اس عہد میں کمتر کسی کی طرف ہوا ہوگا، جب آپ مکان سے مسجد تشریف لاتے تھے، تو امراء اپنے دوشالے اور پگڑیاں مکان سے مسجد تک

---

[۱] ذیل الرشحات ص ۴۶-۴۹ [۲] چتلی قبر کی موجودہ خانقاہ اصلاً حضرت شاہ غلام علیؒ کے زمانہ میں قائم ہوئی جنھوں نے اس مکان کو جس میں حضرت مرزا صاحب کی تدفین ہوئی تھی، خرید کر مسجد و خانقاہ کی تعمیر کی۔

بچھاتے تھے تاکہ قدم مبارک زمین پر نہ پڑے، اور اگر کسی مریض کی عیادت یا دعوت میں جانے کے لئے سوار ہوتے تو بادشاہوں کے مثل آپ کی سواری جاتی تھی۔[۱]

حضرت خواجہ محمد زبیر نے بڑے بڑے خلفاء یادگار چھوڑے ان میں تین بڑے نامور ہوئے، حضرت شاہ ضیاء اللہ جن کے خلفاء میں حضرت شاہ محمد آفاق ہیں، دوسرے حضرت خواجہ محمد ناصر عندلیب جن کے فرزند و خلیفہ خواجہ میر درد دہلوی ہوئے، تیسرے حضرت خواجہ عبدالعدل جن کے خلیفہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ مترجم قرآن و فرزند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔

حضرت خواجہ ضیاء اللہ بڑے پایہ کے شیخ طریقت و صاحب نسبت تھے، حضرت شاہ غلام علی فرماتے تھے کہ جس نے نسبت مجددی مجسم نہ دیکھی ہو وہ حضرت خواجہ ضیاء اللہ کو دیکھے۔[۲]

ان کے خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق (۱۱۶۰-۱۲۵۱ھ) کو اللہ تعالیٰ نے قبول عام عطا فرمایا، اور شہرۂ آفاق بنایا، دہلی سے کابل تک لوگوں نے آپ سے فیض اٹھایا کابل تشریف لے گئے تو زماں شاہ، شاہِ افغانستان نے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

حضرت شاہ محمد آفاق کے خلیفۂ ارشد اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (۱۲۰۸-۱۳۱۳ھ) تھے، جن کے جذب قوی، نفس گرم، زہد و تجرید، اتباع شریعت، علمِ سنت و حدیث اور عشق الٰہی و حب نبوی نے نصف صدی سے زائد تک ہندوستان (بالخصوص شمالی ہند) کی فضا کو گرم اور منور رکھا اور خود انھیں کے الفاظ میں عشق کی

---

[۱] "درالمعارف" ملفوظات حضرت شاہ غلام علی۔

[۲] ایضاً ص ۱۶

دکان کی گرم بازاری رہی[1]"۔

ہندوستان کے وسیع النظر و محتاط مؤرخ اور تذکرہ نگار مولانا حکیم سید عبدالحی مصنفِ "نزہتہ الخواطر" کے بقول:۔

"عقیدت مندوں نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا، اور تحائف و ہدایا کی بارش ہوئی، بڑے بڑے امراء اور رؤساء دور دراز اور دشوار گذار علاقوں سے عقیدت مندانہ حاضر ہوئے اور آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی، اور ایسی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، جو اس زمانہ میں کسی شیخ طریقت کو حاصل نہیں تھی۔

جہاں تک آپ کے کشف و کرامات کا تعلق ہے، وہ حدِ تواتر کو پہونچ گئی ہیں اور اس بارہ میں اولیائے متقدمین میں بھی حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے علاوہ اور کوئی نظیر نہیں ملتی[2]"۔

مفصل تذکرہ کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی کتاب "تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی"۔

---

[1] ندوۃ العلماء کے اکثر بانی و ناظم حضرت مولانا کے مرید و مسترشد تھے، مثلاً مولانا سید محمد علی مونگیری بانی و ناظم اول ندوۃ العلماء، مولانا مسیح الزماں خاں شاہجہاں پوری (استاد اعلیٰ حضرت محبوب علی خاں نظام دکن) مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا سید تجمل حسین بہاری، مولانا حکیم سید عبدالحیؒ ناظم ندوۃ العلماء، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد دکن) حسام الملک صفی الدولہ نواب سید علی حسن خاں ناظم ندوہ، مولانا کے سلسلہ کی اشاعت اول الذکر مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی۔ [2] نزہتہ الخواطر ج ۸۔

مرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شاہ غلام علی

حضرت سید نور محمد بداونی کے خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں شہید[1] (۱۱۱۳ھ - ۱۱۹۵ھ) تھے، جنھوں نے پینتیس ۳۵ سال تک اپنے انفاس قدسیہ سے دلوں کو گرم و منور رکھا اور دار السلطنت دہلی میں عشق کا روز بازار اپنے عروج پر رہا، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے صاحبِ نظر معاصر کی ان کے متعلق شہادت ہے:۔

"ہندوستان کے لوگوں کے حالات ہم سے پوشیدہ نہیں کہ یہیں کی پیدائش ہے اور یہیں عمر بسر ہوئی ملک عرب کو خود دیکھا ہے، اور اس کی سیاحت کی ہے، افغانستان و ایران کے لوگوں کے حالات وہاں کے معتبر لوگوں کی زبانی سنے ہیں، اس سب کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوا کہ کوئی ایسا بزرگ جو جادۂ شریعت اور طریقت پر اور کتاب و سنت کی پیروی میں ان کی طرح استوار و مستقیم ہو، اور طالبین کی رہنمائی میں اس کا پایہ اتنا بلند اور اس کی توجہ اتنی قوی ہو ہمارے دور میں ان ملکوں میں سے کسی ملک میں جن کا اوپر ہم نے تذکرہ کیا پایا نہیں جاتا، دور ماضی اور بزرگان سلف میں بیشک ہو سکتا ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پُر ہے[2]"۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے خلفاء میں حضرت مولانا نعیم اللہ بہرائچی (۱۱۵۳ھ - ۱۲۱۸ھ) مصنّف "معمولات مظہریہ" اور بیہقیِ وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) مصنّف "التفسیر المظہری" و "مالابدّ منہ" اور مولانا غلام یحییٰ بہاری (م ۱۱۸۰ھ) جیسے سرآمد روزگار

---

[1] اصل نام شمس الدین حبیب اللہ تھا مظہر تخلص تھا، والد کا نام مرزا جان تھا، اسی نسبت سے عالمگیر مرحوم نے جانِ جان نام رکھا کہ فرزند جانِ پدر ہوتا ہے خلائق کی زبان پر جانِ جاناں جاری ہو گیا، مرزا صاحب نے شیخ محمد عابد سنامی خلیفۂ حضرت عبدالاحد وحدت کی خدمت میں بھی آٹھ سال رہے اور استفادہ کیا۔ [2] کلمات طیبات ص ۱۶۴، ۱۶۵

علماء و مشائخ تھے[۱] لیکن مرزا صاحب کے سلسلہ بلکہ طریقہ مجددیہ کی عالمگیر اشاعت ان کے خلیفۂ ارشد حضرت شاہ غلام علی بٹالوی[۲] (۱۱۵۶ھ ۔ ۱۲۴۰ھ) کے لئے مقدر تھی ان کو سلسلۂ مجددیہ کا مجدد بلکہ تیرہویں صدی میں سلوک الی اللہ اور تزکیہ و احسان (جس کا معروف نام تصوف ہے) کا مجدد کہنا صحیح ہوگا جن پر عجم و عرب کے طالبین نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا، ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہ ہوگا جہاں آپ کا کوئی خلیفہ نہ ہو صرف ایک انبالہ شہر میں آپ کے پچاس خلفاء تھے سر سید احمد خاں مرحوم "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں:-

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا، اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا۔"[۳]

شاہ رؤف احمد مجددی "دُرّ المعارف" میں صرف ایک روز کے طالبین کے مقامات کی فہرست لکھتے ہیں، جو ۲۸ جمادی الاولی ۱۲۳۱ھ کو دہلی کی اس خانقاہ میں استفادہ کے لئے حاضر تھے:

"سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امروہہ، سنبھل، رامپور، بریلی، لکھنؤ، جائس، بہرائچ، گورکھپور، عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدر آباد، پونا وغیرہ۔"[۴]

ان کے اس فیض عام کو دیکھ کر ان کے مسترشد مولانا خالد رومی کا فارسی کا یہ شعر بالکل واقعہ کی تصویر ہے ؎

لہ خلفاء و مریدین کبار کے لئے ملاحظہ ہو مقامات مظہری۔ از ص۶۴ اس میں جن خلفاء کے نام دیئے ہیں ان کی تعداد ۴۳ ہے

۲ہ آپ کا اصل نام عبداللہ تھا شاہ غلام علی کے نام سے شہرۂ آفاق ہوئے، ۳ہ آثار الصنادید باب چہارم ۴ہ در المعارف ص۱۰ مطبع نامی

خبر از من دہید آں شاہ خوباں را بہ پنہانی
کہ عالم زندہ شد بار دگر از ابر نیسانی[۱]

حضرت شاہ غلام علیؒ کے بڑے بڑے جلیل القدر خلفاء ہوئے ان میں سے حضرت شاہ سعد اللہ جن کے خلیفہ شاہ محمد نعیم معروف بہ مسکین شاہ صاحب (م ۱۲۶۴ھ) تیرہویں صدی کے وسط میں حیدر آباد تشریف لائے اور طویل قیام فرمایا، آصف جاہ ششم اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں ان کے ارادت مند تھے[۲] شاہ سعد اللہ صاحب کے دوسرے خلیفہ سید محمد پادشاہ بخاری (م ۱۳۲۵ھ) تھے[۳] حضرت شاہ غلام علی صاحب کے ایک خلیفہ حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددی (۱۲۰۱ھ ۔ ۱۲۶۶ھ) نے بھوپال میں خانقاہِ مجددیہ کی بنیاد ڈالی[۴] بہرائچ میں مولانا شاہ بشارت اللہ بہرائچی (م ۱۲۵۴ھ) نے سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ کی اشاعت کی، بخارا میں شیخ گُل محمد شیخ الکل بنے ہوئے تھے، اور انھوں نے سلسلۂ مجددیہ کا فیضِ عام کر رکھا تھا[۵]، شیخ احمد بغدادی قادری نے بغداد سے آکر بیعت و اجازت حاصل کی[۶]۔

مولانا خالد رومی

عراق و شام اور ترکی میں حضرت شاہ غلام علی صاحب کے سلسلہ کی اشاعت کا کام اللہ نے ایک کردی فاضل اجل مولانا خالد رومی سے لیا، جو اپنے ملک میں حضرت کے فیض و ارشاد

لہ یہ انسٹھ شعر کا قصیدہ ہے جو شاہ عبدالغنی محدث دہلوی نے پورا نقل کیا ہے ۲ہ مخبر دکن مدراس ۲۷ جنوری ۱۸۹۶ء

۳ہ جن کے خلیفہ مولانا سید عبداللہ شاہ صاحب (م ۱۳۸۴ھ) مصنف "زجاجۃ المصابیح" مدت دراز تک حیدر آباد میں سرگرم تربیت و ارشاد رہے۔ ۴ہ جس کو پیر ابو احمد صاحب اور ان کے فرزند ارجمند مولانا شاہ محمد یعقوب صاحبؒ نے اپنے اپنے وقت میں آباد کیا۔ ۵ہ در المعارف ص۱۲۵ ۶ہ ایضاً ص۱۴۴

کا آوازہ سن کر ہمہ تن شوق و بے قراری بن کر منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے ایک سال میں دہلی پہونچے اور آستانہ پر آکر ایسے پڑے کہ تکمیل سلوک کی منزلیں طے کر کے اجازت وخلافتِ خاصہ سے مشرف ہوئے، اس عرصہ میں ان کی یکسوئی کا عالم یہ تھا کہ دہلی کے علماء ومشائخ جو ان کے فضل وکمال کی شہرت برسوں سے سنتے تھے ملنے آتے تو فرما دیتے کہ فقیر جس مقصد کے لئے آیا ہے، اس کے حصول کے بغیر کسی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، مسندِ وقت سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب آئے کہ القادم یُزار (باہر سے آنے والے سے خود ملنے جاتے ہیں) اور حضرت شاہ ابوسعید صاحب نے جو ان کے شاگردِ رشید تھے، عرض کیا کہ استاد الہند آپ کی ملاقات کے لئے آئے ہیں، فرمایا کہ سلام کہو اور کہو کہ مقصد براری کے بعد میں خود حاضر ہوں گا۔

وطن واپس گئے تو طالبینِ خدا پروانہ وار ٹوٹ پڑے اور ایسا رجوع ہوا کہ باید وشاید، مولانا شاہ رؤف احمد صاحب مجددی اپنی کتاب دُرُّ المعارف میں جمعہ ۲۴ رجب ۱۲۳۱ھ کی روداد میں لکھتے ہیں کہ "ایک مغربی بزرگ حضرت کا نامِ مبارک سن کر منزلوں پر منزلیں قطع کر کے بغداد میں مولانا خالد رومی سے ملتے ہوئے حاضر ہوئے انھوں نے مولانا کی مقبولیت ومرجعیت کا حال بیان کیا کہ تقریباً ایک لاکھ آدمی حلقہ بگوشِ ارادت اور بیعت سے مشرف ہوچکے ہیں، ایک ہزار عالم متبحر داخلِ طریقہ ہوکر مولانا کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں"[1]

خود مولانا خالد نے حضرت شاہ ابوسعید کے نام جو خط لکھا ہے اس میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"تمام مملکت روم وعرب اور حجاز وعراق اور بعض ممالک عجم اور سارا کردستان طریقہ عالیہ نقشبندیہ

۱؎ درالمعارف ص۱۷

کی تاثیرات وجذبات سے سرشار ہے، اور شب وروز تمام محافل ومجالس، مساجد ومدارس میں حضرت امام ربانی مجدد ومنور الف ثانی کے محاسن ومحامد کا ذکر اس طرح ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے کہ اس کا گمان نہیں ہوسکتا کہ کبھی کسی ملک میں اور کسی وقت میں گوشِ زمانہ نے ایسا زمزمہ سنا ہو یا چشمِ فلک نے ایسی رغبت اور ایسا اجتماع دیکھا ہو۔۔۔۔۔۔ اگرچہ اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ایک طرح کی گستاخی اور خود بینی ہے، یہ فقیر اس پر شرمندہ ہے محض دوستوں کے حق کو مقدم جان کر اس نے بے ادبی کی جرأت کی ہے"[1]

علامہ ابن عابدین مشہور بہ علامہ شامی مصنف "ردّ المحتار شرح الدر المختار" مولانا خالد رومی کے شاگرد و دوست گرفتہ تھے، انھوں نے ان کے مناقب میں پورا رسالہ "سلّ الحسام الهندی لنصرة مولانا خالد النقشبندی" کے نام سے تصنیف کیا ہے[2] جو اصلاً ایک رسالہ کی تردید میں ہے جو بعض حاسدین نے مولانا خالد کی مخالفت وتضلیل میں لکھا تھا، رسالہ کے آخر میں مختصر حالات لکھے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیمانیہ کے قریب قصبہ قرہ داغ کے رہنے والے تھے ۱۱۹۰ھ میں ولادت ہوئی اساتذہ وقت سے علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی اور معقولات، ریاضیات، ہیئت وغیرہ میں بھی کمال پیدا کیا، پھر سلیمانیہ واپس آکر حکمت علم کلام وبلاغت کی انتہائی کتابیں پڑھائیں ۱۲۲۰ھ میں حج بیت اللہ وزیارت سے مشرف ہوئے مکہ معظمہ میں دہلی جانے کا اشارہ غیبی پایا، پہلے شام واپس آئے، وہاں ایک ہندوستانی سے حضرت شاہ غلام علی صاحب کا ذکر سنا اس کی بنا پر ۱۲۲۴ھ میں ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے اور ہر جگہ اپنے علم کا سکہ منواتے ہوئے لاہور کے

۱؎ ترجمہ ماخوذ از مقالہ مولانا عبدالشکور صاحب مشمولہ تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانی"

۲؎ شامل مجموعہ رسائل ابن عابدین طبع جدید سہیل اکیڈمی لاہور پاکستان۔

راستہ سے پورے ایک سال کی مدت میں دہلی پہونچے، دہلی پہونچ کر عربی میں قصیدۂ شوقیہ کہا جس کا مطلع ہے ؎

کملت مسافة کعبة الآمال

حمدا لمن قد من بالاکمال

ایک سال نہیں گذرا تھا کہ طرق خمسہ میں اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے اور پھر اپنے مرشد کے حکم موکد سے وطن کی طرف واپس ہوئے، بغداد پہونچ کر تربیت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا، پانچ مہینے وہاں قیام کرکے وطن واپس ہوئے، ۱۲۲۸ھ میں پھر بغداد واپس ہوئے وہاں ان کی قبولیت اور رجوع عام دیکھ کر لوگوں کو حسد ہوا، اوران کے خلاف ایک فتنہ کھڑا کیا گیا، والیٔ بغداد سعید پاشا کی طرف سے بعض علماء کو اس کی تردید کا ایما ہوا، علمائے بغداد نے اپنی مہروں سے مزین کرکے ان کی برأت اوران کے عالی مرتبہ ہونے کا فتویٰ دیا، کردوں، اہل کرکوک، اربل، موصل، عمادیہ، عنتاب، حلب، شام، مدینۂ منورہ، مکۂ معظمہ اور بغداد کے ہزاروں آدمیوں نے ان سے نفع اٹھایا۔

مصنف نے اس کے بعد ان کے اخلاق فاضلہ کا ذکر اوران کی تصنیفات کی فہرست پیش کی ہے، انھوں نے اپنے زمانہ کے مشہور ادیب اور شاعر شیخ عثمان سند کی بھی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے، جو مولانا خالد کے حالات میں لکھی گئی ہے اوراس کا نام ہے "أصفی الموارد فی ترجمة حضرة سیدنا خالد" آخر میں مولانا خالد نے شام کو اپنا مستقر بنالیا انھوں نے ۱۲۳۸ھ میں اپنے خلفاء ومریدین کے ایک جم غفیر کے ساتھ شام کا سفر فرمایا، اور ملک شام گویا ان پر امنڈ آیا، سلوک وارشاد کے ساتھ علوم شرعیہ کی اشاعت، مساجد کی دوبارہ آبادی ورونق کی طرف بھی متوجہ رہے، بالآخر ۱۲۴۲ھ کے طاعون میں ۱۴ ذی القعدہ کو شہادت حاصل کی

اور قاسیون کے دامن میں مدفون ہوئے، مولانا نسباً عثمانی تھے، مؤلف رسالہ نے ان سے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے دیکھا کہ سیدنا عثمان بن عفان کا انتقال ہوگیا ہے، اور میں ان کی نماز جنازہ پڑھ رہا ہوں، انھوں نے فرمایا کہ یہ میری رحلت کا اشارہ ہے، میں ان کی اولاد ہوں، یہ خواب انھوں نے مغرب کے وقت بیان کیا تھا، اور مولانا خالد نے عشاء کی نماز پڑھ کر وصیت فرمائی، اور جانشین بنایا، گھر میں تشریف لے گئے اسی رات طاعون کا حملہ ہوا، اور انتقال فرماگئے[1]۔

حضرت شاہ احمد سعید اوران کے خلفاء

حضرت شاہ غلام علی صاحب کے اصل جانشین اوران کے سلسلہ کو چار دانگ عالم میں پھیلانے والے ان کے خاص تربیت یافتہ خاندان مجددی کے چشم وچراغ حضرت شاہ احمد سعید ابن شاہ ابوسعید (۱۲۱۷ھ - ۱۲۷۷ھ) تھے[2]، جنھوں نے اپنے والد حضرت شاہ ابوسعید کی وفات کے بعد ۱۲۵۰ھ میں حضرت شاہ غلام علی اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے سجادہ کو رونق بخشی اور کامل ۲۳ برس (۱۲۵۰ھ - ۱۲۷۳ھ) تک سرگرمی سے سلسلہ مجددیہ کی اشاعت میں سرگرم رہے، اور اسی سال (۱۸۵۷ء) میں مجبوراً ہندوستان اپنے آباواجداد کی خانقاہ کو خیر باد کہا، اور محرم ۷۴ھ میں دہلی سے روانہ ہوکر شوال ۷۴ھ میں مکۂ مکرمہ پہونچے، پھر مدینۂ طیبہ میں مستقل طور پر قیام اختیار کیا اور دوسال بقید حیات رہ کر وہیں آسودۂ خاک ہوئے، دوسال کے اس قلیل عرصہ میں ترک اور عرب سیکڑوں کی تعداد میں آپ سے بیعت ہوئے ایک شاہد عینی کے بقول "اگر آپ کی حیات وفا کرتی، اور یہ سلسلہ جاری رہتا تو آپ کے

[1] سل الحسام الہندی ص۳۱۸-۳۲۵، مولانا کا سلسلہ شام وترکی میں اب تک موجود ہے میں نے دمشق وحلب اور ترکی میں اس سلسلہ کے متعدد مشائخ کبار کی زیارت کی ہے۔ [2] مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۷، مقامات خیر از مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی۔

مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ جاتی ہے۔[1]

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے خلفاء کا استقصاء بہت دشوار ہے "مناقب احمدیہ"[2] میں اسّی حضرات کے نام مذکور ہیں، ہندوستان میں ان کے سلسلہ کی اشاعت ایک طرف شیخ دوست محمد قندھاری کے ذریعہ ہوئی جن کے خلیفۂ اعظم خواجہ عثمان دامانی (م ۱۳۱۴ھ) نے ڈیرہ اسماعیل خاں کے قصبہ موسیٰ زئی[3] میں بیٹھ کر فضا کو عشق کی حرارت اور نسبتِ نقشبندیہ کی سکینت سے معمور و مخمور کر دیا ان کے خلیفۂ اعظم خواجہ سراج الدین (م ۱۳۳۳ھ) نے اس سلسلہ کو دور تک پہونچا دیا، اللہ نے ان کو وجاہت عظیم عطا فرمائی، اور انھوں نے ارشاد و تربیت اور عزم استقامت و اشتغال بالحدیث کے ساتھ اپنے اسلافِ کرام کے سجادہ کو آباد رکھا، خواجہ سراج الدین کے خلیفہ مفسر قرآن اور داعی الی التوحید واں بھچراں[3] کے مولانا حسین علی شاہ صاحب (۱۲۸۳ھ۔۱۳۶۳ھ) ہوئے ان سے اِس پیمانہ پر اصلاحِ عقائد کا کام ہوا، اور توحید خالص کا آوازہ بلند ہوا جس کی نظیر اس زمانہ میں مشکل ہے۔

اسی زمانہ میں سلسلہ مجددیہ کے ایک بڑے شیخ شاہ امام علی (۱۲۱۲ھ۔۱۲۸۲ھ) مکانوی[4] تھے، جن کے رجوع عام و مقبولیت کا حال یہ تھا کہ ان کے باورچی خانہ میں روزانہ مہمانوں کے لئے تین سو[3] بکرے ذبح ہوتے تھے[5] ان کا سلسلہ حضرت عبدالاحد قدس معروف بشاہ گل کے ذریعہ حضرت مجدد تک پہونچتا ہے۔

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے ایک جلیل القدر خلیفہ مولانا شاہ سید عبدالسلام صاحب واسطی ہسوی (۱۲۳۴ھ۔۱۲۹۹ھ) تھے جو بڑے عالی نسبت و صاحبِ استقامت شیخ تھے، اور جن سے صوبجات متحدہ میں طریقہ کی اشاعت ہوئی۔[6]

---

[1] مکتوب شاہ محمد عمر بن شاہ احمد سعیدؒ بنام مولانا سید عبدالسلام ہسویؒ۔ [2] تالیف شاہ محمد مظہرؒ [3] ضلع میانوالی مغربی پنجاب [4] مکان شریف ضلع گرداسپور میں ایک قصبہ ہے جس کا پرانا نام رز چھتر ہے۔ [5] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۂ بے مثل راجگان راجوراز مرزا ظفر اللہ خاں ص ۵۰۰۔۵۲۱ [6] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۷

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے ایک فرزند حضرت شاہ عبدالرشید تھے (۱۲۳۶ھ۔۱۲۸۷ھ) (جن سے نواب کلب علی خاں والیِ رامپور نے تربیت حاصل کی) اپنے والد ماجد کے بعد مدینۂ منورہ میں ان کے جانشین و قائم مقام ہوئے آخر میں مکہ مکرمہ آ گئے تھے اور وہاں طالبین کی تربیت میں مشغول رہ کر راہی ملک بقا اور جنت المعلاۃ میں آسودۂ خاک ہوئے، آپ کے صاحبزادہ شاہ محمد معصوم (۱۲۶۳ھ۔۱۳۴۱ھ) نے رامپور میں خانقاہ معصومی کی بنیاد رکھی، ۳۲ سال رامپور میں قیام رہا اور ۱۳۴۱ھ میں مکۂ معظمہ میں وفات پائی۔[1]

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے دوسرے فرزند شاہ محمد مظہر (۱۲۴۸ھ۔۱۳۰۱ھ) بڑے قوی النسبت اور کثیر الارشاد بزرگ تھے، سمرقند، بخارا، قزان، ارض روم، افغانستان وایران، جزیرۃ العرب اور شام کے صدہا طالبین راہِ خدا فیض یاب ہوئے، ۱۲۹۰ھ میں مدینۂ منورہ میں نہایت عمدہ سہ منزلہ خانقاہ تعمیر کی جو رباط مظہری کے نام سے مشہور ہے، یہ باب النساء اور جنت البقیع کے درمیان واقع ہے۔

تیسرے صاحبزادہ شاہ محمد عمر تھے (۱۲۴۴ھ۔۱۲۹۸ھ) ان کے صاحبزادہ حضرت شاہ ابوالخیر مجددی تھے۔

حضرت شاہ عبدالغنی

حضرت شاہ احمد سعید صاحب کے برادر خورد لیکن عالی مرتبت بھائی محدث جلیل حضرت شاہ عبدالغنی (۱۲۳۵ھ۔۱۲۹۶ھ) جنھوں نے درسِ حدیث اور سلوک و تصوف کو اس طرح جمع کیا جس کی نظیر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ذات کو مستثنیٰ کر کے ملنی مشکل ہے،

---

[1] آپ کے فرزند مولانا ابوسعید بقید حیات ہیں۔

دولت باطنی اور نسبت مجددی کے حامل اور شیخ کامل ہونے کے ساتھ وہ حدیث میں استاذ الہند
.....اور شیخ وقت تھے، جن کے حلقۂ تدریس میں مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی
جیسے علمائے اعلام تیار ہوئے اور ہندوستان میں حدیث کا سکہ رواں ہوا اور دیوبند و
مظاہر علوم کے جیسے عظیم مدارس تدریسِ حدیث کے مرکز قرار پائے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز
میں وہ بھی اپنے برادرِ معظم کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر گئے اور مدینۂ طیبہ میں مستقل
اقامت اختیار کی اور علامہ شیخ علی متقی صاحبِ "کنز العمال" کی سنت کو زندہ کر کے حرمین شریفین
میں مدت العمر خدمت حدیث میں مشغول رہے، اور عرب و عجم کو فیض پہونچا کر بقیع میں
آسودۂ خاک ہوئے۔[1]

شاہ عبد الغنی صاحب کے تین نامور خلفاء مولانا عبد الحق الہ آبادی مہاجر مکی جو
صاحبُ الدلائل کے نام سے مشہور ہیں (م ۱۳۳۳ھ) شاہ ابو احمد مجددی بھوپالی (م ۱۳۴۲ھ)
اور حضرت شاہ رفیع الدین دیوبندی مہتمم اول دار العلوم دیوبند (م ۱۳۰۸ھ) (جن سے حضرت
مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی (م ۱۳۴۷ھ) کو خلافت حاصل تھی) انھیں کے خلیفہ و
مجاز تھے، حضرت شاہ احمد سعید اور حضرت شاہ عبد الغنی صاحب کے ہندوستان سے ہجرت
کر جانے کے بعد یہ خانقاہِ والاشان جو نصف صدی سے زاید مدت تک آباد و معمور تھی خالی ہو گئی،[2] بالآخر

---

[1] ان کے شاگرد رشید شیخ محمد یحییٰ ترہتی نے ان کے اور ان کے مشائخ کے حالات میں عربی میں مستقل کتاب لکھی ہے، اس کا نام "الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی" ہے، اور وہ ایک ہندوستانی اہل قلم کی عربیت و انشا کا بہترین نمونہ ہے۔

[2] مصنف کی نظر سے مولانا سید عبد السلام ہسوی کا ایک خط گذرا ہے جو موصوف نے ایک ایسے صاحب کو جواب میں لکھا تھا جنھوں نے ان حضرات کے تشریف لے جانے کے بعد خانقاہ کے خالی ہو جانے کا شکوہ کیا ہے حضرت شاہ عبد الغنی صاحب نے مدینہ طیبہ سے جواب دیا کہ مولانا عبد السلام صاحب ہسوی کو لے جاؤ اور ہماری جگہ پر بٹھاؤ اس وقت وہ اس جگہ پر بیٹھنے کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔

اسی خاندان والاشان کے چشم و چراغ اور اس سلسلہ کے ایک جلیل القدر شیخ حضرت شاہ ابو الخیر
مجددی (۱۲۷۲ھ۔۱۳۴۱ھ) نے جو شاہ احمد سعید صاحب کے صاحبِ نسبت و باکمال پوتے تھے،
اس کو آباد کیا، اور جلد وہ خانقاہ پھر مرجع خلائق بن گئی۔[1]

حضرت مجدد کا خاندان والاشان چوتھی پانچویں پشت کے بعد سرہند سے نکل کر
اطرافِ عالم میں منقسم ہو گیا، اس میں اسلاف کرام کی قبور کی مجاوری سے حفاظت کے علاوہ
(جس کے بہت سے مفاسد تجربہ اور مشاہدہ میں آچکے ہیں) حضرت مجدد کے طریق کی اشاعت
اور دعوت و تبلیغ کے بہت سے مصالح مضمر تھے، چنانچہ ایک شاخ کابل میں (جس کا آخری
مرکز قلعۂ جواد تھا[2]) عزت و وقار اور افادہ و ارشاد کے ساتھ مقیم رہی، حضرت نور المشائخ شیخ
فضل عمر مجددی معروف بہ شیر آغا اسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے، جن کے مریدوں کی تعداد
سیکڑوں سے متجاوز تھی، اور ہندو پاکستان میں پھیلے ہوئے تھے،[3] ان کے برادر اصغر شیخ محمد صادق
مجددی مشرق وسطی میں افغانستان کے سابق سفیر اور رابطہ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے
رکن اپنے علم و صلاح و تقویٰ اور اسلامی مسائل سے دلچسپی کی وجہ سے عرب ممالک میں عزت کی نگاہ
سے دیکھے جاتے تھے، اس عوامی تحریک میں ان دونوں بھائیوں نے مرکزی و قائدانہ کردار ادا کیا تھا، جس کے
نتیجہ میں امیر امان اللہ خاں کو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا اور نادر شاہ تخت نشین ہوئے۔[4]

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "مقامات خیر" از مولانا شاہ ابو الحسن زید فاروقی سجادہ نشین خانقاہ حضرت شاہ ابو الخیرؒ

[2] افسوس ہے کہ روسی افواج کی یلغار اور اشتراکیت نواز افغانی حکومتوں کی دستبرد سے یہ مرکز تاراج اور اس کے آباد رکھنے والے علماء و مشائخ اسیر و جلاوطن ہوئے، خاکسار مصنف نے ۱۹۷۳ء کے دورۂ افغانستان و ایران میں اس مرکز کو آباد و گلزار دیکھا تھا، اور مولانا محمد ابراہیم نور المشائخ کی بزرگانہ عنایتوں سے مشرف ہوا تھا۔

[3] ۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۶ھ میں ان کا انتقال ہوا راقم الحروف نے مکہ معظمہ اور لاہور میں ان کی زیارت کی ہے

[4] "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" از مصنف ص ۴۲۔۴۳

سندھ میں بھی اس خاندان کی ایک موقر شاخ قصبہ ٹنڈہ سائیں داد حیدر آباد سندھ میں مقیم تھی اسی شاخ میں خواجہ محمد حسن مجددی اور ان کے صاحبزادہ حافظ محمد ہاشم جان مجددی معروف وممتاز تھے[1]، مدینہ طیبہ اور مکہ مکرمہ میں بھی مجددی خاندان کی شاخیں موجود ہیں، اور وہ وضع داری اور اپنی خاندانی روایات کے ساتھ معاش ومعاد کے شریفانہ مشاغل میں مشغول اور نیک نام ہیں۔

سلسلۂ احسنیہ اور اس کے شیوخ کبار

حضرت سید آدم بنوری اگرچہ حضرت مجدد کے طریقۂ عالیہ کے خوشہ چیں اور ان کے آغوش تربیت کے پروردہ ہیں، لیکن اپنی استعداد عالی اور فطرت ارجمند کی بنا پر سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ میں بھی ایک خاص رنگ کے حامل اور ایک (ذیلی) طریقہ کے بانی ہیں، جس کو بہت سی مجتہدانہ خصوصیات کی بنا پر "طریقۂ احسنیہ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، حکمتِ الٰہی کی یہ جلوہ گری تھی کہ جس خانوادہ عالی کی بنیاد ایک امی کے ہاتھ سے پڑی اس کے حصہ میں ہندوستان کے ممتاز ترین علماء، محدثین، اساتذۂ وقت، ناشرین کتاب وسنت، داعی ومصلح، عظیم مدارسِ دینیہ کے بانی اور مصنف ومحقق آئے اور وہ اس بارے میں بھی اپنے جد امجد کی سنت کے پیرو اور ان کی میراث کے وارث ہیں حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز داعی الی اللہ ومجاہد فی سبیل اللہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید، مسند الہند حضرت شاہ اسحٰق دہلوی، بانئ دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی، عالم ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی،

---

[1] راقم نے ۱۹۴۴ء میں حضرت شاہ محمد حسن مجددی کی ان کے قصبہ اور خانقاہ میں زیارت کی وہ صاحب علم وتصنیف بزرگ تھے، مولانا حافظ ہاشم جان کی نظام الدین دہلی میں آمد ورفت تھی، اور راقم کے وطن دائرۂ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں بھی ایک بار تشریف لائے ہیں رحمہ اللہ کابل و ٹنڈہ سائیں داد کی دونوں مجددی شاخیں حضرت شیخ غلام محمد معصوم مشہور بہ معصوم ثانی پر جا کر مل جاتی ہیں، جو حضرت خواجہ محمد معصوم کے پوتے تھے۔

اسی سلسلہ احسنیہ کے شیوخ کبار کے ذریعہ طریقہ مجددیہ نقشبندیہ میں داخل اور اس میں صاحب اجازت وخلافت ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے طُرق تصوف کے مبصر اور نسبتوں کے رمز شناس حضرت سید آدم بنوری کے متعلق بڑے بلند الفاظ لکھتے ہیں، اور ان کو سلوک واحسان کے فن کے مجتہدین اور مستقل سلسلوں کے بانیوں میں شمار کرتے ہیں۔

حضرت سید آدم بنوری کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور ان کا استقصاء اس مختصر باب میں مشکل ہے، "نزہۃ الخواطر" میں حسب ذیل حضرات کے نام آئے ہیں، جن کو حضرت سید آدم بنوریؒ سے نسبت وارادت اور بعض کو خلافت واجازت حاصل تھی، دیوان خواجہ احمد نصیر آبادی (م ۱۰۸۸ھ) شیخ بایزید قصوری (م ۱۰۹۰ھ) شاہ فتح اللہ سہارنپوری (م ۱۱۰۰ھ) شیخ سعد اللہ بلخاری لاہوری (م ۱۱۰۸ھ) لیکن ان کے سلسلہ کی اشاعت حسب ذیل چار خلفاء سے ہوئی جو ان کی مجتہدانہ تربیت وتعلیم کا نمونہ اور ان کی یادگار تھے حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی (۱۰۳۳ھ - ۱۰۹۶ھ) حضرت شیخ سلطان بلیاوی، حضرت حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی، شیخ محمد شریف شاہ آبادی۔[1]

حضرت سید شاہ علم اللہ اور ان کا خاندان

حضرت سید شاہ علم اللہ[2] کے متعلق حضرت سید نے ہجرت کے وقت فرمایا تھا کہ "سید

---

[1] ان کے ایک بڑے خلیفہ عبدالنبی (شام چوراسی ضلع جالندھر) تھے جو اپنے زمانہ کے بڑے عارف قوی النسبت شیخ تھے اور جن کی ولایت وجلالت شان پر اس زمانہ کے لوگوں کا اتفاق ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں ان کا ایک لطیف مکتوب نقل کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نزہۃ الخواطر" ج ۶

[2] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو "سید احمد شہید" از مولانا غلام رسول مہر حصۂ اول "سیرت سید احمد شہید" حصۂ اول از مصنف "تذکرہ شاہ علم اللہ" از مولوی محمد الحسنی مرحوم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے ملاحظہ ہو ص ۱۲

خاطر جمع ہو کر جاؤ اور اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ تمہاری نسبت مشائخ اودھ میں ایسی ہوگی جیسی ستاروں[1]
میں آفتاب کی" خواجہ محمد امین بدخشی کی جو حضرت سید آدم بنوری کے مجاز و مقرب ہیں ان کے
متعلق شہادت ہے کہ "دنیا کی بو بھی اپنے پاس نہیں آنے دیتے ہندوستان و عرب میں بھی ان کے
تقویٰ و استقامت کا غلغلہ ہے .... اکثر لوگ ان کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ شاید صحابہ کرامؓ
ایسے ہی ہوں گے"۔ صاحب "بحر زخار" نے آپ کے تذکرہ میں یہ لفظ لکھے ہیں "مجاہداتیکہ ازاں یگانۂ
زمانہ درباب نفرت دنیا باتباع طریقہ نبویہ بظہور آمدہ بعد از صحابہ کرام در دیگر اولیاء امت
متاخرین کم تر یافتہ می شود" ان کا بیان ہے (جب آپ نے سفر حج فرمایا تو) مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ
کے لوگ آپ کی اس قوت عمل، کمال اتباع اور عزیمت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ "ھذا کابی ذرؓ"
یعنی شاہ علم اللہ صاحبؒ اس زمانے میں ابوذر غفاریؓ کا نمونہ ہیں، اور یہ فقرہ حرمین میں زبان زد
ہو گیا تھا، اس اتباع کامل کا نتیجہ تھا کہ انتقال کی شب کو عالمگیرؒ نے خواب دیکھا کہ آج کی
رات جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، بادشاہ کو اس خواب سے بہت تشویش
ہوئی، علماء سے تعبیر دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ اس رات سید شاہ علم اللہ کی وفات ہوئی
ہوگی کہ وہ اتباع سنت میں رسول اللہؐ کے قدم بقدم تھے، سرکاری وقائع نگار کی اطلاع
سے معلوم ہوا کہ اس شب کو جناب ممدوح نے انتقال کیا۔[2]

آپ کے خاندان میں سلسلہ احسنیہ مسلسل طریقہ پر جاری رہا جس میں آپ کے فرزند
چہارم حضرت سید محمد (م ۱۱۵۶ھ) ان کے صاحبزادہ حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل
صاحب (م ۱۱۹۲ھ) حضرت سید محمد صابر بن سید آیت اللہ بن شاہ علم اللہ (م ۱۱۶۳ھ)

---

[1] نتائج الحرمین بحوالہ شیخ عبدالحکیم [2] بحر زخار از شیخ وجیہ الدین اشرف میں مفصلاً اور درالمعارف مجموعہ ملفوظات حضرت شاہ غلام علی مرتبہ حضرت شاہ رؤف احمد مجددی صہ ۴۶ میں مجملاً اس رویائے صادقہ کا ذکر ہے۔

حضرت شاہ ابوسعید ابن سید محمد ضیاء ابن سید آیت اللہ بن علم اللہ (م ۱۱۹۳ھ) حضرت سید
محمد واضح ابن[1] سید محمد صابر، مولانا سید محمد ظاہر حسنی (م ۱۲۰۸ھ) مولانا سید خواجہ احمد بن یٰسین
نصیر آبادی (م ۱۲۸۹ھ) اور حضرت شاہ ضیاء النبی (م ۱۳۲۶ھ) بڑے پائے کے بزرگ اور
عالی مرتبت مشائخ گذرے ہیں جن سے ہزارہا انسانوں کو ایمان و احسان کی دولت عمل بالشریعت
اور اتباع سنت کی توفیق حاصل ہوئی۔[2]

شیخ سلطان بلیاوی

حضرت سید آدم بنوری کے دوسرے خلیفۂ اجل حضرت شیخ سلطان بلیاوی تھے،[3]
"نتائج الحرمین" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید آدم کے خلفاء کبار میں تھے، اکثر ان کا نام حضرت
شاہ علم اللہ صاحبؒ کے ساتھ آتا ہے۔[4]

حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی اور سلسلہ ولی اللّٰہیہ

حضرت سید آدم بنوری کے تیسرے خلیفۂ اجل جن سے ان کے سلسلہ کی سب سے
زیادہ اشاعت ہوئی حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی تھے، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ
دہلوی کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی (م ۱۱۳۱ھ) انھیں کے خلیفہ و

---

[1] آپ کی وفات تیرہویں صدی کی ابتدا میں ہوئی۔ [2] حالات کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۶-۷۔
[3] یہ بلیا صوبہ بہار میں گنگا کے کنارہ آباد تھا اب یہ جگہ کھمیا (ضلع بیگو سرائے) کے نام سے معروف ہے، مونگیر کے
مقابل دریا کے دوسرے کنارہ پر ہے۔ [4] افسوس ہے کہ ان کے حالات و ملفوظات محفوظ نہیں رہے
اب اس قصبہ میں ان کا خاندان آباد ہے۔

تربیت یافتہ تھے[1] حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کا سلسلہ جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور پھر ان کے توسط سے حضرت حاجی عبدالرحیم شہید ولایتی، میاں جی نور محمد جھنجھانوی اور ان کے توسط سے شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کے خلفاء مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، پھر مولانا رشید احمد گنگوہی کے وساطت سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت شاہ عبدالرحیم کے خلفاء میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، اور مولانا خلیل احمد صاحب کے خلفاء میں حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی بانی سلسلہ تبلیغ نظام الدین اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو سلسلہ احسنیہ مجددیہ سے انتساب ہے اور وہ اس طریقہ میں مجاز و صاحبِ ارشاد ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے متعلق اس باب میں کچھ لکھنا تو ممکن نہیں کہ؎

سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کے لئے

ان کا تذکرہ تاریخ دعوت و عزیمت کی ایک مکمل جلد کا طالب ہے جو شاید اس سلسلہ کی پانچویں جلد ہو حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب کی شہادت گذر چکی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق حضرت شاہ غلام علی صاحب نے "مقامات مظہری" میں مرزا صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔

"شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک نئے طریقہ کی وضاحت فرمائی ہے، حقائق و معارف کے اسرار اور

---

[1] حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی کے فضائل و مناقب کے لئے ملاحظہ ہو "انفاس العارفین" ص ۱۵۰ تا ۱۵۱ حضرت شاہ عبدالرحیم کے حالات و کمالات کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے "انفاس العارفین" تصنیف فرمائی اور تفصیل کے ساتھ ان کا اور ان کے خاندان کا تذکرہ فرمایا، یہ کتاب ۱۳۳۵ھ مطبع مجتبائی میں طبع ہوئی ملاحظہ ہو ص ۱۵ تا ۸۷

علوم کے دقائق و غوامض کے بیان کرنے میں ان کا ایک خاص اسلوب ہے، علماء میں وہ ربانی کے لقب کے مستحق ہیں،۔۔۔ ان صوفیاء محققین میں بھی۔۔۔۔۔۔ جو علم ظاہر و باطن کے جامع تھے ایسے لوگ انگلیوں پر شمار کرنے کے قابل ہیں جنھوں نے ان کی طرح ئے علوم و مضامین کے بارہ میں زبان کھولی[1]"۔

امام معقولات علامہ فضل حق خیر آبادی نے جب شاہ صاحب کی تصنیف "ازالۃ الخفا" دیکھی تو اپنے تلامذہ کے سامنے برملا کہا کہ "اس کتاب کا مصنف ایک بحر زخار ہے جس کا ساحل نظر نہیں آتا" عالم جلیل مفتی عنایت احمد کاکوروی کا مقولہ ہے کہ "شاہ ولی اللہ صاحب کی مثال شجرۂ طوبیٰ کی ہے جس کی جڑ ان کے گھر میں ہے اور اس کی شاخ ہر مسلمان کے گھر میں ہے[2]"، جہاں تک حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا تعلق ہے ان کی جامعیت، معقولات، منقولات، فنون ادبیہ میں یکساں مہارت، قوت تدریس، اشاعت علم حدیث، افاضۂ باطنی، حسن تربیت، قدرت تصنیف، حلاوت کلام، وسعت اخلاق، ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے دلسوزی و دردمندی اور کثرت فیضان میں ان کی نظیر دور دور مشکل ہے[3]۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت

جہاں تک حضرت سید احمد شہیدؒ کا تعلق ہے جن کا خصوصی تعلق سلسلۂ احسنیہ مجددیہ سے تھا، تو ان کے حالات پر ضخیم کتابیں تیار ہو چکی ہیں، جن میں "سید احمد شہیدؒ" از مولانا غلام رسول مہر (۱، ۲، ۳، ۴) اور "سیرت سید احمد شہیدؒ" از مصنف (۱، ۲) کا مطالعہ کافی

---

[1] مقامات مظہری مطبوعہ مطبع احمدی ص ۶۰، ۶۱
[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۶
[3] حالات و کمالات کی قدرے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۷۔

ہے[1] ان کا اس عہد اور ہندوستان کی تاریخ پر جو گہرا اثر پڑا، اور ان سے اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق، اشاعت اور حفاظت اسلام کا جو عظیم الشان کام لیا اس کے متعلق چند شہادتوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس عہد کے ایک صاحبِ نظر عالم مولوی عبدالاحد صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے، اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلۂ بیعت آپ کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کے ذریعہ روئے زمین پر جاری ہے، اس سلسلہ میں کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں"۔[2]

مشہور عالم ربانی مجاہد فی سبیل اللہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی (م ۱۲۶۹ھ) تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہزارہا انسان اپنا دین چھوڑ کر اسلام سے مشرف ہوئے اور ہزارہا لوگوں نے مذاہب باطلہ سے توبہ کی، پانچ چھ برس کے عرصہ میں ہندوستان کے تیس لاکھ آدمیوں نے حضرت سے بیعت کی اور سفر حج میں تقریباً لاکھ آدمی بیعت سے مشرف ہوئے"۔[3]

ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصنف و مؤلف نواب سید صدیق حسن خاں والیٔ بھوپال (م ۱۳۰۷ھ) جنھوں نے آپ کی تعلیم و تربیت کے اثرات کو خود دیکھا تھا، اور ان کے دیکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت کا زمانہ پایا تھا "تقصار جیود الاحرار" میں لکھتے ہیں:۔

"خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے، ایک بڑی خلقت اور ایک بڑی دنیا آپ کی قلبی و جسمانی توجہ سے درجۂ ولایت کو پہونچی آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا، اور کتاب و سنت کی شاہراہ پر ڈال دیا ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں"۔

---

[1] مصنف کے مختصر رسالہ "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" کا مطالعہ بھی اس سلسلہ میں مفید ہوگا۔

[2] سوانح احمدی [3] رسالہ دعوت مشمولہ مجموعۂ رسائل تسعہ از مولانا ولایت علی عظیم آبادی ص ۶۵

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحبِ کمال سُنا نہیں گیا، اور جو فیض اس گروہِ حق سے خلقِ خدا کو پہونچے ان کا عشر عشیر بھی اس زمانہ کے علماء و مشائخ سے نہیں پہونچا"۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سید صاحب ہی کے واسطہ سے اکابر دیوبند و بزرگانِ صادقپور[1] سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ میں داخل اور صاحبِ اجازت و خلافت ہیں، ان حضرات سے اِس تختی بر اعظم میں علوم دینیہ کی جو اشاعت، مدارس کا جو قیام اور دعوت و اصلاح کا جو عظیم الشان کام عمل میں آیا اور جس سے کوئی صاحبِ انصاف انکار نہیں کر سکتا، وہ سب بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تجدید و اصلاح کے نتائج اور اس کے ثمرات و برکات کی فہرست میں شامل ہیں، کہ انھوں نے ہی گیارہویں صدی کے پُر آشوب دور کے آغاز میں اس کا راستہ ہموار کیا اس کے لئے سازگار حالات اور فضا پیدا کی دلوں میں اس کا جذبہ اور ولولہ بیدار کیا، اور ایک ایسی جماعت یادگار چھوڑی جس نے اپنے سوزِ دروں اور نورِ باطن سے دین کی اس شمع کو روشن و فروزاں رکھا اور پھر دیئے سے دیا جلتا رہا، اور اس ملک میں پھر کفر و جہالت اور شرک و بدعت کی تاریکی اس طرح پھیلنے نہیں پائی، جیسی کہ دسویں صدی کے آخر میں دیکھنے والوں کو نظر آرہی تھی، ان سے بلاواسطہ اور بالواسطہ نسبت رکھنے والی جماعت کو یہ کہنے کا حق ہوا کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل　　　قانون باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

---

[1] صادقپور پٹنہ کا ایک مشہور محلہ ہے جو سید صاحب علیہ الرحمہ کی تحریک جہاد و اصلاح کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جس نے اس کام کو آخر وقت تک جاری رکھا اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قربانیاں دیں، حضرت مولانا ولایت علی عظیم آبادی مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ، مولانا عنایت علی غازی، مولانا عبداللہ امیر جماعت مجاہدین (رحمہم اللہ) اور مولانا عبدالرحیم صادقپوری اس کے ممتاز فرد تھے "من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا"۔

حضرت مجدد کی تصنیفات و رسائل

ہم آخر میں حضرت مجدد کی تصنیفات کی فہرست پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں' ان کے مفصل تعارف کے لئے ناظرین کو مولانا سید زوار حسین شاہ کی فاضلانہ تصنیف "حضرت مجدد الف ثانیؒ" کے مضمون[1] "حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی تصانیف عالیہ" کے مطالعہ کا مشورہ دیں گے جس میں فاضل مصنف نے ان تصانیف عالیہ میں سے ہر ایک کا مفصل تعارف کرایا ہے' اور ان کے متعلق بیش قیمت مواد جمع کر دیا ہے[2]۔

۱۔ "اثبات النبوۃ" (عربی) اس کے قلمی نسخے مجددی خاندان کے کتب خانوں اور خانقاہوں میں محفوظ چلے آرہے تھے' کتب خانہ ادارہ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے ۱۳۸۳ھ میں اصل عربی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا' پھر ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور نے ۱۳۸۵ھ میں دیگر رسائل کے ساتھ اصل متن بغیر اردو ترجمہ کے شائع کیا۔

۲۔ "ردّ روافض" یہ رسالہ بعض ایرانی شیعہ علماء کے رسالہ کے جواب میں ہے' یہ رسالہ غالباً ۱۰۰۰ھ کے قریب لکھا گیا ہے' اس رسالہ کے بعض مضامین دفتر اول مکتوب ۸۰ اور ۲۰۲ میں بھی ملتے ہیں' اس رسالہ کا فارسی متن مکتوبات شریف فارسی کے آخر میں بہت سے مطابع نے شائع کیا' حشمت علی خاں صاحب نے ۱۳۸۴ھ میں رامپور سے اس کا فارسی متن پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا' پھر ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور نے فارسی متن علیحدہ اور اردو ترجمہ علیحدہ شائع کیا' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس رسالہ کی شرح لکھی ہے' جو طبع نہیں ہوئی۔

[1] شائع کردہ ادارۂ مجددیہ ۲/۵ ایچ ناظم آباد ۳ کراچی [2] ص ۶۷۶-۶۸۷

۳۔ "رسالہ تہلیلیہ" (عربی) یہ رسالہ ۱۰۱۰ھ میں مرتب ہوا' اس کے صرف قلمی نسخے پائے جاتے تھے' ادارہ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے ۱۳۸۴ھ میں عربی متن مع اردو ترجمہ اور ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور نے ۱۳۸۵ھ میں صرف عربی متن دیگر رسائل کے ساتھ شائع کیا۔

۴۔ "شرح رباعیات" اس میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی دو رباعیوں کی حضرت خواجہ کے قلم سے شرح اور حضرت مجدد صاحب کے قلم سے شرح الشرح ہے ، ادارہ سعدیہ مجددیہ لاہور اور ادارۂ مجددیہ ناظم آباد کراچی کی طرف سے علی الترتیب ۱۳۸۵ھ اور ۱۳۸۶ھ میں شائع ہوا' اس شرح رباعیات کی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی شرح فرمائی ہے، جو کشف الغین فی شرح رباعتین' کے نام سے مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۵۔ "معارف لدنیہ" (فارسی) یہ حضرت مجدد کے معارف خاصہ اور سلوک و طریقت کے اہم مباحث پر مشتمل ہے جس کو خود حضرت ہی نے ۱۰۱۵ھ یا ۱۰۱۶ھ میں مرتب فرمایا تھا' ہر مضمون کو "معرفت" کا عنوان دیا گیا ہے' ان معارف کی مجموعی تعداد اکتالیس (۴۱) ہے' اس رسالہ کا فارسی متن سب سے پہلے حافظ محمد علی خاں شوق نے مطبع احمدی رامپور سے دسمبر ۱۸۹۸ء میں شائع کیا' پھر مجلس علمی ڈابھیل' حکیم عبد المجید سیفی' ادارہ سعدیہ مجددیہ اور ادارۂ مجددیہ ناظم آباد کراچی لاہور نے مختلف سنین میں شائع کیا۔

۶۔ "مبدا و معاد" (فارسی) یہ رسالہ حضرت مجدد کے علوم و معارف پر مشتمل ہے' اس کے مضامین متفرق مسودات کی شکل میں تھے' جن کو حضرت مجدد کے خلیفہ مولانا محمد صدیق کشمی نے ۱۰۱۹ھ میں مدون و مرتب فرمایا' اور اس کے مضامین کو "منہا" کا عنوان دے کر الگ الگ کر دیا' ان مضامین کی مجموعی تعداد اکسٹھ (۶۱) ہے' مطبوعہ نسخوں میں سب سے قدیم فارسی نسخہ مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۷ھ کا مطبوعہ ہے' پھر متعدد بار مختلف سنین میں شائع ہوتا رہا' آخری بار ۱۳۸۸ھ میں

ادارہ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے فارسی متن مولانا سید زوار حسین شاہ کے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا، اس رسالہ "مبدا و معاد" کا عربی ترجمہ شیخ مراد مکی کے قلم سے مکتوبات معرب مطبوعہ کے حاشیہ پر موجود ہے۔

۷۔ **"مکاشفات عینیہ"** یہ مجموعہ حضرت مجدد کے ایسے مسودات پر مشتمل ہے، جو بعض خلفاء نے محفوظ کر لئے تھے حضرت مجدد کی وفات کے بعد مولانا محمد ہاشم کشمی نے ۱۰۵۱ھ میں ان کو مرتب فرمایا، یہ رسالہ پہلی مرتبہ ادارہ مجددیہ ناظم آباد کراچی نے فارسی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۸۴ھ میں شائع کیا۔

۸۔ **"مکتوبات امام ربانی"** یہ حضرت مجدد کی سب سے بڑی علمی، اصلاحی و تجدیدی یادگار اور ان وہبی کمالات مجتہدانہ و مجددانہ مقام تحقیق و معرفت، اور ان کے دلی جذبات و احساسات کا آئینہ ہے، جن کی بنا پر ان کو مجدد الف ثانیؒ کا لقب دیا گیا، اس کے علمی مقام کو واضح کرنے اور ہندوستان کے فارسی ادب میں (جس کی اہمیت کو "سبک ہندی" کا طنزیہ نام دے کر کم نہیں کیا جا سکتا) اس کا مقام متعین کرنے اور اس کے علوم و معارف کی نقاب کشائی کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے، یہ کتاب ہندوستان کی ان منفرد تصنیفات میں شامل ہے، جن سے بیرونِ ہند کے بلند پایہ فضلاء اور راسخین فی العلم نے پورا اعتنا کیا، اس کے عربی و ترکی زبان میں ترجمے ہوئے، علمی و روحانی مرکزوں کے نصاب درس میں شامل ہوی، اہل علم اور اہل سلوک نے اس کو حرز جان بنایا اور اس کی تازگی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا۔

مکتوبات کی مجموعی تعداد ۵۳۶ ہے، وہ تین دفتروں پر مشتمل ہے، دفتر اول ۳۱۳ مکتوبات پر مشتمل ہے اس دفتر کو حضرت مجدد الف ثانی کے ایماء سے آپ کے خلیفہ حضرت مولانا

یار محمد جدید بدخشی طالقانی نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب فرمایا، دفتر دوم ننانوے ۹۹ مکتوبات پر مشتمل ہے اور اس کو مولانا عبدالحی حصاری شادمانی نے حضرت خواجہ محمد معصوم کے ارشاد پر ۱۰۲۸ھ میں میں مرتب کیا، دفتر سوم ایک سو چودہ ۱۱۴ مکتوبات پر مشتمل ہے، اس کو آپ کے مشہور خلیفہ مولانا محمد ہاشم کشمی نے ۱۰۳۱ھ میں مرتب کیا، بعد میں ...... دس مکاتیب جو بعد کے زمانہ میں لکھے گئے ہیں، اس میں شامل کر دیئے گئے، اور اس دفتر کے جملہ مکتوبات کی تعداد ۱۲۴ ہو گئی۔

مکتوبات کے متعدد ایڈیشن مختلف وقتوں میں شائع ہوئے، پہلا ایڈیشن غالباً مطبع نولکشور لکھنؤ کا ہے، اس کے بعد متعدد ایڈیشن اسی پریس سے شائع ہوئے اس کے بعد مطبع احمدی دہلی، مطبع مرتضوی دہلی سے بار بار شائع ہوا، ۱۳۲۹ھ میں مولانا نور احمد امرتسری نے بڑے اہتمام سے اس کا ایک عمدہ ایڈیشن شائع کیا جو بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔[۱]

---

[۱] ملخص و مقتبس از کتاب "حضرت مجدد الف ثانیؒ" از مولانا سید زوار حسین شاہ۔

INDEX

اشاریہ
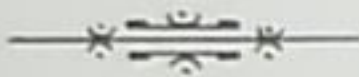
(انڈکس: "تاریخ دعوت وعزیمت" حصۂ چہارم)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

الف

خ

د ڈ ذ

ر

(غ)

اقوام وقبائل طبقات اور ملتیں

کتابیات

مقامات

متفرقات

قلعے، پہاڑ اور دریا:

سلطنتیں، عہد و حکومت اور دربار

سوسائٹیاں، تعلیمی ادارے اور درسگاہیں:

علوم و نظریات:

علمی و نشریاتی ادارے، اکیڈمیاں اور مطابع:

کتب خانے اور لائبریریاں:

مذاہب و ادیان، عقائد و فلسفے اور تحریکات:

طرق و سلاسل سلوک و تصوف:

مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ و رسوم

زبان:

سکّے:

مقبرے و مزارات:

خانقاہیں و رباط:

اہم واقعات وحادثات:

دیگر متفرقات:

APPROVED
By WWW.ATTABLIG.COM at 11:24 am, Oct 26, 2010